My Published Articles

Articles.

1.	Daccan Ke Bahmani Salaateen (Monthly Sabras Hyderabad Nov.Dec 1974)	1974
2.	Daccan Ki Mayae Naaz Hasti (Dr.Fahmida Begum, Munsif Hyderabad)	1982
3.	Khalai Science Mein Hindustan Ki Pesh Raft (The Daily Sultan Bangalore, 6 Series from 18-5-1990 to 7-7-1990)	1990
4.	Masnavi Sozo Gudaz e Ishq Ka Shair NAZEER DACCANI (2 Series from 8-8-1990 to15-8-1990, The Daily Sultan. Bangalore.)	1990
5.	Sahir Ludhiyanvi Shakhsiyat Aur Fan (3 series from 21-10-1990 to 4-11-1990,The Daily Sultan Bangalore)	1990
6.	Mohsin Kakorvi. Ek Azeem Naat Go Shair The Daily Sultan Bangalore 16-12-90 The Daily Munsif Hyderabad 13-11-91	1991
7.	Hazrat Khwaja Ghareeb Nawaz, (Khwaja Ajmeeri) The Daily Salar Bangalore 25-1-91	1991
8.	Hazrat Nizamuddin Aulia (Hunooz Dilli Door Ast) The Daily Salar Bangalore.	1991
9.	Masjd ko Islahe Muashire Ka Markaz Banaein (Review) The Daily Salar Bangalore. 26-2-1992	1992
10.	Shobae Urdu Jamia Bangalore Ki Tahqeeqi khidmat .Hamri Zaban New Delhi- 15- 4 – 1993	1993
11.	Urdu Masnavi—Darso Tadrees (Review) The Daily Salar Bangalore.8-11-93	1993
12.	Talibeen wo Salikeen Ke Liye Giran Qadr Tohfe (Review) The Daily Pasban Bangalore. 25-4-1994	1994
13.	Paikane Takabbur (Review) The Daily Pasban Bangalore 25-4-1994	1994
14.	Pyasa Shahar Pyase Loge(Review) The Daily Pasban Bangalore.2.5.1994	1994
15.	Boo-e-Gul-O- Naalae Dil (Review) The Daily Pasban Bangalore. 30-5-1994	1994
16.	Allama Iqbal Ka Payam (The Daily Pasban Bangalore. 27.6.1994 & 4.7.1994 :	1994
17.	Tajalliyan (Review) 3.10 1994	1994
18.	Shahre- Gulistan Bangalore Mein AIMSS Ka Convention Monthly Jable Rahmat Bangalore August 1994	1994
19.	PLC KO Fuaal Bana Kar Ilm Ki Roshni Ko Ghar Ghar Pahunchaayen (Khazeena e Haroof) 15.4.1995	1995

20. Ghavasi Shkhsiyat Aur Fan.
Talk broadcasted by AIR Bangalore 20.3.1995 1995

21. Burma Mein Saleh Rivayat Ki Pasdari Karnewala Shair.
The Daily Pasban Bangalore. 29.1.1996 1996

22. Sone Ka Haran (Review)
The Daily Pasban Bangalore. 26.2.1996 1996

23. Dakhni Ghazal Ka Pasmanzar
Talk Broadcasted by AIR Bangalore 3.9.96 1996

24. Ghavasi Ki Sheri Khidmaat
Navaae Gulburga Qadeem o Jadeed Urdu /Adab Number 1998

25. All India Milli Council Aur Karvane Aazadi
The Daily Salar Bangalore. 19.9.1997 1997

26. CHAND BI BI Drama by Ali Abbas Husaini,
Translated to Kannada by me and published in ANIKETANA (OCT-DEC1998)

27. My articles on MOHAN DAS KARAM CHAND GANDHI , DR.RAJENDR PRASD, PANDIT JAWAHAR LAL NEHRU, MOULANA ABUL KALAM AZAD, HASRT MOHANI, AND SAROJINI NAIDU, is published in a book Entitled "Tahreek e Azadi e Hind Aur Mujahideen Azadi" (India's freedom Movement and Freedom fighters)
Published by Karnataka Urdu Academy Bangalore. 1998

28. Tamilnadu Mein Urdu (Review)
The Daily Pasban Bangalore , 26-4-1999 1999

29. Ghalib Ka Shooqiyana Kalam.
Talk Brodcasted by AIR BANGALORE on 12-7-1999 1999

30. KARNATAK-SAYYAHON KI JANNAT
A colourful photograph Article published in Silver Jublee Sovenier of K.U.A 2000

31. Karnaka's contribution to the Development of Urdu Language and Literature
Article published in Chandana Magzine of Government Arts College Bangalore
Year of publication 1998-99 page 68-75.

32. Islam ke dushman mulk ke ghaddar Deendar Channabasveshwar,
Review on the Book of Muneer Ahmed Tumkur
Published in the Daily Salar and Daily Pasban Bangalore
15-10-2000 and 22-10-2000 respectively

33. Aadhunika Kannada Sahityada Urdu Anuvadita Krutigalu Haagu Adara Mahatva
Article published in Kannada Adhyana patrike of Kannada Vishva vidyalaya Hampi. 2000

34. Kisanon ke Khairkwah Badshah Tipu Sultan Shaheed
Article Published in the Daily Salar on the Death Annuarsary of Tipu sultan 4-5-2003

35. Ham sab ko Sabakh lena chahiye
Article published on HIV VIROUS (AIDS) THE DAILY SALAR BANGALORE 22-7-03

سلاطین بہمنیہ کی علم پروری

محمد صبغۃ اللہ

شاہانِ بہمنیہ کی بے تعصبی، وسیع القلبی، فیاضی اور رواداری کے واقعات تاریخ دکن کا درخشاں باب ہیں۔ ان کا سلوک رعایا کے مختلف طبقات کے ساتھ یکساں تھا۔ انتظامِ ملک میں اُن کا طریقہ کار صلح کُل تھا۔ عدالت اور انصاف کے معاملے میں کسی کے ساتھ جانبداری نہیں برتی۔ مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کو دو آنکھوں کی طرح سمجھتے تھے۔ جہاں اُن میں یہ تمام خصوصیات تھیں۔ اُن کی علم پروری، علم دوستی کی بھی کئی مثالیں نظر آتی ہیں۔

سلطان محمود شاہ بہمنی کو علوم متداولہ میں خاصی دستگاہ تھی۔ وہ فارسی اور عربی بہت اچھی بولتا تھا۔ اس کی طبیعت کے استقلال کا یہ عالم تھا کہ نہ تو مسرت خیز واقعات سے اُسے خوشی ہوتی تھی اور نہ غم انگیز حادثات سے رنجیدہ ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ عالموں اور فاضلوں کے پاس بیٹھتا اور اُن کی تعظیم و توقیر کرتا تھا۔ محمود شاہ کے زمانے میں عرب و عجم کے نامی گرامی شعراء دکن آتے تھے اور علما نواز اور علم دوست فرمانروا کے انعام و اکرام سے مالا مال ہو کر خوش و خرم اپنے وطن کی راہ لیتے تھے ایک عجمی شاعر ایک مرتبہ دکن آیا اور میر فضل اللہ شیرازی کے وسیلہ سے جو عہدۂ وزارت پر فائز تھا۔ بادشاہی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ شاعر نے ایک قصیدۂ مدحیہ بادشاہ کو پیش کیا اور پہلی ہی باریابی میں ایک ہزار تولے سے زیادہ سونا انعام میں پایا اس سے بادشاہ کی قدر شناسی اور فیاضی کا شہرہ عالمگیر ہوا خواجہ شمس الدین حافظ شیرازی سے بھی دکن آنے کی خواہش کی گئی۔ وہ ارادہ کرلے کے باوجود دکن نہ آسکے۔ بادشاہ کو جب یہ خبر ملی تو اس نے کہا چونکہ وہ ہماری بارگاہ تک آنے کے ارادے سے اپنے وطن سے چلے تھے اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ایسے بزرگ کو اپنے انعام و اکرام سے محروم نہ کریں بادشاہ نے ہزار تنگہ طلائی مرحمت کیا اور مشہدی کو حکم دیا کہ اس رقم سے ہندوستان کے نادر الوجود تحفے خرید کر خواجہ حافظ کے لئے شیراز لے جائے

فیروز شاہ بہمنی

یہ دوسرے بادشاہ ہیں جس کی علم دوستی قابلِ ذکر ہے۔ حاجی محمد قندھاری لکھتا ہے کہ فیروز شاہ روزانہ ایک چوتھائی کلام اللہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے اور اپنا زیادہ وقت علماء، مشائخ، شعرا اور خوش طبع لوگوں کے ساتھ گزارتے تھے۔ اس مجلس میں شاہی آداب کی رعایت نہ کی جاتی تھی۔ بلکہ ہر شخص سے دوستانہ تعلقات برادرانہ سلوک کرتے تھے۔ وہ اپنے مصاحبوں سے کہا کرتے کہ جب میں دیوان خانہ میں تختِ فیروزہ پر رہتا ہوں تو اس وقت مجھے ناچار شاہی عظمت و جلال برقرار رکھنے کے لئے حاکمانہ روش اختیار کرنی پڑتی ہے تاکہ تمہارے سلطنت میں ابتری نہ پیدا ہو۔ دربانوں کو سخت ممانعت تھی کہ اس بے تکلف صحبت میں حکومت کے کاروبار تم نہ پہنچا، دوسرے کسی کی غیبت نہ کریں۔ ایک دن ملا اسحٰق پیر ہندی نے جو ایک دانشمند اور خوش طبع امیر تھے بادشاہ سے عرض کیا کہ بادشاہ سلامت اہلِ مجلس کو تاکید فرماتے ہیں کہ اس سے بے تکلفانہ بات چیت کریں حالانکہ سلطان محمود غزنوی اور حکیم الوریحان منجم کی داستان اس بات کی شاہد ہے کہ یہ شیوہ فرمانرواؤں کو زیب نہیں دیتا۔ فیروز شاہ نے سنا اور کہا کہ جو فرمانروا صاحبِ علم و فضل ہوتے ہیں اور جن کو

خدا انصاف پسند طبیعت عنایت کرتا ہے وہ ان باتوں کو پسند نہیں کرتے خدا نہ کرے کہ میرے مزاج کا بھی یہی حال ہو اور اس صنعت کی وجہ سے میں بھی کسی دوسرے بادشاہ کی مجلس میں طعن و ملامت کا نشانہ بنوں۔ فیروز شاہ بہمنی چاروں طرف جہاز بھجواتے تھے اور اُن کا حکم تھا کہ ہر ملک کی نادر الوجود چیزیں دکن لائی جائیں اور بادشاہ کا قول تھا کہ ہر ملک کا بہترین تحفہ اس ملک کے صاحب کمال ہیں۔ بادشاہوں کو چاہیئے کہ ہر ملک کے اہل فضل کا مجمع اپنے دربار میں جمع کریں اور اطرافِ عالم کے باکمالوں سے فائدہ اٹھائیں۔ دکن کا یہ بادشاہ اکثر زبانیں جانتا تھا اور ہر ملک کے باشندے سے اس کی مادری زبان میں گفتگو کرتا تھا۔ باکمال شعراء کے اشعار کو سمجھتا تھا اور خود بھی کبھی نظم لکھنے کی کوشش کرتا۔ فیروز شاہ کو ہر علم سے عموماً اور تفسیر اصول و حکمت طبعی اور نظری سے خاص طور پر دلچسپی تھی۔ ہفتہ میں تین دن بادشاہ کی تدریس کے لیے مقرر تھے۔ بادشاہ کے درس کی خاص کتابیں زاہدی۔ شرح تذکرۂ فن ریاضی۔ شرح مقاصد کلام اور اقلیدس علم ہندسہ اور مطول۔ علم معانی و بیانی تھیں۔ میر فیض اللہ انجو شیرازی کی برکت سے جو علامہ سعد الدین تفتا زانی کے شاگرد رشید تھے۔ بادشاہ کو دولت و حکومت کے ساتھ علم بھی نصیب ہوا۔ اور قرین قیاس یہ ہے کہ علم و دانش میں فیروز شاہ کا پایہ محمد تغلق سے زیادہ بلند تھا۔

فیروز شاہ کی علم پروری اور زبان کی یہ انوکھی مثال دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس نے ایک نیا شہر بسایا اور اس کو فیروز آباد کے نام سے موسوم کیا اور اس کو اپنا دار الخلافت بنایا۔ شہر کو عمدہ عمارتوں اور سڑکوں سے آراستہ کیا گیا۔ قلعہ بھی بنایا جو دریا سے متصل تھا اس میں متعدد عالی شان محل تیار کیے گئے۔ ہر محل ایک حرم شاہی کے سپرد کیا گیا۔ بادشاہ کی بیگمات مختلف اقوام سے تعلق رکھتیں جن کی زبانیں الگ الگ ہوتیں۔ خدمت گار عورتیں بیگمات کی ہم زبان ہوتیں۔

شیخ آذری نے احمد شاہ کی مدح اور اس کی بنا کردہ شہر کی عمارتوں کی تعریف میں بیش بہا قصیدے نظم کیے اور اس کے جلسے میں معقول رقم بطور انعام حاصل کی۔ آذری نے بادشاہ کے حکم سے بہمن نامہ لکھنا شروع کیا اور جب یہ کتاب پایہ تکمیل کو پہنچی اور احمد شاہ کے حالات قلمبند ہونے لگے تو اپنے وطن واپس جانے کی درخواست کی۔ بادشاہ نے کہا کہ حضرت خواجہ دکن بندہ نواز گیسو دراز کے اس عالم سے تشریف لے جانے کا جو صدمہ ہے وہ تمہاری موجودگی سے بہت کم محسوس ہوتا ہے۔ برائے خدا مجھے اس غم میں مبتلا نہ کرو۔ شیخ نے بادشاہ کو اس طرح مہربان پایا تو ہندوستان میں رہنے کا ارادہ کر لیا اسی اثنا میں محل دار الامارۃ تیار ہوا اور شیخ نے دو شعر اس قصر کی تعریف میں قلمبند کیے۔ ملّا شرف الدین نے کتبہ تیار کر کے دروازے پر نصب کر دیا۔ ایک دن بادشاہ نے اس کو دیکھا اور بڑا خوش ہوا۔ شاہزادے نے موقع سے فائدہ اٹھا کر کہا کہ آذری اپنے وطن کے دیدار کے بے حد مشتاق ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ اگر بادشاہ کی اجازت ہو تو اس شکریہ میں شیخ اپنے حج اکبر کا آدھا ثواب بادشاہ کو پیش کریں گے احمد شاہ اس سے اور خوش ہوا اور خزانچی کو حکم دیا کہ چالیس ہزار تنگہ سفید جس میں ہر تنگہ ایک تولہ چاندی کا ہوتا ہے۔ آذری کے لیے خزانے سے لے آئے، آذری نے بادشاہ کے عطیہ کو دیکھا اور عرض کیا کہ جناب کے عطیوں کو خود آپ کے ہی بار برداری کے جانور اٹھا سکتے ہیں۔ بادشاہ ہنسا اور حکم دیا کہ بیس ہزار تنگے اور خرچ راہ اور اجرت کرایہ کے لیے شیخ کو دیئے جائیں۔

بادشاہ نے اسی مجلس میں شیخ کو خلعت خاص اور پانچ ہندی غلام بھی عطا کیے۔ شیخ نے روانگی کے وقت بادشاہ سے وعدہ کیا کہ وہ جب تک زندہ رہے گا وہ بہمن نامے کی تصنیف جاری رکھے گا۔ چنانچہ بہمن نامہ کی تاریخ موجودہ بہمن نامہ سلطان ہمایوں شاہ بہمنی کے عہد تک، شیخ کی تصنیف ہے اور بعد کے حالات ملّا نظیری اور دیگر شاعروں کے نظم کیے ہوئے

ہیں۔ جو زوالِ دولت بہمنیہ تک موجود ہے۔ لیکن خود پرست شعراء نے یہاں تک اس کتاب میں تصرف کر دیا ہے کہ خطبۂ کتاب کے چند اشعار میں ردّ و بدل کر کے تمام کتاب کو اپنی تصنیف قرار دے دیا ہے لیکن ان اشعار کے حسن و خوبی میں جو باہم اختلاف پایا جاتا ہے اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ کتاب کے تمام اشعار ایک ہی شاعر کی فکر کا نتیجہ نہیں ہیں۔

شیخ آذری اپنے وقت کا شہرہ آفاق شاعر تھا۔ ایک زمانے میں شیخ آذری شیخ صدر الدین اور اس کے ساتھ الغ بیگ مرزا کی ملاقات کو مشہد مقدس میں حاضر ہوئے۔ مرزا نے شیخ صدر الدین سے پوچھا تمہارا تخلص رواسی 'سین' سے ہے یا 'ثے' سے' شیخ نے جواب دیا کہ وہ رواص ہوں جس کا املا صاد ہے مرزا شیخ صدر الدین نے جواب دیا کہ تم وہ نہیں ہو اسلئے کہ وہ لفظ صاد سے کلام عرب میں منقول ہے۔ الغ بیگ نے اس کے بعد شیخ آذری سے پوچھا کہ تمہارا تخلص آذری کس مناسبت سے ہے۔ شیخ نے جواب دیا کہ فقیر ماہ آذر میں پیدا ہوا ہے اس لیئے اس کا تخلص آذر ہے۔ مرزا نے جواب دیا کہ تم شاعر پیشہ نہیں ہو۔ جس آذر کا تم ذکر کرتے ہو اس کے اوّل حرف کو ضمہ ہے نہ فتحہ۔ شیخ نے فی البدیہہ جواب دیا کہ ماہ آذر کی ذال عرصہ تک ذلّت و خواری کے عالم میں رہی یہاں تک کہ اس کی پیٹھ دوتا ہو گئی لیکن پھر اسے ادراک و شعور حاصل ہوا اور سیدھی قائم ہو گئی۔ مرزا شیخ کے جواب سے بے حد خوش ہوا اور اُن کو اپنے مصاحبوں میں داخل کر لیا اور انعام و اکرام سے سرفراز کیا۔ شیخ پر بڑھاپے میں تصوّف غالب آیا اور اسفراین سے حجاز چلے گئے۔ حج اکبر اور زیارت آستانہ رسولؐ سے فیضیاب ہو کر ہندوستان تشریف لائے اور سلطان احمد شاہ کے دربار میں حاضر ہوئے۔ شیخ نے بادشاہ کو ملک الشعراء کا خطاب دیا۔ عرصہ کے بعد شیخ پر وطن کی محبّت غالب آگئی اور جیسا کہ مذکور ہوا شاہزادۂ علاء الدین کی کوشش سے پھر ہندوستان سے اسفراین روانہ ہو گئے۔

سلطان علاء الدین بڑا فصیح و بلیغ تھا اور فارسی بہت اچھی جانتا تھا اس نے دوسرے علوم کو بھی فی الجملہ تحصیل کی تھی۔ کبھی کبھی جمعے اور عیدین میں جامع مسجد بھی جاتا تھا۔ اور منبر پر بیٹھ کر خطبہ پڑھتا تھا۔ علاء الدین خود کو السلطان العادل الکریم الحلیم الرؤف عفی عباد اللہ المفتی علاء الدین بن اعظم السلاطین احمد شاہ ولی بہمنی کے لقب سے یاد کرتا تھا۔ ایک عرب سوداگر نے کچھ گھوڑے بادشاہ کے اہلِ دربار کے ہاتھ فروخت کیئے تھے وہ درباری قیمت ادا کرنے میں پس و پیش کرتے تھے۔ ایک دن عرب تاجر منبر کے قریب بیٹھا ہوا تھا بادشاہ نے اُسے یاد کیا فوراً عرب تاجر اپنی جگہ سے اٹھا اور کہا 'خدا کی قسم تو عادل و کریم و رؤف و رحیم نہیں ہے' اے کذاب! تو نبیؐ کی پاک ذرّیت کو قتل کرتا ہے اور پھر مسلمانوں کے منبر پر اس طرح کے کلمات زبان پر لاتا ہے' بادشاہ بے حد متاثر ہوا اور زار زار رونے لگا۔ اور کہا کہ وہ لوگ کبھی آخرت میں سرخرو نہ ہوں جو مجھے یزید کی طرح دنیا و عقبیٰ میں بدنام کرتے ہیں علاء الدین نے سوداگر کو گھوڑوں کی قیمت ادا کی اور اپنے مکان واپس گیا۔

محمود گاواں کے آثار و عمارات دکن میں بکثرت پائے جاتے ہیں خصوصاً وہ مدرسہ جو خواجہ نے شہادت سے دو سال پیشتر احمد آباد میں تعمیر کرایا تھا۔ تحریر کتاب کے زمانے تک جو ۱۰۲۳ ھ ہے اور اس عمارت اور مسجد اور چار طاق بازار کے نشانات باقی ہیں اور یہ عمارتیں ایسی پاکیزہ اور لطیف ہیں کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ معمار ابھی ان کی تعمیر سے فارغ ہوئے ہیں۔ خواجہ گاواں تمام علوم عقلیہ اور نقلیہ خصوصاً ریاضی اور طب میں کمال رکھتا تھا اور نظم و نثر میں انشا اور حساب میں یگانۂ روزگار تھا۔ بے حد خوشخط تھا۔ چنانچہ رسالہ روضۃ الانشا اور اس کا دیوان دکن میں اکثر اہلِ علم

(بقیہ صـ۳۷ پر)

سے کہتی ہیں ۔ تمام پرچھائیاں اپنی بے بسی پر لرز اُٹھتی ہیں ۔

شام کے سائے کرۂ ارض کے آدھے حصے پر بڑھنے لگتے ہیں ۔ سپاہیوں کی یہ بے چین روحیں نہ جانے اب کیوں خشکی پر بسنے والے انسانوں کی بھیڑ کی طرف بڑھ رہی ہیں ۔ نیچے زمین پر جگمگ کرتے شہروں میں سوتے جاگتے انسانوں کا ایک سمندر ہے ۔ زندگی کی خوب صورت باہنوں سے لپٹے ہوئے کچھ لوگ میٹھی نیند سو رہے ہیں اور کچھ سڑکوں، بازاروں اور گلیوں میں رواں دواں ہیں ۔

"وہ دیکھو اب بھی کچھ کارخانوں سے بارود کا دھواں اٹھ رہا ہے ۔ وہاں موت کی فصلیں اگائی جا رہی ہیں" ایک پرچھائیں کہتی ہے ۔

"اپنے بھائیوں کے لیے ہمیں کچھ کرنا چاہیئے" سب پرچھائیاں یک زبان ہو کر کہتی ہیں ۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے چاروں طرف سپاہیوں کی روحیں ہوا کا ایک زبردست طوفان بن کر ان کارخانوں میں گھس جاتی ہیں تاکہ عوام کے سمندر میں نامعلوم وقت تک ڈوبنے سے پہلے آخری بار تمام جنگی منصوبوں کی دھجّیاں اڑا دیں ۔

(بقیہ صـ ۳۸ سے آگے)

کے پاس پائے جاتے ہیں ۔ خواجہ گاواں اپنے ہم عصر عراقی اور خراسانی فاضلوں اور ادیبوں کے لیے نامے اور خطوط روانہ کیا کرتا تھا چنانچہ یہ مراسلات خواجہ کی کتاب "انشا" میں موجود ہے ۔ مولانا عبدالرحمٰن جامی نے ایک قصیدہ خواجہ کی مداح میں لکھا اور ایک قطعہ میں خواجہ سے صلاح کی خواہش ظاہر کی ۔ ملّا عبدالکریم ہمدانی نے ایک کتاب میں خواجہ کی ولادت سے لے کر آخر عمر تک کے حالات قلمبند کئے ہیں ۔ مورخ فرشتہ اسی کتاب سے ان حالات کا خلاصہ جو تاریخی حیثیت سے کارآمد ہے درج کرتا ہے "خواجہ گاواں کے آبا و اجداد قدیم زمانے میں شاہانِ گیلان کے وزیر اور ہمیشہ معزز اور مکرم رہے ۔ اس کے اسلاف میں ایک اقبال مند بزرگ فرمانروا کے مرتبہ پر پہنچ کر صاحبِ خطبہ بھی ہوا" ۔ حاجی محمد قندہاری کی روایت کے مطابق اس خاندان نے عرصہ تک جہاں بانی کی ۔ اور شاہ طہماسپ شاہ صفوی کے عہد میں ان کی حکومت کا خاتمہ ہوا ۔

ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ دکن میں کیسی کیسی علم نواز اور علم پرور ہستیاں گزری ہیں اور جب تک اورنگ زیب کے ہاتھوں دکن کی حکومت کا خاتمہ نہ ہوگیا علم نوازی اور علم پروری کا سلسلہ گولکنڈہ اور بیجاپور کے مرکزوں میں برابر جاری و ساری رہا ۔

خلائی سائنس میں ہندوستان کی پیش رفت

تالیف: بی۔ آر۔ گرو پرساد (انڈیا) — ترجمہ: ڈاکٹر صبغت اللہ شکور، لیکچرار آرٹس کالج [illegible]

آج سے تقریباً تیس سال قبل یعنی ۴ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو روس کے صدر مقام ماسکو سے ۲ ہزار کیلو میٹر دور قزاقستان کے سر سبز و شاداب علاقہ بائیکونور کے کاسمو ڈروم پر کافی چہل پہل تھی۔ اس کثیر مجمع میں اکثر سائنس داں اور ٹیکنالوجی کے ماہر تھے۔ وہ راکٹ کی اڑان کے اسٹیج پر کھڑے ایک عظیم الشان راکٹ کے معائنے میں مصروف تھے۔ ہر چہرہ قابل اطمینان تھا۔ راکٹ کی اڑان کیلئے آخری گنتی بھی شروع ہو چکی تھی۔ گنتی کے ختم ہوتے ہی راکٹ نے آگ اگلتے ہوئے اپنی پرواز شروع کی۔ اس پرواز کے ساتھ ہی اطراف و اکناف کے علاقے میں زبردست جھٹکے محسوس ہوئے اور ایسے لگا کہ زمین حرکت [illegible] ہو آسمان کی طرف پرواز کرنے والا [illegible] بلندی منٹوں میں ارضی ماحول و حدود کو چھوڑ خلا میں داخل ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی SPutnik.1 نامی ۸۴ کیلو گرام وزنی گولے نے راکٹ سے الگ ہو کر خلا میں زمین کا چکر لگانا شروع کیا اسی طرح خلائی صدی کا آغاز ہو گیا۔

سائنس کے میدان میں جو نمایاں کامیابیاں انسان نے حاصل کی ہیں ان میں خلائی سفر کی کامیابی سب سے اہم کامیابی ہے۔ انسان نے ایک خلائی سفر کے صرف خواب دیکھے تھے۔ لیکن SPu tnik.1 کی کامیاب پرواز نے اس خواب کو حقیقت میں تبدیل کر دیا۔ اس طرح آج تک خلائی جہازوں نے اس دنیا میں ہونے والے سارے اہم واقعات پر بڑا دیرپا اثر چھوڑا ہے۔ اس دن سے آج تک خلائی تحقیق کے نتائج کی روشنی میں کئے جانے والے کئی تجربوں کی سہولیات کی مدد سے ہم جانے یا انجانے میں تجربہ کرتے ہی آ رہے ہیں۔ خلائی صدی کے اس تیس سالہ عرصہ میں ہم نے کیا کیا اہم کارنامے انجام دئے؟ اس کا مختصر جائزہ لیا جا رہا ہے۔ خلائی صدی کے ابتدائی سالوں میں خلائی سفر کرنے والے انسانوں کو بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ اپریل ۱۹۶۱ء میں یوری گگارین نامی خلائی جہاز سے جب بھی خلابازوں نے اپنا پہلا خلائی سفر ختم کر کے زمین پر واپس لوٹ آئے تو ان کا شاندار خیر مقدم کیا گیا لیکن آج خلائی سفر ایک عام بات ہے۔ چیلنجر کے حادثہ نے امریکہ کی خلائی پروگرام کو عارضی طور پر روک دیا ہے۔ اس کے بالکل روس کے خلائی پروگرام کامیابی کے ساتھ آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ ان خلائی مصنوعی سیاروں کا استعمال عوامی اور فوجی مرکزوں میں زیادہ سے زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ روس ہر ہفتہ اوسطاً دو مصنوعی سیارے خلا میں روانہ کر رہا ہے۔ آج یہ خلائی سفر صرف ترقی یافتہ اور امیر ملکوں تک ہی محدود رہ گیا ہے۔ خلائی پرواز کے تواتر کے پیش نظر اس میں دلچسپی رکھنے والے ترقی پذیر ممالک بشمول بھارت خلائی پروگرام میں اپنی مقدور بھر حصہ لے رہے ہیں۔ خلائی سفر دو طرح کے ہوتے ہیں (۱) انسانی (Manned) اور (۲) غیر انسانی۔ غیر انسانی خلائی پروگرام میں خودکار مصنوعی سیاروں اور خلائی جہازوں کو خلا میں روانہ کیا جاتا ہے۔ جبکہ انسانی پیمائشی جسم و فطرت اپنی مشینوں یا روبوٹ جیسے انسانی مددگاروں کی بہ نسبت خلا کے بہتر کام انجام نہیں کر پاتی۔ اس لئے انسان خلائی سفر کے تمام ضروری انتظام فراہم کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ آج انسانی (Manned) خلائی پروگرام کو جو شہرت نصیب ہوئی ہے وہ شاید ہی کسی اور سائنس کارنامہ کو نصیب ہوئی ہو۔ آج غیر انسانی خلائی پروگرام کے تحت پرواز کرنے والے ہزاروں مصنوعی سیاروں اور خلائی جہازوں نے جدید سائنس و ٹیکنالوجی میں اہم انقلاب برپا کر رکھا ہے۔ خصوصی طور پر انسان کی جان کی حفاظت کرنے میں اور انسان کو آرام پہنچانے میں یہ مصنوعی سیارے کافی اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ انسان کی اس مصروف [illegible] کی زندگی میں بھی روبوٹ خلائی جہازوں کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ آج انسانی زندگی کافی مصروف زندگی ہے ایسے موقع پر یہ مصنوعی سیارے [illegible] کی مدد [illegible]

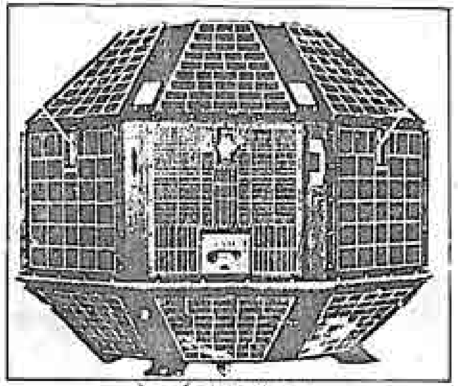

ہندوستان کا اولین سیارچہ آریہ بھٹ

دور میں گردش کرتے ہوئے انسان کے لئے بیش قیمت معلومات فراہم کرتے ہوئے کافی مدد کر رہے ہیں۔ آج دیہاتوں تک [illegible] ورلڈ کپ کرکٹ [illegible] فٹ بال وغیرہ بین الاقوامی کھیل اور بالاکوٹوں کا آنکھوں دیکھا حال ٹیلی ویژن سے نشر کئے جاتے ہیں۔ (LiveVia Satellite) کا اعلان ٹیلی ویژن کے دیکھنے والوں کو ان مواصلاتی سیاروں کی ضروری بہت اہمیت ہے تو ضرور واقف کراتا ہوگا۔ ٹیلی ویژن سے نشر ہونے والی خبروں کے انتظام پر INSAT 1.B سے کیے جانے والے بھارت کے نقطہ کو دیکھ کر ہم

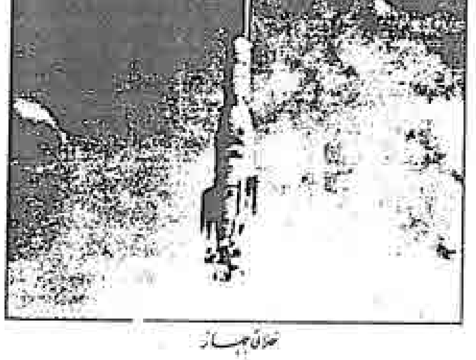

خلائی جہاز

کے قریبانی سامان میں ان سیاروں کی اہمیت سے شاید آپ بھی واقف ہوں گے۔ ان دونوں مراکز کے علاوہ بھی دور رابطہ نظام Remote sencing اور جہاز رانی Navigation کے مراکز میں بھی یہ مصنوعی سیارے بہترین خدمات انجام دے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج اس راکٹی صنعت کو سب سے زیادہ سود مند صنعتوں میں شمار کیا جا رہا ہے آج اس صنعت میں کئی ہزار کروڑ روپیوں کا سالانہ فائدہ ہو رہا ہے اور اسی فائدہ کے مد نظر مصنوعی سیارے اور خلائی راکٹ تیار کئے جا رہے ہیں۔

ادارہ Intelsat کی رکنیت ایک سو سے زائد ممالک نے حاصل کر لی ہے۔ اس ادارہ نے اب تک اٹھارہ مصنوعی سیارے تیار کئے ہیں۔ یہ بین الاقوامی ادارہ مواصلات میں کافی اہم رول ادا کر رہا ہے بحر اوقیانوس (Atlantic) بحر الکاہل (Pacific) اور بحر ہند (Indian ocean) پر جو آلات نصب کئے گئے ہیں ان کی مدد سے دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بذریعہ ٹیلی فون رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے اسی ٹیلکس اور ٹیکس۔ اولمپک وغیرہ جیسے بین الاقوامی کھیل مقابلے وغیرہ نشر کرنے والے یہی مصنوعی سیارے ہیں۔۔۔۔ ہزار کیلو میٹر کی بلندی پر زمینی مدار میں کام کرنے والا ادارہ Intesat ان مصنوعی سیاروں کے ذریعے اختلاف رائے سے دور رہنے والے سب ممالک کو آج اس ادارہ کے ذریعے ایک مرکز پر جمع کر رہا ہے۔ اپنے نظریاتی، اخلاقی، معاشرتی و مذہبی پروگراموں کو بڑی کامیابی کے ساتھ چلا رہے ہیں اس نظام کی وجہ سے قربت بڑھ رہی ہے [illegible] جا رہا ہے کہ دنیا سکڑتی جا رہی ہے۔ اسی موقف کے مد نظر بھارت نے اپنا کثیر المقاصد مصنوعی سیارہ انسات 1.B خلا میں چھوڑ رکھا ہے جو ہمارے ملک کے مواصلاتی نظام و دور درشن پر نشر ہونے والے پروگراموں کی وسعتوں کو بڑھانے میں اہم رول ادا کر رہا ہے انسات 1.B کی سیٹلائٹ فیم ہونے پر Insatic کو مدار میں بھیجنے کی تیاری کی جا رہی ہے

مواصلاتی نظام کے علاوہ آج ان مصنوعی سیاروں کی بیش قیمت خدمات سے فائدہ اٹھانے والا ادارہ [illegible] موسمیات ہے۔ اس سیارے کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ خلاء میں رہتے ہوئے بھی اپنے مخصوص آلات کی مدد سے زمین کے ہر حصہ کی جانچ پڑتال کرتا ہے اور اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آگے چوبیس گھنٹوں میں کن علاقوں پر موسم کیسا رہے گا۔ [illegible] ان سیاروں کی مدد سے آنے والے طوفانوں کا اندازہ لگا کر جانی و مالی نقصانات پر کسی حد تک قابو پایا جا سکتا ہے۔

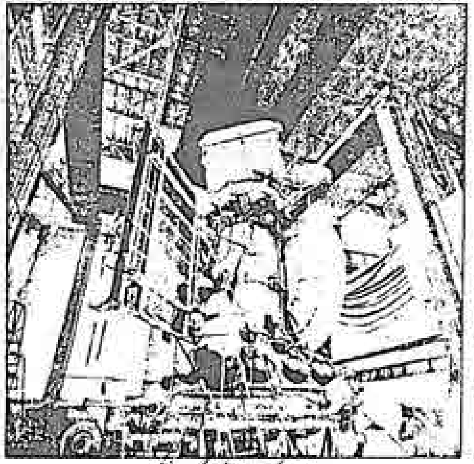

دیبز ۱۵ کی تیاری کا ایک منظر

گزشتہ دہے میں Remote sensing مصنوعی سیارے وجود میں آچکے ہیں۔ آج یہ ترقی یافتہ ممالک کی معاشی ترقی میں یہ سیارے کافی اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ ان سیاروں میں نصب شدہ کیمرے انسانی آنکھوں کو بھی نظر آنے والی چیزوں کو بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اس طرح یہ سیارے موجودہ آلات و کیمرے سے لیس ہیں زمین کے کسی بھی علاقے کی فصلوں کی پیداوار کا اندازہ کر سکتے ہیں معدنیات، پٹرول کی کھوج میں بھی یہ سیارے انسان کی کافی مدد کر رہے ہیں۔ امریکہ Land Sat پروگرام کے تحت پانچ ریموٹ سنسنگ سیارے خلا میں بھیج چکا ہے۔ فرانس نے گزشتہ سال SPot نامی سیارہ خلا میں چھوڑ رکھا ہے۔ جس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی جگہ سے صرف 800 کیلو میٹر کی بلندی پر وہ کم از کم دس میٹر کے چھوٹے سے زمینی علاقہ کی بھی پہچان کر سکتا ہے۔

یہ مصنوعی سیارے متعدد جہاز اور پرزے بھی کھینچ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی یہ سیارے جہاز رانی میں بھی جو عوامی اور فوجی سرگرمیوں کے لئے کافی اہم ہے کافی مدد کر رہے ہیں۔ امریکہ ۱۹۸۹ء Now Star تحریک کے تحت تیار کئے جانے والے سیارے بھی مکمل کر چکا ہے ان سیاروں کی خصوصیت یہ ہے کہ بحری جہاز کا سوار ہو یا ہوائی جہاز کا سوار وہ جہاں اور جس جگہ موجود ہے ان سیاروں کی مدد سے اپنی جگہ یا مقام کو پہچان سکے گا۔

(باقی آئندہ)

سلطان سائنس فیچر!

روزنامہ سلطان اپنے قارئین کی خدمت میں مختلف موضوعات پر فیچرس روز اول ہی سے پیش کرنا چاہتا تھا لیکن بعض ناساز حالات اور ان پر قابو پانے کی جد و جہد کے باعث ادارہ اپنے اس ارادے کو عملی جامہ نہیں پہنا سکا تھا۔ لیکن جونہی حالات قابو میں آگئے ادارے نے فیچرس کی اشاعت کا سلسلہ شروع کر دیا قارئین سلطان نے اس ہفتہ محسوس کیا ہوگا کہ ہر دن ایک نئے موضوع پر فیچرس کی اشاعت عمل میں لائی جا رہی ہے۔ ہر جمعہ ادبی، دینی اور دیگر مسلم اداروں کا تعارف پیش کرنے کے علاوہ عصری سائنس اور ٹکنالوجی کے متعلق بھی مفید اور معلوماتی مضامین آپ کی خدمت میں پیش کئے جائیں گے۔ سلطان سائنس فیچر کے تحت ہم سیٹلائٹس یعنی مصنوعی سیاروں کے متعلق ڈاکٹر صبغت اللہ کا یہ سائنسی مضمون اقساط میں شروع کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صبغت اللہ نے بڑی محنت اور عرق ریزی کے ساتھ یہ مضمون انگریزی سے ترجمہ کیا ہے۔ اس کا مقصد اردو داں طبقے کو اس انقلابی سائنسی کارنامے کی اصلیت و حقیقت سے آگاہ کرنا ہے۔ امید کہ قارئین سلطان خصوصیت سے طلباء اور وہ لوگ جو سائنسی معلومات حاصل کرنے کی خواہش رکھتے ہیں لیکن اپنے شوق کی تکمیل کیلئے کوئی راستہ نہیں پاتے اس سائنسی سلسلے کو پسند فرمائیں گے۔ اردو اخبارات ماہناموں اور دوسرے رسالوں میں سائنسی مضامین شاذ و نادر ہی شائع ہوا کرتے ہیں۔ اس قسط وار سائنسی مضمون کے بعد ہم قارئین کی خدمت میں ایسے ہی دلچسپ اور معلوماتی سائنسی مضامین شائع کرنے رہیں گے۔

آپ کی عدالت

آپ کے خطوط کیلئے

مخصوص ہے!

Sultan 26-5-90

خلائی سائنس میں ہندوستان کی پیش رفت

تالیف۔ بی آر رو پرساد (انگریزی) ۔ ترجمہ۔ ڈاکٹر صبغت اللہ شکور لکچرار گورنمنٹ آرٹس کالج تمکور

آج یہ مصنوعی سیارے جو بیش قیمت خدمات انجام دے رہے ہیں ان کا تفصیلی جائزہ لینا تو ناممکن ہے مختصر طور پر اتنا کہا جا سکتا ہے کہ انسان نے خلا میں جو آلات نصب کر رکھے ہیں وہ جدید دنیا کی ضروریات کو پورا کرنے میں معاون ثابت ہو رہے ہیں ممکن ہے کہ آج کا انسان ان کے بغیر شاید ہی کوئی کام انجام دے سکے۔

۱۷ مارچ ۱۹۸۸ کو بھارت کا پہلا ریموٹ سنسنگ سیارہ میں داغا گیا اس کے ساتھ ہی بھارت کا شمار بھی دنیا کے ان ممالک میں ہونے لگا جنہوں نے ایسے مصنوعی سیارے خلا میں چھوڑ رکھے ہیں اب بھارت کا مقام پانچویں نمبر پر ہے بھارت میں ریموٹ سنسنگ خلائی جہاز کی مدار کی راہ اسرو ٹیلی میٹری ٹراکنگ اور کمانڈ نٹ ورک (IATRAC) کا زمینی اسٹیشن بنگلور سری ہری کوٹہ ترونندم اور ماریشس میں واقع ہے ابتدائی دور میں سیارہ کی راہ کی جانچ پڑتال اور زمینی اسٹیشن کے بنانے کی مدد کے لئے غیر ملکی ایجنسیوں سے چند منتخب حصوں میں مدد لینے کا منصوبہ بنایا گیا۔ IRS-1A کا مکمل مشن کنٹرول پینیا (PEENYA) بنگلور میں ہے جہاں سے خلائی جہاز کے عمل کی رہنمائی جاری ہے۔

۹۸۰ کیلو گرام وزنی اس مصنوعی سیارہ کا ڈیزائن اس طرح تیار کیا گیا ہے کہ یہ سیارہ تین سال سے بھی زیادہ عرصہ تک سورج کو اپنا قطب بنا کر ۹۰۴ کیلو میٹر کی بلندی پر اپنا مدار قائم رکھتے ہوئے کافی سریع الاشاعتی ٹرانسمیٹروں کے ذریعہ زرعی وسائل جنگلاتی وسائل ورضیاتی نقشے کے تیار کرنے پانی کے وسائل کی تلاش مٹی اور زمین کا استعمال جہاز رانی کے وسائل اور ساحلی عمل کے متعلق مبینہ حقائق روانہ کرتا رہے گا۔ اسرو کے مطابق آن بورڈ سسٹم دیسی طور پر تیار کیا گیا ہے جو IRS-1A کے لئے اہل ہے اس کو خود اسرو نے تیار کیا ہے اس ادارہ کے پراجکٹ کو حکومت ہند نے جون ۱۹۸۲ میں منظوری دی تھی۔

IRS-1A کے مبینہ حقائق (DATA PRODUCT) کو موصول کرنے والا اسٹیشن جو NRSA کا ایک اہم حصہ ہے شاد نگر حیدر آباد میں واقع ہے ان مبینہ حقائق کو پروس کرنے اور ان مبینہ حقائق کے اشیاء کی تحقیقی سہولیات کا مرکز بال نگر حیدر آباد میں واقع ہے یہ مبینہ حقائق زمینی اسٹیشن پر چار درجوں میں فراہم ہوتے ہیں ۱) براؤز ۲) سٹانڈرڈ ۳) پریشن (PRECISION)

۴) اسپیشل پراڈکٹس اور کمپیوٹر کمپاٹیبل ٹیپ (C.C.T) کے روپ میں ۷۰ ملی میٹر کے سادے فلم (بغیر رنگ کے) مائیکرو فیچ یا ۲۴۰ ملی میٹر کے سادے یا رنگین چھاپ رنگین کامپوسیٹس تیار ہوتے ہیں یہ تصاویر دو دن کے عرصہ میں براؤز لیول آتے ہیں سات دن کے عرصہ میں سٹانڈرڈ اور ۱۵ دن کے عرصہ میں پریشن پراڈکٹ یا اسپیشل پراڈکٹ میں تبدیل ہوتے ہیں۔

اس خلائی جہاز کے پراجکٹ کی تکمیل میں نمایاں حصہ اسرو اور اس کے اکائیوں کا رہا اس کے علاوہ پبلک اور پرائیویٹ سیکٹروں نے بھی خلائی جہاز کی تیاری میں نمایاں حصہ لیا جس میں ہندوستان ایرو نٹکس پرائیویٹ لمیٹیڈ اور بھارت الکٹرانکس لمیٹیڈ کافی اہم ہیں۔

پراجکٹ رپورٹ کے مطابق اس خلائی جہاز کو ۱۹۸۶ میں ہی خلا میں بھیج دینا چاہئے تھی لیکن یہ خلائی جہاز ۱۹۸۸ میں تیار ہوا اس تاخیر کا سبب خلائی جہاز میں رکھے جانے والے سارے آلات کو اعلیٰ کنٹرول کے معیار کے مطابق تیار ہونے تھے جو اس مشن کو تین سال تک زندہ رکھ سکے۔

سلطان سائنس فیچر

IRS-1A خلائی جہاز کی پرواز اور اس کا عمل ملک کے ریموٹ سنسنگ پروگرام ۱۹۹۰-۱۹۸۰ کے ٹائم فریم میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

سورج کا جائزہ

انسان نے جن مصنوعی سیاروں کو خلا میں چھوڑ رکھا ہے ان میں خود کار خلائی جہازوں نے انسان کی معلوماتی تشنگی کی سیرابی میں کسی حد تک کامیابی حاصل کر سکے ہیں زمین کے گرد چکر لگانے والے سیارے چاند اور زمین سے کروڑ ہا میل دور رہنے والے سورج کے علاوہ دیگر ستاروں اور سیاروں کے متعلق ان مصنوعی سیاروں نے جو معلومات فراہم کی ہیں وہ کافی اہم و بیش قیمتی ہیں۔

گذشتہ تین دنوں میں نظام شمسی کے بارے معلومات حاصل کرنے والے روبوٹ کشتیوں میں سے چند نے نظام شمسی کے مرکز سورج کا بالکل قریب سے معاینہ کیا ہے تو چند اور کشتیوں نے نظام شمسی کے آخری منزل کو اپنا نشانہ بنایا ہے اور ان تک پہنچ رہی ہیں جو ۱۹۸۳ میں PIONEER 10 نامی ایک خلائی جہاز کو خلا میں بھیجا گیا آج تک یہ خلائی جہاز نظام شمسی کے حدود کو چھوڑ کر غیر متعدد ستاروں کے درمیان سے گذرتا ہوا بغیر کسی مرکز اور نشان کے آگے بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے اس خلائی جہاز میں سائنس دانوں نے زمین اور زمین سے متعلق ہماری معلوماتی ایک تختی رکھ چھوڑی ہے اگر وہ خلائی جہاز کسی اور سیارے یا ستارے کی دنیا پر رہنے والے علامتہ جانداروں کے ہاتھ لگ جائے تو زمین اور زمین والوں کے متعلق معلومات حاصل کر سکیں۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں نظام شمسی کے نو سیاروں میں سے سات سیاروں کی تحقیق کو خود کار روبوٹ کشتیوں نے مکمل کر لیا ہے نظام شمسی کا پہلا سیارہ عطارد (MERCURY) چاند کی طرح غاروں سے پر ایک مردہ سیارہ ہے اس سیارے کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے امریکہ کے MARINER-10 نے گذشتہ دس سال سے اس کے اطراف گردش کرتے ہوئے کئی اہم معلومات فراہم کیں گھنے بادلوں کے نیچے چھپا سیارہ زہرہ (شکر VENUS) کے بارے میں روس کے وینیرا نامی سیریس کے ۱۸ خلائی کشتیاں معلومات فراہم) کرنے میں کامیاب رہیں ان کی رپورٹ کے مطابق زہرہ حرارت 45° C اور فضا کا دباؤ زمین سے تقریباً سو گنا زیادہ ہے ایسے بھیانک و پر خطر ماحول میں شاید ہی کوئی جاندار شئے زندہ بچ سکے۔

نظام شمسی کے چوتھے سیارے پر علم ہیئت کے ماہرین نے خصوصی توجہ دی تھی آج بھی یہ سیارہ سائنس دانوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے یہ سیارہ زمین کے قطر سے صرف آدھا ہے اور اس کے کئی خصوصیات زمین سے ملتی جلتی ہیں دوسرے سیاروں کے مقابلے میں اس سیارے پر ماحول کا خطرہ کچھ کم ہے اس سے پہلے یہ اندازہ تھا کہ اس سیارے پر درختوں کی قطاریں ندی نالے وغیرہ موجود ہیں لیکن ۱۹۶۵ میں زہرہ سے بالکل قریب سے گذرنے والی روبوٹ کشتیوں کے مطابق نہ یہاں درخت ہیں اور نہ ہی ندی یا نالے ۱۹۷۶ میں امریکہ کے وائی کنگ سیریس کی دو کشتیاں زہرہ پر اتریں اور وہاں کی مٹی کا تجزیہ کرنے پر یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ زمین پر بسنے والوں کی ضروریات زندگی کی اشیاء اس دنیا میں بہت کم نظر آتے ہیں۔

1-6-1990

خلائی سائنس میں ہندوستان کی پیش رفت

تالیف ۔ بی ۔ آر ۔ ڈی پرساد (انگریزی) ۔ ترجمہ ۔ ڈاکٹر صبغت اللہ شکور، لیکچرار گورنمنٹ آرٹس کالج

سلطان سائنس فیچر

(تیسری قسط)

سیارہ زحل کی سیاحت

نظام شمسی کے چھ سیارے مشتری (گرو JUPITER) زحل (شنی SATURN) اور یورینس کے بارے میں VOYAGER اور PIONEER نامی سیریز کی خلائی کشتیوں نے معلوماتی طور پر تحقیقات کی ہیں۔ اسی دورہ پر گامزن ۱۹۷۹ء، ۱۹۸۱ء کے درمیانی دو سالہ عرصہ میں سیارہ زحل و مشتری کے بارے میں VOYAGER 1, 2 نے بیش قیمت تحقیقات کئے۔ خصوصی طور پر سیارہ زحل کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے اطراف ایک انگوٹھی نما دائرہ ہے۔ لیکن روبوٹ کشتیوں کی تحقیق کے بعد اس سیارے کے بارے میں اب تک جو درسی کتابوں میں پڑھایا جاتا تھا ان میں خصوصی تبدیلی لانی ہوگی۔ صرف اتنا ہی نہیں، نظام شمسی کے ساتویں سیارے کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ انسان کی آنکھوں کو صاف طور پر دکھائی دیتا ہے۔ یورینس سیارے کا کافی قریب سے مطالعہ کرنے کے بعد گذشتہ سال VOYOGER 2 اور NEPTUNE سیارے کے قریب پہنچ چکا ہے۔ اسی طرح اور جو کوپر جیسے نامی دو دوسرے سیاروں کی کھوج میں بھی ایسی روبوٹ کشتیوں نے کی اور ان سے انسان کو تفصیلی تعارف بھی کرایا گیا ہے۔

ان ساری کارگذاریوں کا جائزہ لینے پر یہ اندازہ لگانا کافی مشکل ہے کہ علم ہیئت کے لئے خودکار خلائی کشتیوں نے کتنا اور کیا کیا دیا؟ انسان کی دوست مشینی آدمی (روبوٹ) نے خلائی تحقیق میں کافی مدد کی ہے اور وہ اس راہ میں کافی معاون بھی ثابت ہو چکا ہے۔ لیکن اتنا سب کچھ کرنے کے باوجود بھی انسان سارا کام اسی روبوٹ کے ذمہ چھوڑ کر خود آرام سے نہیں بیٹھا۔ انسان یہ بھی جانتا ہے کہ خلائی سفر خطرناک ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ انسان اس سفر کئی مرتبہ جا چکا ہے اور مستقبل میں بھی وہ آگے ہی بڑھتا چلا جائے گا۔ زمین سے بالکل قریب گردش کرنے والے سیارہ چاند کا جب سے اس نے

انشروع ہوا ہے اسی دن سے نظام شمسی کے دوسرے سیاروں تک رسائی حاصل کرنے کے لئے انسان کئی غوروں کے بعد منصوبے تیار کرنے میں مصروف ہے۔

اگر انسان نے چاہا کہ وہ زمین کا ایک چکر دو گھنٹے لگائے تو اس

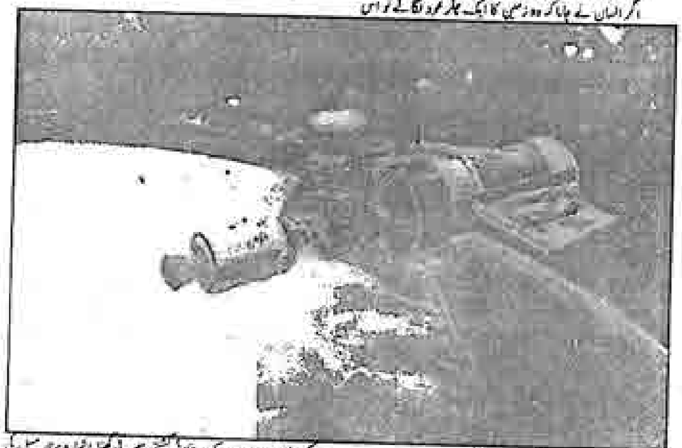

امریکہ کا خلائی اسٹیشن سکائی لیاب

کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ خلائی کشتی میں فی گھنٹہ اٹھارہ ہزار میل کی رفتار سے پرواز کرے۔ اس تیز رفتاری کا اثر انسانی جسم پر کیا ہوگا اس تیز رفتاری سے اس کو کوئی خطرہ تو لاحق نہیں ہوگا؟ اس بات کی تحقیق گگارین نے کی اور یہ ثابت کر دیا کہ اگر انسان نے یہ تیز رفتار سفر اختیار بھی کیا تو اس کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہوگا۔ اس تحقیق کے بعد روس اور امریکہ مستقبل میں خلائی سفر کی تیاری میں جٹ گئے۔ خلائی صدی کے آغاز میں روس نے کئی حیرت انگیز کارنامے انجام دئے۔ جس میں خلائی سفر پر سب سے پہلے روانہ ہونے والی خاتون VYALINTEENA TERESHKOVA کا حیرت انگیز کارنامہ بھی شامل ہے۔

خلائی سفر کے ابتدائی مراحل میں امریکہ روس سے کچھ پیچھے رہ گیا تھا لیکن تھوڑے وقفہ میں اس نے یہ کمی پوری کر لی ۱۹۶۰ء کے دہے کے درمیانی حصہ میں امریکی خلابازوں نے قبل روسی خلابازوں نے دستی مدار میں جو سرکس کرتب کئے اور ان سے لطف اندوز ہوتے رہے ان کو دیکھ کر دنیا والے انگشت بدنداں رہ گئے۔ خلائی پروگرام میں امریکہ و روس نے انفرادی طور پر جداگانہ منصوبے تیار کئے۔ امریکہ نے چاند پر اترنے کا پروگرام بنایا تو روس نے زمینی مدار میں ایک وسیع و عریض خلائی قریہ کا تیار کی اور اس میں کئی سو دن تک بسر

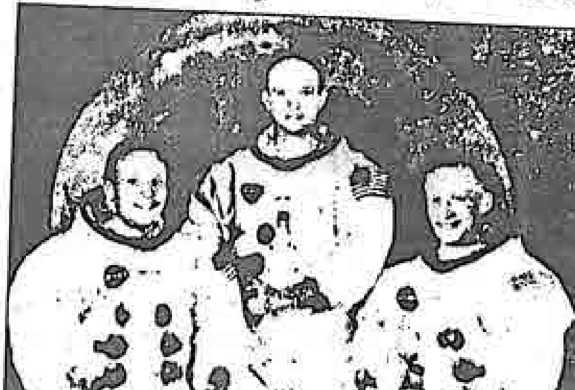

اپولو ۔ ۱۱ کے خلاباز نیل آرم سٹرانگ، مائیکل کالنس اور ایڈون آلڈرن

کرنے کے بعد صحیح سلامتی سے زمین پر واپس لوٹ آئے۔

گیارہ خلاباز

۱۹۶۰ء کے دہے کے آخر تک چاند پر پہنچنے کے لئے امریکہ اور روس کے درمیان کڑا مقابلہ شروع ہوا تھا۔ بالآخر اس مقابلہ میں امریکہ کی جیت ہوئی جب کہ ۲۱ جولائی ۱۹۶۹ء کو امریکہ کے نیل آرم اسٹرانگ نے چاند پر اپنا قدم رکھ کر ایک مستقل تاریخ ہی بنا دی۔ پھر یکے بعد دیگرے گیارہ اور خلاباز چاند پر چہل قدمی کے بعد واپس آگئے ہیں۔ ادھر امریکہ نے انسان کو چاند پر بھیج کر معلومات حاصل کیں تو ادھر روس نے اپنی روبوٹ کشتیوں کی مدد سے چاند کی مکمل تحقیقات کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

انسان نے خلا میں جانے کی قابلیت تو پیدا کر لی لیکن اس کے سامنے ایک اور گمبھیر سوال یہ کھڑا ہوا کہ کیا وہ اس ماحول میں ایک طویل عرصہ تک زندہ بھی رہ سکے گا؟ یہ سوال اس لئے پیدا ہوا کہ خلا میں انسان کو سانس لینے کیلئے ہوا درکار ہے اور خلا میں ہوا نہیں ہے اس کے ساتھ ساتھ وہاں الٹراوائلٹ کرنیں بھی موجود ہیں جس سے جانی نقصان پہنچتا ہے۔ ایک عرصہ تک یہ سوال معمہ ہی بنا رہا۔ اس معمہ کا حل تلاش کرنے کے لئے امریکہ اور روس دونوں نے ہی خلائی اسٹیشن نامی کشتیاں مدار میں چھوڑ رکھے ہیں۔ ان خلائی اسٹیشنوں میں خلاباز اسی طرح رہ سکتے ہیں جیسے کہ وہ زمین پر رہا کرتے ہیں۔ یہ بات تو ہر کوئی جانتا ہے کہ خلا میں انسان کا وزن اتنا نہیں ہوتا جتنا کہ زمین پر ہوتا ہے۔

خلائی اسٹیشنوں کے قیام میں روس کافی آگے بڑھ چکا ہے اب تک وہ سلیوت نامی سات خلائی اسٹیشن روس نے مدار میں چھوڑے ہیں۔ حال ہی میں روس نے ایک خلائی اسٹیشن سلیوت نامی خلائی اسٹیشن مدار میں چھوڑ رکھا ہے جس میں اس کے تین بازوؤں نے پہلی مرتبہ ۲۳۷ دن کا قیام کیا پھر ۳۰۰ دن سے بھی زیادہ طویل قیام کر کے ایک ورلڈ ریکارڈ قائم کیا۔ یہ بات یہاں یاد دلا چکی ہے کہ اپریل ۱۹۸۴ء میں بھارت کے راکیش شرما نے خلائی اسٹیشن میں ایک ہفتہ قیام کیا تھا۔

(باقی آئندہ)

RECRUITMENT OF TRANSMISSION EXECUTIVE (GENERAL AND PRODUCTION), 1990
F. No. 3/12/89-P&P. Staff Selection Commission will hold on Sunday, the 27th May, 1990, a combined competitive examination for recruitment to the post of Transmission Executive in various Stations of All India Radio.

خلائی سائنس میں ہندوستان کی پیش رفت

تالیف بی آر گرو پرساد ڈرکنڈا ۔ اردو ترجمہ ڈاکٹر صبغت اللہ ۔ بنگلور ۔ گورنمنٹ آرٹس کالج ۔ بنگلور

سلطان سائنس فیچر

سوویت روس اور ہندوستان کی مثالی دوستی زمین کی چٹانوں سے آگے خلائی وسعتوں کو بھی سمیٹ لیا۔ ان دونوں ممالک کی مشترکہ خلائی مہم نے ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اپریل ۱۹۸۴ء میں بائیکونور کے کاسموڈروم سے خلائی جہاز سویوز ٹی ۱۱ داغا گیا جس میں ہندوستان کے پہلے خلانورد راکیش شرما اپنے دونوں روسی خلانورد ساتھیوں یوری ملیشیف اور گینادی اسٹریکالوف کے ساتھ خلا میں داخل ہوئے۔ مشترکہ مہم کے یہ تینوں خلانورد مخصوص خلائی لباس پہنے ہوئے تھے جس پر ہندوستان کا قومی نشان تھا۔ [illegible]

[illegible]

راکیش شرما اپنے دونوں روسی خلانوردوں کے ہمراہ

ہندوستان کے دوسرے خلانورد روینش ملہوترہ

راکیش شرما خلائی لباس میں

اعتذار

گزشتہ جمعہ شہر بنگلور میں وقف سیمینار کا افتتاح عمل میں آیا تھا اور اس موقع پر ہم نے سیمینار کے متعلق بعض مضامین شائع کئے تھے جس کے باعث ہر جمعہ شائع ہونے والا ہمارا سائنس فیچر روک دیا گیا تھا۔ سائنس فیچر کا تسلسل ٹوٹ گیا تھا اس شمارے میں خلائی سائنس میں ہندوستانی پیش رفت کی چوتھی قسط دی جا رہی ہے۔

ادارہ

خلائی سائنس میں ہندوستان کی پیش رفت

تالیف: پی۔ آر۔ گرو پرساد دکشا۔ اردو ترجمہ: ڈاکٹر صبغۃ اللہ، بنگلور۔ گورنمنٹ آرٹس کالج بنگلور

پانچویں قسط

(نوٹ: بعض ناگزیر وجوہات کی بناء پر ہم گزشتہ جمعہ سائنس فیچر شائع نہیں کر سکے تھے۔ اس دلچسپ سائنس فیچر کے سلسلے کی پانچویں کڑی ملاحظہ فرمائیں۔ ادارہ)

سیارہ مریخ پر روسی کھوج

گزشتہ بارہ سال میں انسان کا بنایا ہوا کوئی بھی خلائی جہاز مریخ تک نہیں پہنچ پایا۔ لیکن جولائی 1988ء میں فوبوس (۱) اور فوبوس (۲) نامی دو خودکار خلائی جہاز مریخ کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ روس کے اس کارنامے سے دنیا کی توجہ مریخ کی طرف مبذول ہو چکی ہے۔ یہ دونوں خلائی جہاز ... مریخ کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ نظام شمسی کے دیگر سیاروں اور ان کے سیارچوں کے بارے میں آج تک انسان نے جو معلومات فراہم کی ہیں ... دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اس کا سبب خودکار خلائی جہاز ہیں ... انسانی معلوماتی تشنگی کی سیرابی ہو رہی ہے۔

مریخ پر روشنی کی کھوج

خودکار خلائی جہازوں کے ذریعے دیگر اجرام فلکی کی تلاش و تحقیق سے متعلق روس کی کامیابی بھی کچھ کم نہیں ہے۔ اس ملک نے جو روبوٹ خلائی جہاز خلا میں چھوڑے ہیں ان جہازوں نے چاند، زمین سے قریب سیارہ زہرہ اور ہیلی دمدار ستارہ کو ... ہمیں پہچان کرائی ہے۔ زمین اور مریخ میں مختلف قسم کی مماثلت پائی جاتی ہے۔ 20 سال قبل روس نے مریخ کی تحقیق کی کوشش کی۔ لیکن اس میدان میں مکمل کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اس وجہ سے روس کی توجہ بھی اس سیارہ کی جانب سے ہٹ گئی۔ لیکن آج بھی روس اس سیارے کو کافی اہمیت دیتا ہے۔ یہ بات روسی سائنس دانوں کے واضح کردہ مستقبلی پروگراموں کی فہرست سے واضح ہوتی ہے جو اس کی گواہ ہے۔ اس فہرست میں جو سرفہرست پروگرام ہے وہ فوبوس کا ہے۔ جس کے بارے میں چند ماہرین کا خیال ہے کہ مریخ پر انسان کے قدم پہنچنے کا یہ پہلا اقدام ہے۔ دونوں فوبوس خلائی جہازوں کا وزن ۶ ٹن ہے۔ جہاز چھ ہزار 6,000 کے ہیں۔ مریخ پر ان جہازوں کو بھیجنے کا مقصد مریخ اور اس کے دو چھوٹے سیارچوں کی تفصیلی معلومات حاصل کرنی ہے۔ اس پروگرام میں اس بات پر خاص توجہ دی گئی ہے کہ یہ فوبوس کا کافی قریب سے مطالعہ کریں۔ اسی لحاظ سے جو خلائی جہاز چھوڑے گئے ان کا نام بھی فوبوس ہی رکھا گیا۔ اس پروگرام میں کل 13 ممالک حصہ لے رہے ہیں۔

یہی سیارہ مریخ اور زمین کی مماثلت

نظام شمسی کا چوتھا سیارہ مریخ نے کافی عرصے سے انسانی اشتیاق میں ہلچل پیدا کر رکھی ہے۔ نظام شمسی کے دیگر سیاروں میں سیارہ مریخ زمین سے کافی مماثلت رکھتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ انسان اس کے بارے میں کافی معلومات حاصل کرنے کی جستجو میں لگا ہوا ہے۔ جس طرح زمین کا ایک دن 24 گھنٹوں کا ہے تو مریخ کا ایک دن 24.5 گھنٹوں کا ہے۔ زمین کی طرح مریخ کی گردش میں بھی موسم

ہونے کی وجہ سے اس سیارہ پر موسم گرما اور موسم سرما بھی ہوتا ہے۔ سیارہ مریخ کا درجہ حرارت بھی دوسرے سیاروں کی طرف نہ کافی زیادہ ہے اور نہ ہی کافی کم ہے بلکہ معتدل درجہ حرارت کا حامل ہے۔ سیارہ مریخ اب زمین سے کافی قریب ہے۔ حالیہ صدی میں وہ زمین سے اتنا قریب کبھی نہیں آیا۔ اب زمین اور مریخ کے درمیان 365 لاکھ میل کا فاصلہ ہے۔ 1971ء میں مریخ زمین سے ۵۲۰ لاکھ میل کے فاصلے پر تھا۔ مریخ کے بارے میں کئی دلچسپ اشتیاق پیدا ہونے والے اسباب ہیں۔ اس سیارہ کے قطب پر بھی چمکدار دھبے دکھائی دیتے ہیں۔ ان دھبوں کو مشہور ماہر فلکیات ولیم ہرشل نے فلکیاتی دوربین کے ذریعے پہلی مرتبہ 1784ء میں دیکھا اور کہا تھا کہ اس سیارہ پر پانی کا وجود ہوگا کیونکہ جاندار کے وجود کے لئے پانی ضروری ہے اور شاید مریخ پر صرف جاندار ہی نہیں عقل مند جاندار بھی موجود ہوں گے۔ کئی دنوں تک سائنس دانوں کا یہی قیاس رہا۔ لیکن گزشتہ 25 برسوں سے مریخ کا کافی قریب سے مشاہدہ کرنے والے امریکی و روسی خلائی جہازوں نے اس قیاس کے خلاف رپورٹ دی۔ وائکنگ نامی دو امریکی خلائی جہاز بحفاظت سیارہ مریخ پر اتر گئے۔ ان خلائی جہازوں نے کافی صاف اور تفصیلی تصاویر زمین پر روانہ کی ہیں جن میں کوئی جاندار ہوتے دکھائی نہیں دیتے اور نہ ہی سیارہ کی مٹی میں کوئی جراثیم پائے گئے۔ ان تفاصیل کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس سیارہ میں کسی جاندار کا وجود نہیں اور اس موضوع کے بارے میں آج کے سائنسی حلقے میں یہ رائے عام تو نہیں لیکن اکثر اس رائے سے متفق ہیں کہ مریخ پر کسی جاندار شئے کا وجود نہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس سیارے سے متعلق انسانی اشتیاق و جستجو کا خاتمہ نہیں ہوا۔ امریکہ کے ماہرین اور وائکنگ سیریز کے خلائی جہازوں سے مریخ کے بارے میں کافی تجربے کئے جا چکے ہیں اور اس سے کئی نتائج بھی اخذ کئے جا چکے ہیں۔ اس کے باوجود سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اور بھی کئی موضوعات تشنہ ہیں۔

مریخ کے دو چھوٹے چھوٹے تابع سیاروں کی تفصیلی تحقیق ناکمل ہے۔ اس تحقیق کو مکمل کرنے کی غرض سے ہی فوبوس پروگرام کو تشکیل دیا گیا ہے جس کے تحت سیارہ مریخ کا کامل قریب سے مشاہدہ کرنا ہے۔

سیارہ مریخ کے دو چاند

سیارہ مریخ کے دو چھوٹے چھوٹے تابع سیارے ہیں جن کا نام فوبوس اور ڈیموس ہے۔ یہ اجسام فلکی آلو کی وضع کے اتنے چھوٹے ہیں کہ ان کو تابع سیارے کہنے کے بجائے سیارہ مریخ کے گرد چکر لگانے والے دو پہاڑ کہا جا سکتا ہے۔ فوبوس بڑا تابع سیارہ ہے جو تقریباً 19 کلو میٹر لمبا 22 کلو میٹر چوڑا ہے۔ 6,000 کلو میٹر کی اونچائی کے مدار میں فوبوس سیارہ مریخ کا ایک چکر مکمل کرنے کے لئے صرف ۷ گھنٹے ۳۹ منٹ لیتا ہے۔ ڈیموس چھوٹا تابع سیارہ تقریباً 11.5 کلو میٹر لمبا اور 12 کلو میٹر چوڑا ہے۔ یہ مریخ سے تقریباً 20,000 کلو میٹر دور ہے۔ اور یہ تیس گھنٹے اٹھارہ منٹ میں ایک چکر مکمل کرتا ہے۔ مریخ کے ان دو تابع سیاروں کے بارے میں اٹھارہویں صدی عیسوی کے مشہور انگلستانی ادیب جوناتھن سوفٹ اور فرانسیسی ادیب والٹیر نے اپنی کتابوں میں ذکر کیا تھا۔ 1877ء میں ایک ماہر فلکیات اسف ہال نے سیارہ مریخ اور اس کے تابع سیاروں کی نشاندہی کی اس کو محض ایک اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے۔ ان دونوں تابع سیاروں کی تصاویر کو مصنوعی سیارہ میرینر ۹ نے زمین کو بھیجا۔ یہ سیارہ مریخ کا پہلا باب ہے۔ سیارہ مریخ کو انگریزی میں مارس کہا جاتا ہے۔ یہ سیارہ زمین پر خون کی طرح لال رنگ کا دکھائی دیتا ہے۔ اس لئے قدیم رومیوں نے اس سیارہ کو اپنے جنگی دیوتا کا نام مارس دیا۔ اسف ہال نے جن دو تابع سیاروں کا پتہ لگایا ان کو مارس کے بچوں کا نام فوبوس (خوف) اور ڈیموس (دہشت) دیا گیا۔ فوبوس اور ڈیموس جو حجم میں کافی چھوٹے ہیں اکثر ماہر فلکیات نے انہیں سیارچوں کے زمرے میں شمار کیا ہے۔ ماہر فلکیات کا اندازہ ہے کہ یہ دونوں سیارچے مریخ سے کشش ثقل کی طاقت سے

آپس میں جڑے ہیں۔ سیارچے کہلانے والے یہ چھوٹے اجسام فلکی لاکھوں کی تعداد میں سیارہ مریخ اور مشتری کے درمیان موجود ہیں اور یہ سورج کے اطراف گردش کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے فوبوس اور ڈیموس کا کافی قریب سے مطالعہ کرنے اور کے چہرہ مہرہ کی پہچان آسان ہے۔ اگر واقعی یہ دونوں سیارے سیارچے ہی ہیں تو ان کی تحقیق نظام شمسی کی ابتداء و ارتقاء کے بارے میں معلوماتی نقطہ نظر سے بہت کچھ اور بھی فوائد ہوں گے۔ اس طرح سیارہ مریخ کے یہ دونوں سیارچے ماہر فلکیات کے اشتیاق کو بڑھا رہا ہے۔

فوبوس خلائی جہازوں کا طریقہ کار

فوبوس اور ڈیموس سیارچوں کو اپنی منزل بنا کر فوبوس خلائی جہاز جو خلائی سفر کر رہے ہیں وہ تو اور بھی دلچسپ سفر ہے۔ پانچ پانچ دن کے فرق سے داغے جانے والے یہ دونوں خلائی جہاز تقریباً 200 دن کے سفر کے بعد مریخ کے قریب پہنچ سکیں گے۔ اس سفر کے دوران وہ سورج کا بھی جائزہ لیں گے۔ آج ایک منصوبے کے تحت ان دونوں خلائی جہازوں میں جو خلائی جہاز سب سے پہلے مریخ کے قریب پہنچے گا۔ اس میں رکھے گئے چھوٹے چھوٹے راکٹوں کی مدد کے ذریعے اس خلائی جہاز کو مصنوعی سیارہ کی طرح بنایا جاتا ہے۔ اس کارکردگی کے بعد وہ سیارہ مریخ کو مرکز بنا کر مرکز کے اطراف کی طرح مریخ کے مدار میں گردش شروع کرے گا۔ اسی وقت خلائی جہاز کی الیکٹرانک آنکھیں یعنی ویڈیو کیمرے اور کچھ سائنسی آلے مریخ پر اپنا دھیان دیں گے۔ کچھ دیر بعد وہ خلائی جہاز زمین سے ملنے والے ہدایات پر اپنا مدار تبدیل کرے گا اور نئے مدار میں داخل ہو جائے گا۔ اس نئے مدار میں چونکہ سیارچہ فوبوس بھی شامل ہوگا۔ تو یہ خلائی جہاز تھوڑے وقفہ کے بعد فوبوس سے جا ملے گا۔ پھر یہ خلائی جہاز دلچسپ سرکس کرے گا جو روسی تکنیک کا مختلف قسم کا امتحان ہوگا۔ جب خلائی جہاز فوبوس سیارہ پر تقریباً پچاس میٹر کی بلندی پر ہیلی کوپٹر کی طرح تیرتے ہوئے تیز رفتار سے آگے بڑھے گا تو اس دوران خلائی جہاز میں جو راڈار ہے وہ اپنی نظر نیچے سیارہ پر مرکوز کرے گا۔ ساتھ ہی اپنے مخصوص آلوں سے لیزر کرنوں کو فوبوس سیارہ پر مرکوز کرے گا جس سے بھاپ کی شکل میں اوپر اٹھنے والی دھول فوبوس سیارہ خلائی جہاز کے آلے اپنے اندر داخل کر لیں گے۔ ایک اور مقناطیسی آلہ کی حرکت سے فوبوس سیارہ سے حاصل ہونے والے مختلف ذرات کو اس خلائی جہاز میں داخل کرایا جائے گا۔ اس عمل کے جاری رہتے وقت ہی فوبوس خلائی جہاز کے دور نما کیمرے نچلے سیارے کے تصاویر لے گا۔ پھر اپنے حاصل شدہ سائنسی معلومات اور تمام تصاویر کو اپنے انٹینا کے ذریعہ زمین پر نشر کرے گا۔ (باقی آئندہ)

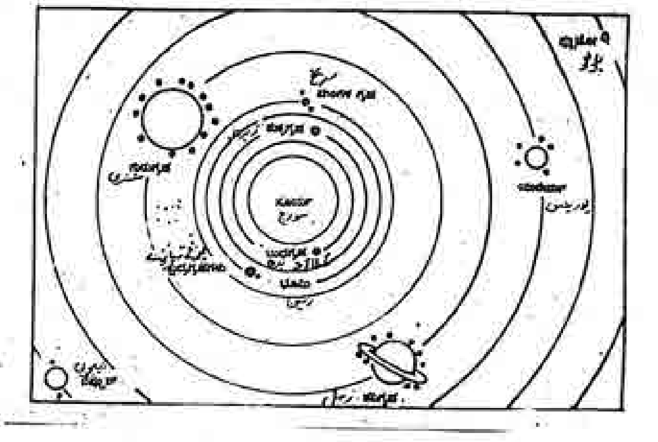

سیارہ مریخ اور اس کے دو تابع سیارے فوبوس اور ڈیموس

سلطان سائنس فیچر

جناب ایڈیٹر صاحب
وعلیکم

میں سب سے پہلے دیر سے خط لکھنے کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ میرا ... کردہ مضمون جو آپ کے موقر اخبار میں شائع ہوا ہے گوشہ پر گزشتہ شمارے کی کاپی موصول ہوئی ہے۔ اس مضمون کو شائع کرنے کیلئے آپ کا اور ترجمہ کرنے کے لئے جناب صبغۃ اللہ صاحب کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ میں اردو نہیں پڑھ سکتا لیکن میرے ایک مشہور دوست نے اس مضمون کے عنوان اور مضمون کے ضروری حصوں کا کنڑا میں ترجمہ کرکے بتایا۔ میری یہ خواہش ہے کہ آپ یہی مستقل میں میرے مضامین کا اردو ترجمہ شائع کریں تاکہ مسلم ... جدید سائنس اور ٹکنالوجی سے آگاہ ہو سکیں۔ اگر میرا مضمون آپ کے جس دن کے اخبار میں شائع ہوتا ہے اس دن کا شمارہ روانہ کریں تو ممنون رہوں گا۔

آپ کا مخلص، پی۔ آر۔ گرو پرساد
... بنگلور۔ ۳

9-6-90

خلائی سائنس میں ہندوستان کی پیش رفت

تالیف بی۔ آر گرو پرساد (کنڑا) ۔ اردو ترجمہ ڈاکٹر صبغتہ اللہ بنگلور۔ گورنمنٹ آرٹس کالج ممور

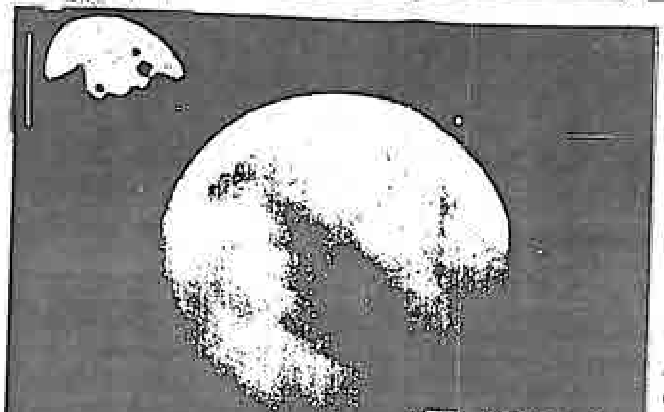

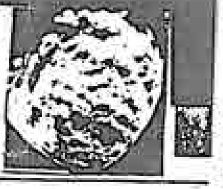

ستارہ مریخ اور اس کے دو تابع سیارے فوبوس اور ڈیموس

سلطان سائنس فیچر

پانچویں قسط

(اب تک بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر ہم گزشتہ جمعہ سائنس فیچر شائع نہیں کر سکے تھے۔ اس دلچسپ سائنس فیچر کے سلسلے کی پانچویں کڑی ملاحظہ فرمائیں۔ ادارہ)

ستارہ مریخ پر روسی تحقیق

گزشتہ بارہ سال میں انسان کا بنایا ہوا کوئی بھی خلائی جہاز مریخ تک نہیں پہنچ پایا۔ لیکن جولائی 1988ء میں فوبوس (1) اور فوبوس (2) نامی دو خودکار خلائی جہاز مریخ کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ روس کے اس کارنامے سے دنیا کی توجہ مریخ کی طرف مبذول ہو چکی ہے ...

مریخ پر روسی تجربے

خودکار خلائی جہازوں کے ذریعے دیگر اجسام فلکی کی تلاش و تحقیق سے متعلق روس کی کامیابی بھی کچھ کم نہیں ہے۔ اس ملک نے ... زمین اور مریخ میں ... 20 سال قبل روس نے مریخ کی تحقیق کی کوشش کی ... 6,000 ... 13 ممالک ...

سیارہ مریخ اور زمین کی مماثلت

نظام شمسی کا چوتھا سیارہ مریخ نے کافی عرصے سے انسانی اشتیاق میں ہلچل پیدا کر رکھی ہے۔ نظام شمسی کے دیگر سیاروں میں سیارہ مریخ زمین سے کافی مماثلت رکھتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ انسان اس کے بارے میں کافی معلومات حاصل کرنے کی جستجو میں لگا ہوا ہے ... 24.5 گھنٹوں کا ہے۔ زمین کی طرح مریخ کی گردش میں بھی ...

ستارہ مریخ کے دو چاند

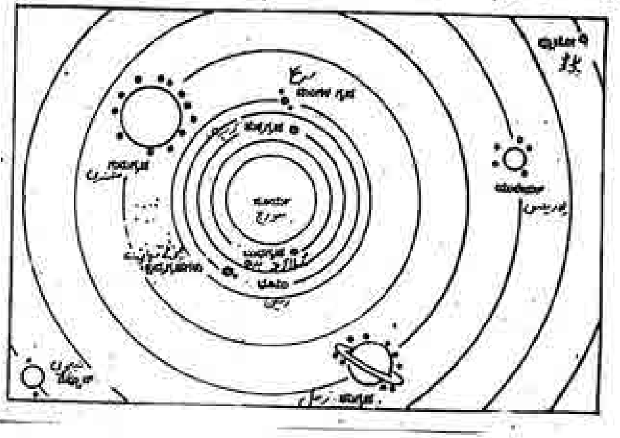

فوبوس خلائی جہازوں کا طریقۂ کار

... 365 ... 1971 ... 1784 ... 11.5 ... 20,000 ... 25 ... 182 ... 1877 ... 200 ...

محمد صبغت اللہ شیدا

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم

دکھن کی ایک مایہ ناز ہستی

سرزمین دکن کو ناز ہے کہ اس کے بطن سے پیدا ہونے والی ایک اہم شخصیت اردو کے اعلیٰ مرکز ترقی اردو بورڈ کی ڈائرکٹر ہے۔ اس سرزمین میں بہت سی علم دوست ہستیاں گذری ہیں جن کا نام ہمیشہ تابندہ رہے گا۔ کرناٹک کو اس بات کا فخر ہے کہ یہاں وہ عظیم ہستیاں گذری ہیں جن کا نام تاریخ ادب میں سنہری حرفوں سے لکھا جائے گا۔

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم

بہمنی اور عادل شاہی سلاطین سلطنت خداداد، خواجہ بندہ نواز، میراں جی... شمس العشاق وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ اس زمین سے پیدا ہونے والی اہم شخصیت ڈاکٹر فہمیدہ بیگم کی ہے جو زبان و ادب کی خدمت کا بے نظیر جذبہ رکھتی ہیں اور یہ ادبی ذوق و شوق انہیں ورثہ میں ملا ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ کرناٹک کے علمی و ادبی گھرانے کی چشم و چراغ ہیں۔ آپ کا ننھیال علم و ادب کا شیدائی تھا۔ آپ کے نانا محترم عبدالقادر صاحب مرحوم کنگل (ضلع کولار) کے رئیس تھے۔ پیشہ تجارت تھا لیکن اس کے باوجود علم و ادب سے گہرا لگاؤ رہا۔ آپ کا گھر سفید حویلی کہلاتا تھا۔ جو دو منزلہ عمارت تھی۔ بالائی منزل میں کتب خانہ اور نچلی منزل میں ایک ہال تھا جو صرف شاعروں کے لئے مخصوص تھا۔ اس زمانے کے مشہور شعرائے کرام یہاں جمع ہوتے تو ماہانہ مشاعرہ ہوتا۔ شعراء کی مہمان نوازی آپ کا محبوب مشغلہ تھا۔ انہی کی اکلوتی صفیہ النساء بیگم صاحبہ ہیں۔ آپ کی شادی بہت ہی کم عمری میں عبدالکریم صاحب رام نگر سے ہوئی۔ آپ کے والد حسن صاحب کے جد اور سپاہی پیشہ تھے۔ زوال سلطنت خداداد کے بعد آپ کے خاندان سے یہ ملازمت جاتی رہی اور آپ نے زراعت اور ریشم کی تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ سنہ ۱۹۵۲ء میں محترمہ صفیہ النساء صاحبہ ملازمت اختیار کرنے کے بعد بھی مستقل جدوجہد کرتی رہیں تاکہ بچوں کی تعلیم و تربیت اعلیٰ پیمانہ پر ہو۔ صفیہ النساء علمی و ادبی ذوق اپنے والد سے ورثہ میں پایا ہے۔ اسی ذوق نے

مضمون نگار

آپ کو درس و تدریس کی طرف کھینچا۔ آپ کو علم عروض سے خاص شغف ہے آپ نے ایک کتاب بنام "عروض غزلیات غالب" لکھی ہے۔ آپ کے پانچ بیٹے اور پانچ بیٹیاں ہیں۔ ڈاکٹر فہمیدہ بیگم صاحبہ کو انہیں محترمہ کی بیٹی ہیں جو رام نگر میں پیدا ہوئیں۔ آپ کے سب بھائی بہن اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ ڈاکٹر فہمیدہ بیگم کی ابتدائی تعلیم دو شریک ... کی زیر نگرانی گھر پر ہی ہوئی۔ ہائی اسکول کی تعلیم آپ نے مہارانی ہائی اسکول میں حاصل کی۔ ۱۹۵... میں ... ختم کیا۔ پھر بیلاری کالج ... سے ... بی اے آنرز اردو کے ساتھ امتیاز کا درجہ میں کامیاب کیا۔ سنہ ۱۹۶۲ء میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے آپ کو جونیر فیلو شپ عطا کیا جس پر آپ نے اپنا مقالہ "ریاست میسور میں اردو مثنوی کا ارتقاء" ڈاکٹر حبیب النساء بیگم کی نگرانی میں مکمل کیا۔

اسی اکتوبر ۱۹۶۷ء میں مہارانی کالج میسور میں بحیثیت اردو لکچرار آپ کا تقرر عمل میں آیا۔ اسی دوران آپ کو کامن ویلتھ اسکالرشپ ملا تو آپ مہارانی کالج سے ۔۔ ستمبر ۱۹۶۹ء میں اس عہدے سے سبکدوش ہو کر اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز لندن میں داخلہ لیا۔ تین سال اس مدت میں آپ لسانیات و صوتیات کی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ اردو تحقیق میں کافی دلچسپی لی۔ لندن کے مشہور کتب خانہ "انڈیا آفس" سوناس... برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لائبریری وغیرہ میں قدیم اردو مخطوطات سے مثنوی کا ایسا مواد ڈھونڈ نکالا جو آپ سے پہلے کسی کے ہاتھ نہیں لگا تھا جن میں میراں جی شمس العشاق کی ... محمود خوش دہان کا کلام اہم ہے۔ لندن کے کتب خانوں میں جو ... مخطوطے آپ نے ہندوستان کی بہت سے کتب خانوں کی چھان بین کا اور کرناٹک کے اہم مثنوی گو شعراء کا کلام منظر عام پر لایا جس میں گمبد شریف کے ملک الشعراء صنعتی، عزلت شاہ صدرالدین نوازنگل، عارف شاہ قادری اور حسن بن قادر سرادی کا کلام اہم ہے۔ الاشعرا کا ذکر شاذ و نادر ہی آپ نے پہلے تفصیلاً لکھنے کی ہے ریاست کرناٹک کے ان شعراء کا ذکر جو اس مقالے میں ہوا ہے اس کا علم نہ ہونے کے برابر تھا ڈاکٹر صاحبہ نے بڑی سنجیدہ ریسرچ، جانفشانی اور محنت کے ساتھ ان حقائق کو منظر عام پر لایا ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ مقالہ اب تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہو سکا۔ جس کا مقدمہ بہت سے حضرات اس کی خوشہ چینی کر کے اشعار ہے ہیں اور اس کے مواد کو اپنی ملکیت بنانے کی کوشش کر رہے ہیں جس کا پتہ آسانی کے ساتھ ان کی تصانیف میں لگایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ سے اس امر پر بحث ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ "اس کے علاوہ بھی مثنویوں کا مواد میرے پاس موجود ہے جسے اس مقالے میں شامل کر کے نظر ثانی کے بعد اس کو ایک دستاویزی حیثیت سے شائع کرنا چاہتی ہوں جیسا کہ یہ مقالہ۔ منظر عام پر آئے گا تو اس کی قدر و قیمت اور اہمیت کا اسی وقت اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اردو ادب میں ان کی قدر و قیمت اور اہمیت کیا ہے اسی محنت کا ثمرہ تھا کہ سنہ ۱۹۷۲ء میں میسور یونیورسٹی نے آپ کو اس مقالے پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی جس کو ریاست کی یونیورسٹیوں میں اردو کا اولین ڈاکٹریٹ ہونے کا فخر حاصل ہے۔

لندن جانے سے قبل ہی جناب خلیل اللہ صاحب ایم اے (اکنامکس) کو لنڈن لیٹ نے آپ کو رفیق حیات بنایا۔ جناب موصوف خلیل اللہ شاہ نقش رحمن کا مزار ... ہے مشہور بزرگ گذرے ہیں) کے خاندان سے ہیں۔ جنہیں شعر گوئی بہت عزیز نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ آپ نے تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد تحقیق میں کافی شہرت پائی تھی۔ لیکن چند ناگزیر حالات کی بنا پر یہ کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا۔ درس و تدریس کے سلسلے میں مختلف کالجوں میں خدمت انجام دیتے رہے۔ آپ کا اردو ادب سے خاص لگاؤ ہے اردو اور انگریزی ادب کا مطالعہ خاص کر اسلامی تہذیب و تمدن کا بہت گہرا ہے۔ آپ کرناٹک

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

[illegible]

جام جم

فوٹوز: مقصود حسن

سبزی منڈی میں امن پسند شہریوں نے احتجاج ... کے دوران پولیس کے معقول انتظام پر ... [illegible]

... اسٹیشن سے قریب ایک پبلک نل کو کچرے کی کنڈی میں تبدیل کر دیا گیا ہے

منادی ... انتظار

The daily Munsif Hyderabad
Sunday Edition 1-8-82

شہرت کے اعتبار سے فٹبال کے کھیل نے
تاباں رنگ سنا اور ہنگا ہے جہاں بھی اس کے
مقابلے ہوئے ہیں شائقین کا ایک جم غفیر اس
لاجواب کھیل کو دیکھنے کے لئے اسٹیڈیم کا رخ کرتا ہے۔
لیجئے ۱۹۸۲ء کے ورلڈ کپ ٹورنامنٹ کی
میزبانی کا اعزاز اسپین کو ملا۔ ورلڈ کپ کے مقابلے
شروع ہونے کے بعد جو ٹیم اور ہر ٹیم دوسرے
سے بہتر ثابت کرنے کے لئے
ہے اس بات کا فیصلہ کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم

بقیہ صفحہ ۳

اشاعت گھر کے مالک ہیں۔
۱۹۶۶ء میں بنگلور یونیورسٹی میں شعبۂ اردو
کا قیام عمل میں آیا۔ اعلیٰ سطح پر تعلیم دینے
کے لئے عارضی طور پر ڈاکٹر آمنہ خاتون صاحبہ
کا انتخاب عمل میں آیا۔ لیکن صرف ایک سال

راج ببر اور سمیتا پاٹل فلم ”بیدرد“ میں

امیتابھ بچن کی بیماری کے باعث ۸۰ کروڑ روپے کا سرمایہ خطرہ میں!

فلمساز امیتابھ بچن کی بیماری کے
باعث اس وقت تک بھگ ۸۰
کروڑ روپے کا سرمایہ خطرہ میں پڑ
گیا ہے۔ وہ فلمساز جو امیتابھ
کو لیکر اپنی فلمیں شروع کر چکے ہیں
ان دنوں ان کی نیند حرام ہو چکی
ہے۔

شبانہ کا نیا دوست؟

اداکارہ شبانہ اعظمی کو شفٹنے
بولنے فرینڈز بنانے میں ریو
شہرت حاصل ہے اور اس کے
فرینڈز میں مختلف لوگوں کے نام
لئے گئے۔ اب معلوم ہوا ہے کہ
اس کے بوائے فرینڈز میں اور کا اضافہ ہوا ہے اور
وہ پاکستانی اداکار ندیم۔ ندیم ایک ہندوستانی
فلم ”دوردیش“ میں کام کر چکے ہیں اور ان دنوں اس
فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں بمبئی آیا ہوا ہے۔ کہا
جاتا ہے کہ شبانہ کا بیشتر وقت صرف ندیم کے
ساتھ ہی گزر رہا ہے اور بھاری چادر دینے سے لگ
رہے وہ کا اظہار کر رہی ہیں۔

مثنوی سوز و گداز عشق کا شاعر نظیر ڈھکنی

سلطان ادبی ضمیمہ

از ڈاکٹر محمد صبغت اللہ، لیکچرار گورنمنٹ آرٹس کالج، ٹمکور

نظیر دکھنی کا ایک نادر الکلام مثنوی گو شاعر تھا۔ مثنوی کے مطالعہ سے یہ گمان ہوتا ہے کہ کہیں یہ نظیر اکبر آبادی تو نہیں؟ نہیں۔ کیونکہ نظیر اکبر آبادی کی پیدائش ۱۱۵۰ھ [illegible] اور وفات ۱۲۴۶ھ [illegible] میں ہوئی۔ یہ مثنوی ۱۲۰۰ھ [illegible] میں تصنیف ہوئی ہے یعنی نظیر اکبر آبادی کی وفات کے چالیس سال بعد اس سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ مثنوی ہذا کا مصنف نظیر اکبر آبادی نہیں ہے بلکہ کوئی اور شاعر ہے جس کے تفصیلی حالات پردۂ خفا میں ہیں۔ شاعر نے مثنوی میں صرف اپنا تخلص استعمال کیا ہے۔ مثنوی میں کہیں بھی اس نے اپنے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے اور نہ ہی اس طرف اشارہ کیا ہے اور نہ اپنے کسی ہمعصر کا ذکر کیا ہے جو ممکن ہے اس کے حالات زندگی اور مقام متعین کرنے میں ممد ثابت ہوتے۔

تعداد اشعار

[illegible]

مثنوی کی تاریخ تصنیف

[illegible]

مثنوی سوز و گداز عشق

سلطان ادبی فیچر

ڈاکٹر صبغت اللہ۔ لیکچرار گورنمنٹ آرٹس کالج ٹمکور

دوسری قسط

مثنوی سوز و گداز عشق کا موضوع کافی مختصر اور سیدھا سادہ ہے۔ واقعات میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے اور نہ ہی کوئی زائد حکایات ہی لائے گئے ہیں۔ عشق و محبت کا یہ افسانہ انسانی فطرت و احساسات کا آئینہ دار ہے۔ یہ مثنوی جذبات نگاری کا ایک حسین مرقع ہے۔ مثنوی کا سادہ عام فہم انداز بیان، شگفتہ الفاظ و محاورات نے اسے ایک انفرادی شان عطا کی ہے۔ [illegible]

[illegible]

رسوائی میں کیا بھلائی ہے
جگ ہنسائی ہے [illegible]
دل سے کہئے نکالا کیجئے
کہیں [illegible]

[illegible]

کردار نگاری

[illegible]

واقعہ نگاری

[illegible]

مکالمہ نگاری

[illegible]

جذبات نگاری

[illegible]

منظر نگاری

[illegible]

صنعت تضاد

[illegible]

21-10-1990 The Daily Sultan - Bangalore - P-I

ساحر لدھیانوی شخصیت و فن

ڈاکٹر محمد صبغت اللہ،
گورنمنٹ آرٹس کالج، ٹمکور۔

ساحر لدھیانوی برصغیر ہند و پاک کے واحد شاعر تھے کہ جو ادب اور فلم دونوں میں ممتاز مقام بنائے رکھنے میں کامیاب رہے۔ ترقی پسند شعرا میں فیض احمد فیض کے بعد صرف ساحر ہی نے متاثر کیا تھا ویسے مخدوم محی الدین علی سردار جعفری اور دوسرے کئی شعرا بھی فیض اور ساحر کی صف میں آتے ہیں لیکن ہند و پاک کے تمام ترقی پسند شعرا میں ساحر کو ایک ممتاز و منفرد مقام حاصل ہے۔ فلمی دنیا میں بھی ساحر کو جو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی بھی دوسرے ترقی پسند یا رومانی شاعر کو حاصل نہیں ہو سکی۔ ساحر لدھیانوی کے انتقال کو پورے دس سال بیت چکے ہیں لیکن انہوں نے ادب اور فلمی دنیا میں ایسے گہرے نقوش چھوڑے ہیں کہ جو ہمیشہ باقی رہیں گے۔ ساحر لدھیانوی کی دسویں برسی کے موقع پر روزنامہ سلطان نے اس عظیم فنکار کی یاد تازہ رکھنے کے لئے ڈاکٹر صبغت اللہ لکچرار گورنمنٹ آرٹس کالج ٹمکور سے ساحر لدھیانوی کی شخصیت اور فن پر ایک مکمل اور جامع مضمون لکھوایا لیکن ایک روزنامہ اخبار کی گنجائش کے پیش نظر ہم یہ مضمون تین حصوں میں شائع کریں گے۔

ڈاکٹر صبغت اللہ نے بھی اپنے اس مضمون کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) ساحر کی شخصیت (۲) ساحر بحیثیت ادبی شاعر اور (۳) ساحر بحیثیت فلمی شاعر۔

ادارہ :

آج سے تقریباً نصف صدی قبل عبدالحی نامی ایک ۲۰ سالہ نوجوان اپنے آپ کو ایک اردو شاعر کہتا ہوا صبح ۱۰-۱۱ بجے سے رات کے دو ڈھائی بجے تک شہر لاہور کی دھوپ میں آوارہ پھرتا دکھائی دیتا۔ اس نوجوان کا قد تقریباً ۶ فٹ۔ دبلا پتلا چھریرا بدن۔ ٹانگیں لمبی لمبی۔ سر کے لمبے سیدھے بال۔ سانولا چہرہ چیچک کے داغوں سے بھرا درمیان ایک لمبی ستواں ناک اور دو خوبصورت بڑی بڑی آنکھیں۔ یہ لاابالی نوجوان کسی کالج کا طالب علم معلوم ہوتا تھا۔

ساحر کا معمول تھا کہ صبح کے دس گیارہ بجے سے پہلے نہیں اٹھا کرتے تھے حسب معمول اپنے لئے خود ہی چلبی بناتے۔ لمبے لمبے پیچھے کو پلٹنے والے بال بکھرائے۔ بڑی بڑی سرخ آنکھوں سے کسی بھی نقطے پر مسمریزم کی سی ٹکٹکی باندھے بیٹھے۔ ایک طویل وقفے کے بعد اچانک چیخ اٹھتے۔ "چائے" اور صبح کی اس آواز کے بعد دن بھر اور موقع ملے تو رات بھر وہ لگاتار بولنے کے عادی تھے۔ آدھے گھنٹے سے زیادہ کسی ایک جگہ پر ٹک کر بیٹھنا ان کی عادت نہیں تھی۔ دوستوں۔ ملاقاتیوں کا مجمع ان کے لئے نعمت خداوندی تھی۔ وہ ان سب کو سگریٹ پر سگریٹ پیش کرتے (خود سگریٹ کے دو ٹکڑے کر کے پیتے تاکہ کم خراب ہو۔ لیکن اکثر دونوں ٹکڑے ایک ساتھ پی جاتے) چائے کے پیالوں کے پیالے دوستوں کے حلق میں انڈیلتے (خود بھی دو چار پیالے چڑھا لیا کرتے) اور اسی دوران اپنی نظموں۔ غزلوں کے علاوہ دوسرے شعراء کے سینکڑوں اشعار جو اپنی نظموں اور غزلوں کی زبانی یاد ہوتے بڑی دلچسپ جھپیے کے ساتھ سناتے چلے جاتے۔ صرف اپنی نظمیں غزلیں اور دوسرے شعراء کی تخلیقات ہی نہیں اپنی زندگی کا ہر چھوٹا بڑا واقعہ انہیں یاد تھا۔ دوستوں اور اخبار۔ رسالوں کے مدیروں کے پورے کے پورے خطوط یاد تھے ان کی شاعری کی حمایت یا موافقت میں لکھی گئی ہر ہر سطر یاد تھی یہاں تک کہ بچپن میں دیکھی ہوئی میاں تھیٹر کی اندر سبھا اور شاہ بہرام نامی فلموں کے پورے کے پورے مکالمے یاد تھے

رات کے دس گیارہ بارہ یا ایک بجے جب دوست ملاقاتی وغیرہ دوسرے دن ملنے کا وعدہ کر کے ان کا ساتھ چھوڑ جاتے تو انہیں بڑی تلخ قسم کی تنہائی کا احساس ہونے لگتا اور ان کے اندر لاابالی پن کے جراثیم داخل ہو جاتے دن بھر کا ہنس مکھ چہرا کملا جاتا اور سادہ فطرت ساحر اچانک بدل جاتے اور دن بھر کی باتوں کو دہرا دہرا کر وہ اپنے احباب کی حماقتوں اور غلط اداؤں پر طنز کے تیر برساتے کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ۔ کہہ کر مذاق اڑاتے اور طے کر لیتے کہ آئندہ وہ ایسے دوستوں پر اپنا روپیہ اور وقت برباد نہیں کریں گے لیکن دوسرے ہی دن جب ان دوست یاروں پر نظر پڑتی لپک کر بانہوں میں بھر لیتے۔ چائے کے بجائے وسکی پلاتے اور ڈٹ کر کھانا کھلاتے ان کی خود پسندوں اور خوش نصیبوں کی تعریف کرکے آپ ہی آپ ایک سوالیہ نشان بن جاتے۔ ذرا سی بات پر اکتا جانا۔ شرما جانا۔ گھبرا جانا ان کی فطرت تھی۔ جہاں فیصلہ کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے زندگی کے اہم مسائل تو در کنار وہ کسی معاصرے میں نظم یا غزل سنانے سے پہلے بھی یہ فیصلہ نہیں کر پاتے کہ اس وقت کیا چیز سنانی ہے۔ یہاں تک کہ کسی چمن کے ساتھ کس قسمیں کو پہننا ناشتے میں پراٹھے اور آملیٹ کھائے یا توس اور مکھن۔ ان کو اپنے پاس بیٹھے کسی مستقل یا عارضی دوست کی مدد درکار ہوتی۔ ساحر کی ان عادتوں یا اداؤں کو تضحیک سمجھ کر ان کے ایک دوست پرکاش پنڈت ان سے پرانا پسندیدہ مذاق کر بیٹھے لباس کے بارے میں ان سے رائے لی جاتی تو بڑی سنجیدگی سے کریم جھاٹ کر اچھا خاصا کارٹون بنا دیتے۔ ناشتے میں کئی بار انہیں کریم تک کھلا ڈالی۔ لیکن رفتہ رفتہ ان پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ وہ مذاق کے نہیں ہمدردی کے مستحق ہیں اور یہ سب عادتیں انہوں نے خود نہیں ڈالیں بلکہ ایک خود رو پودے کی طرح خود بخود اُگی تھیں اور اس کی جڑیں ساحر کے ان ناساز گار حالات میں تھیں جس میں انہوں نے آنکھیں کھولیں پروان چڑھے اور جوان ہوئے یہی خوبیاں اور خامیاں تھیں ان کی شخصیت کا جزو بن گئیں۔

عبدالحی ساحر ۸ مارچ ۱۹۲۱ میں لدھیانہ کے ایک جاگیردار گھرانے میں پیدا ہوئے ان کے والد کی ۱۰ بیویوں میں سے کسی کی اولاد نہ تھی گیارھویں بیوی کی اکلوتی اولاد ساحر تھے۔ ظاہر ہے اکلوتی اولاد اور وہ بھی ایک جاگیردار کا بیٹا ہونے کے سبب ساحر کی پرورش بڑے لاڈ و پیار سے ہوئی حد سے زیادہ پیار نے انہیں ہر جائز اور ناجائز طور طریقے اپنانے پر مجبور کئے۔ زندگی کا عیش و آرام فطری طور پر ان میں رچ بس گیا۔ مگر ابھی وہ کم عمری ہی میں تھے کہ ان کی زندگی کے خوشحال دروازے اچانک ان پر بند ہو گئے۔

شوہر کی عیاشیوں سے تنگ آ کر ساحر کی والدہ نے قانوناً ان سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور عدالت میں ساحر نے ماں کو اپنے باپ پر ترجیح دی اسی لئے انہیں جائیداد سے محروم ہونا پڑا۔ اس طرح ساحر کی زندگی میں مفلسیوں اور مایوسیوں کے دور کا آغاز کیا۔ عیش و آرام کی زندگی چھن جانے کا ملال تو تھا لیکن نوبت یہاں تک پہنچی کہ والدہ کے ساتھ رہنے کی حسرت باقی رہی۔ مقدمہ ہارنے پر والد نے یہ دھمکی دی تھی کہ ساحر کو مار ڈالیں گے یا کم از کم اس کی ماں کے پاس رہنے نہ دیں گے۔ اسی لئے ماں نے ساحر کے تحفظ کے لئے کچھ محافظ متعین کر دئے جو ایک لمحہ کے لئے بھی انہیں تنہا نہیں چھوڑتے تھے۔ اس طرح ساحر کے دل میں نفرت کے جذبے کے ساتھ ساتھ ایک عجیب قسم کا خوف بھی پنپتا رہا۔ نتیجتاً وہ ذہنی الجھنوں میں مبتلا ہو گئے۔ انہوں نے محبت کی۔ لیکن غربت کم حوصلگی اور سماجی بندشوں کے سبب وہ ناکام رہے۔ پھر اپنی خواہش فطرت کے خلاف اپنا اور اپنی والدہ کا پیٹ پالنے کے لئے چھوٹی موٹی نوکریاں بھی کر لیں۔ زمانے کی مشکلوں سے سسک کر سنگ کر دنوں کو دھکے دیتے رہے۔ قدم قدم پر تلخیوں اور الجھنوں میں جنگ ہوتی رہی۔ جنگ عقل اور جذبے میں بھی ہوتی اور زندگی اور موت میں بھی اور یہی وہ جنگ تھی جس نے انہیں ایک معمولی شخص سے ساحر بنا دیا اور ان کے دل و دماغ کی ساری تلخیاں شعروں کا لباس پہن کر باہر نکل پڑیں۔

باقی آئندہ

28-10-1990 The daily Sultan-Bangalore - P II

ساحر لدھیانوی شخصیت و فن

ڈاکٹر محمد صبغت اللہ
گورنمنٹ آرٹس کالج، ٹمکور۔

ساحر لدھیانوی برصغیر ہند و پاک کے واحد شاعر تھے کہ جو ادب اور فلم دونوں میں ممتاز مقام بنائے رکھنے میں کامیاب رہے۔ ترقی پسند شعرا میں فیض احمد فیض کے بعد صرف ساحر ہی نے متاثر کیا تھا۔ ویسے مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری اور دوسرے کئی شعرا بھی فیض اور ساحر کی صف میں آتے ہیں۔ لیکن ہند و پاک کے تمام ترقی پسند شعرا میں ساحر کو ایک ممتاز و منفرد مقام حاصل ہے۔ فلمی دنیا میں بھی ساحر کو جو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی بھی دوسرے ترقی پسند یا رومانی شاعر کو حاصل نہیں ہو سکی۔ ساحر لدھیانوی کے انتقال کو پورے دس سال بیت چکے ہیں۔ لیکن انہوں نے ادب اور فلمی دنیا میں ایسے گہرے نقوش چھوڑے ہیں کہ جو ہمیشہ باقی رہیں گے۔ ساحر لدھیانوی کی دسویں برسی کے موقع پر روزنامہ سلطان نے اس عظیم فنکار کی یاد تازہ رکھنے کے لئے ڈاکٹر صبغت اللہ لکچرار گورنمنٹ آرٹس کالج ٹمکور سے ساحر لدھیانوی کی شخصیت اور فن پر ایک مکمل اور جامع مضمون لکھوایا لیکن ایک روزنامہ اخبار کی گنجائش کے پیش نظر ہم یہ مضمون تین حصوں میں شائع کریں گے۔
ڈاکٹر صبغت اللہ نے بھی اپنے اس مضمون کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ (۱) ساحر کی شخصیت (۲) ساحر بحیثیت ادبی شاعر اور (۳) ساحر بحیثیت فلمی شاعر۔
آج اس مضمون کی دوسری قسط پیش کی جا رہی ہے۔ ادارہ

بحیثیت شاعر اس وقت آنکھ کھولی جبکہ اردو دنیا میں
...ش، جگر اور فراق کے بعد فیض اور مجاز کا طوطی بول
...را ایسے دور میں ایک نیا شاعر ان قادر الکلام شعراء سے
...ے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس نے ساحر پر مجاز اور فیض کا
...بلکہ شروع شروع میں لوگوں کو ان کی شاعری پر فیض
کا گمان ہوا۔ وہی نرم و نازک لہجہ، الفاظ کی وہی حسین
...اس اور خواب میں ڈوبی ہوئی فضا (آواز آدم، ہر اس
...)۔ ان کے علاوہ بھی ساحر نے اپنے دور کے کئی اور
اثر پذیری حاصل کی ہے جیسے سلام مچھلی شہری (مادام،
...شہر کار، ایک تصویر رنگ) مجاز (نذر کالج علیگڑھ،
...، طلوع اشتراکیت) جان نثار اختر (مجھے سوچنے دو سوچتا
...سردار جعفری (آج مطابقت) اختر شیرانی (متاع غیر
...واقعہ) کیفی (یہ کس کا لہو ہے، پھر وہی کنج قفس)
...بلاوا) اس وسیع اثر پذیری کے علاوہ بھی ساحر کا اپنا
...رنگ و لہجہ ہے۔ اور اسی میں وہ نہایت کامیاب رہے
...منفرد لہجہ تاج محل، کبھی کبھی، میرے عہد کے حسینو،
...ت تمہارے ہیں۔ خوبصورت موڑ، پرچھائیاں اور فنکار
...ے علاوہ چند غزلیں بھی ہیں) جن میں ساحر کی انفرادیت

...ر کی نظموں میں ترتیب و تشکیل کا ایک تیکھا انداز ہے۔
اس نظم میں تقریباً یکساں مضامین یا ایسے ہی ملتے جلتے
بند میں دہرائے گئے ہیں آخری تین بند عمل کے مختلف
کے مرقعوں کو پیش کرتے ہیں۔ سینوں کی جانب بڑھتے
...۔ زینوں کی جانب لپکتے ہوئے پاؤں، اجلے دریچوں میں
...ن چمن، تنفس کی الجھن، مدقوق چہرے اور ڈھلکے
...بتر کرنے کے بعد

یہاں پیر بھی آ چکے ہیں، جواں بھی
تنو مند بیٹے بھی، ابا میاں بھی
یہ بیوی بھی ہے اور بہن بھی ہے ماں بھی
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟
مدد چاہتی ہے یہ حوا کی بیٹی
یشودھا کی ہم جنس رادھا کی بیٹی
پیمبر کی امت، زلیخا کی بیٹی
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟
ذرا ملک کے رہبروں کو بلاؤ
یہ گلیاں، یہ کوچے، یہ منظر دکھاؤ
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کو لاؤ
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

...یہ للکار پر ختم ہوتے ہیں۔
...ن دوسری قسم کی نظموں میں جو بہت زیادہ گھٹی ہوئی
...ر مربوط تھیں جیسے "کبھی کبھی" جتنی مرتب اور مربوط
...اردو شاعری میں کم ہیں۔ ہر مصرعہ اور ہر بند سلسلہ بہ سلسلہ

مضمحل خواب کی تعبیر بتا دے مجھ کو
تیرے دامن میں گلستاں بھی ہیں ویرانے بھی
مرا حاصل مری تقدیر بتا دے مجھ کو
(متاع غیر)

اور اگر ممکن ہوتا تو وہ زندگی بھر اسی طرح اپنی محبوبہ سے سوالات کرتا رہتا اور مناسب جواب نہ ملنے پر مایوسی اور رحم و کرم کے گیت اور گھلاوٹ سائے سے پناہ لیتا ہے اور عورت کی محبت تک ہی محدود ہو کر رہ جاتی۔ بار بار سوال کرنے پر بھی جب کوئی صاف اور دوٹوک جواب نہ ملا بلکہ ہر جواب نئے سوال کی شکل میں سامنے آنے لگا تو اس تکرار سے گھبرا کر وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اور اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ایسا نہیں ہونا چاہئے اس طرح اس کا ذاتی عشق مختلف مراحل طے کرتا ہوا بالآخر اس منزل پر پہنچ ہی گیا جہاں ذاتی عشق و محبت اجتماعی عشق و محبت میں بدل جاتا ہے اور شاعر اپنی محبوبہ کا ہی نہیں سارے بنی نوع انسان کا عاشق بن جاتا ہے۔
تم کو خبر نہیں مگر اک سادہ لوح کو برباد کر دیا ترے دو دن کے پیار نے یہ کہتے کہتے اپنی محبوبہ سے دبی آواز میں کہتا ہے۔

میں اور تم سے ترک محبت کی آرزو
دیوانہ کر دیا ہے غم روزگار نے

پھر بڑے واضح الفاظ میں یوں کہتا ہے۔
تمہارے غم کے سوا اور بھی تو غم ہیں مجھے

ساحر کو فن مصوری سے زیادہ سنگ تراشی اور صورت گری سے قریب کر دیتی ہے۔

جواں رات کے سینے پہ دودھیا آنچل
مچل رہا ہے کسی خواب مرمریں کی طرح
حسین پھول، حسین پتیاں، حسین شاخیں
لچک رہی ہیں کسی جسم نازنیں کی طرح
اجنبی بانہوں کے حلقے میں لچکتی ہوں گی
تیرے جھکتے ہوئے بالوں کی ادائیں اب تک
تمہارا جسم ہر اک لہر کے جھکولے سے
مری کھلی ہوئی بانہوں میں جھول جاتا ہے
حسین شبنم آلود پگڈنڈیوں سے
لپٹنے لگے سبز پیڑوں کے سائے

ان میں ساکت منظر نگاری نہیں ہے بلکہ حرکت سے بھرپور اور رفتار اور عمل سے معمور تصویریں ہیں جو قاری کے تجربے کا حصہ بن جاتی ہیں حرکت کا احساس پیدا کر دیتی ہیں۔
ساحر کی شاعری میں مرقع سازی یعنی عمل اور حرکت کافی ہے اس کی مثالیں "ایک منظر، ایک واقعہ" "کسی کو اداس دیکھ کر" "صبح نوروز" اور خاص کر بیشتر نظموں میں مل جاتی ہیں۔ متحرک مرقعوں کو پیش کرنا صرف ساحر کا امتیاز رہا ہے۔
مثلاً پرچھائیاں کو لیجئے اس میں دونوں مرئی تصویریں کس طرح ایک دوسرے کے مد مقابل ہوتی ہیں۔

تم آ رہی ہو زمانے کی آنکھ سے بچ کر

ایسے اچھے کھیتوں میں رنگین آنچل لہرائیں گے
یہاں پر یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ ساحر نے جس طرح دیہات کی زندگی کو جس حسن و کیفیت کے ساتھ پیش کیا اردو شاعری میں اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔

چرواہے بنسی کی دھن سے گیت ہوتے ہیں
آموں کے جھنڈوں میں پھر بھی دل کھوتے ہیں
پینگ بڑھاتی گوری کے ماتھے سے کوندے لپکتے ہیں
جوہڑ کے ٹھہرے پانی میں تارے آنکھ جھپکتے ہیں
ندی کے ساحر پر ملاح گیت گاتے ہیں
بستی پر بادل چھائے ہیں پر یہ بستی کس کی ہے
دھرتی پر امرت برسے گا لیکن دھرتی کس کی ہے

ہل جوتے گی کھیتوں میں البیلی دہقانوں کی
دھرتی سے پھوٹے گی محنت فاقہ کش انسانوں کی
فصلیں کاٹ کے محنت کش غلے کے ڈھیر لگائیں گے
جاگیروں کے مالک آ کر سب پونجی لے جائیں گے
آج بھی بادل چھائے ہیں
آج بھی بوندیں برسیں گی
اور کوئی اس سوچ میں ہے

ساحر تصورات کو صورت حال میں تبدیل کرنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ ساحر ایسے بھرپور لمحات کو ڈرامائی صورت میں منتقل کرتے ہیں۔ مثلاً آزادی کے بعد کے فسادات کی لہر سے متاثر ہو کر وہ ایک منفی کی صورت گری کرتے ہیں جو قوم کے فرزندوں سے اپنے نغموں کی جھولی پھیلائے اپنا ہنر، اپنی لے، اپنے سر اور اپنی لے کی بھیک مانگتا ہے، اسی طرح دوسری جنگ عظیم کے آغاز میں جرمنی اور انگلستان میں لڑائی چھڑی تو ساحر نے اسے ایک قمار خانے میں دو جواریوں کے جھگڑے سے تعبیر کر کے ان جواریوں کے استبداد کے شکار عوام سے براہ راست خطاب کا وسیلہ اختیار کیا۔

مسکرائے زمیں تیرہ و تار
سر اٹھائے دبی ہوئی مخلوق
دیکھ وہ مغربی افق کے قریب
آندھیاں پیچ و تاب کھانے لگیں
اور پرانے قمار خانے میں
کہنہ شاطر بہم الجھنے لگے
کوئی تیری طرف نہیں نگراں
یہ گراں بار سرد زنجیریں
آج موقع ہے ٹوٹ سکتی ہیں
(محو غنیمت)

قومی آزادی کی لڑائی ہو یا مخبری بڑے کی بغاوت، فرقہ وارانہ فسادات کی قیامت خیزی ہو یا جنگ کی تباہ خیزی، ہند و پاک لڑائی کی لعنتیں ہوں یا بین الاقوامی سطح پر لوٹنا جیسے عوام

ں ہے اور پوری ہم ایک دائرے میں اداس جاتی ہے۔ آخری مصرعہ سے اسی طرح ہم آواز جیسے دائرہ نظم کے کے بعد پھر سے شروع ہو رہا ہو اور پوری زندگی اسی دائرے میں گردش کر رہی ہو۔

کے کچھ ذاتی تجربات بھی تھے اور سرمایہ دارانہ نظام اور رانہ طبقے کے خلاف (جس میں خود ان کے والد اور پ بھی شامل ہے) نفرت اور بغاوت کا ایک سیلاب امنڈ کو دنیاوی رنج و غم میں تپ کر نکلے ہوئے شعور نے اور یہ راستہ ان کا اپنا منفرد راستہ تھا جس میں ساحر حالات و تجربات تھے اور وہی ان سے یہ کہلوا سکتے ہیں۔

میں ان اجداد کا بیٹا ہوں جنہوں نے پیہم
اجنبی قوم کے سائے کی حمایت کی ہے
غدر کی ساعت ناپاک سے لیکر اب تک
ہر کڑے وقت میں سرکار کی خدمت کی ہے
(جاگیر)

کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے
کہ زندگی تری زلفوں کی نرم چھاؤں میں
گزرنے پاتی تو شاداب ہو بھی سکتی تھی
یہ تیرگی جو مری زیست کا مقدر ہے
تری نظر کی شعاعوں میں کھو بھی سکتی تھی

مگر یہ ہو نہ سکا اور اب یہ عالم ہے

نہ کوئی جادہ، نہ منزل، نہ روشنی نہ سراغ
بھٹک رہی ہے خلاؤں میں زندگی میری
انہیں خلاؤں میں رہ جاؤں گا کبھی کھو کر
میں جانتا ہوں مری ہم نفس مگر پھر بھی
کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے

وہ تجربے اور تجزیے تھے جس سے ساحر نے اپنے ہم عصر ں ایک الگ اور بلند مقام بنایا اس کا بنیادی سبب یہ ہے یوں اور تجربوں کو فنکارانہ حسن کے ساتھ بغیر کسی کے جوں کا توں پیش کرتا ہے۔ ان اشعار میں محبت و غم کے ساتھ جو تلخی اور زہر نظر آتا ہے وہ ادھار کا ۔ بلکہ اپنی زندگی کی صدائے بازگشت ہے۔

حر بنیادی طور پر ایک رومانی شاعر ہے۔ ناکامئ محبت نے ماغ پر اتنی شدید ضرب لگائی کہ زندگی کے دوسرے آلام یسے راستوں میں وہ خود ہی مایوس ہو دیکھ کر وہ سرد میں اپنی محبوبہ کو یاد کرنے کے سوا اس کو کچھ سوجھتا ۔ ہر وقت اپنی محبوبہ کی جھکی ہوئی پلکوں کا سایہ محسوس ۔ اور وہ تڑپ کر اس سے پوچھتا ہے۔

مرے خوابوں کے جھروکوں کو سجانے والی
تیرے خوابوں میں کہیں میرا گزر ہے کہ نہیں
پوچھ کر اپنی نگاہوں سے بتا دے مجھ کو
مری راتوں کے مقدر میں سحر ہے کہ نہیں

اور

مری درماندہ جوانی کی تمناؤں کے
نجات جن سے میں اک لحظہ پا نہیں سکتا
یہ اونچے اونچے مکانوں کی ڈیوڑھیوں کے تلے
ہر ایک گام پہ بھوکے بھکاریوں کی صدا
یہ کارخانوں میں لوہے کا شور و غل جس میں
ہے دفن لاکھوں غریبوں کی روح کا نغمہ
گلی گلی میں یہ بکتے ہوئے جواں چہرے
حسین آنکھوں میں افسردگی سی چھائی ہوئی
یہ شعلہ بار فضائیں یہ پرے دیش کے لوگ
خریدی جاتی ہیں اٹھتی جوانیاں جن کی
یہ غم بہت تھے مری زندگی مٹانے کو
اداس رہ کے مرے دل کو اور رنج نہ دو
تمہارے غم کے سوا اور بھی غم ہیں مجھے

بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ ساحر کی زخم خوردہ روح نے جس قدر اسے تڑپایا اور کرب و بلا میں مبتلا کیا اور رکھا اس کے اندر اسی قدر غموں سے لڑنے اور ان پر فتح پانے اور انہیں مسرتوں میں بدلنے کی ضد سی پیدا ہوتی گئی اور اسی ضد نے ان تمام موضوعات کو گرفت میں لینے کی کوشش کی جو اس کے اور اس صدی کے سامنے ہیں۔ زندگی بھر خود کو شاعر منوانے کی کوشش کرنے والا ساحر آج اس بات پر کیوں مصر ہے کہ لوگ اسے فنکار مانیں جب وہ عہد کرتا ہے۔

آج سے اے مزدور کسانو! میرے راگ تمہارے ہیں
فاقہ کش انسانو! میرے جوگ بہاگ تمہارے ہیں

اور

آج سے میرے فن کا مقصد زنجیریں پگھلانا ہے
آج سے شبنم کے بدلے انگارے برساؤں گا

تو شک ہونے لگتا ہے کہ کیا واقعی ساحر ایک ایسا کڑا عہد کر رہا ہے اور کیا وہ اس فیصلے پر مستقل مزاجی کے ساتھ قائم رہ سکے گا؟ کیا واقعی اب وہ کبھی ایسے گیت نہیں گائے گا جن میں

——— امید بھی تھی، بیسائی بھی
موت کے قدموں کی آہٹ بھی، جیون کی انگڑائی بھی
مستقبل کی کرنیں بھی تھیں حال کی بوجھل ظلمت بھی
طوفانوں کا شور بھی تھا اور خوابوں کی شہنائی بھی

اور خوش قسمتی سے ساحر اردو غزل کا روایتی معشوق ثابت ہوتا ہے اور اپنے وعدے سے پھر جاتا ہے۔ اسے احساس ہو جاتا ہے کہ اس کا کام پرچم لہرانا نہیں بربط پر گانا ہے

تم سے قوت لیکر اب میں تم کو راہ دکھاؤں گا
تم پرچم لہرانا ساتھی میں بربط پر گاؤں گا

ساحر نے اپنے حدود میں رہ کر صحت مند کیفیت پسند اور ترقی پسند ادب کی تخلیق کی ہے اور بحیثیت مجموعی انہیں وہی دیا جو تجربات و حوادث کی شکل میں دنیا نے اسے دیا تھا۔ ساحر کی سب سے چونکا دینے والی خصوصیت منظر نامے ہیں۔ یہ ان شاعروں میں ہیں جو تمثال پر تمثال اور تصویر پر تصویر مرتب سجاتے ہیں اور ان معنوں میں ساحر کو سب سے بڑا امیجسٹ شاعر کہا جا سکتا ہے۔ ساحر کے سوچ کا انداز تصویروں کا روپ تھی۔ غیر مرئی تصورات کو بھی لمس اور حسیت کی لذت عطا کرنا اور تجسیم کی صورت عطا کرنا انہیں کا فن تھا۔ لمس کی یہ لذت، تجسیم کی صورت گری

خود اپنے قدموں کی آہٹ سے جھینپتی ڈرتی
خود اپنے سائے کی جنبش سے خوف کھاتے ہوئے

تم آ رہی ہو سرِ عام بال بکھرائے
ہزار گونہ ملامت کا بار اٹھائے ہوئے
ہوس پرست نگاہوں کی چیرہ دستی سے
بدن کی جھینپتی عریانیاں چھپائے ہوئے

اسی طرح "تاج محل" کی بنیادی آویزش شہنشاہ اور تاج محل بنانے والے معماروں کے درمیان۔ شہنشاہ نے دولت کا سہارا لیکر مزدوروں کی محنت کو خرید سکا اور اس کے ذریعہ اپنی محبوبہ کی یادگار بنانے میں کامیاب ہوا۔ یہی صورت "وہ آج" "وہ کل اور آج" "وہ طلوع اشتراکیت" میں بھی ملتی ہے۔ دیکھئے "وہ آج" میں ساحر نے صورت حال کو کس طرح تصویر کی شکل دی ہے۔ اور یہی وہ ترتیب تھی جس نے اردو نظم کو ارتقا اور تنظیم کی ایک نئی جہت دی۔ غیر دلچسپ مضامین اور مناظر کو وہ اپنی صورت گری سے انتہائی دلاویز اور پرکشش بنا دیتے ہیں۔ "وہ کل اور آج" کی دو تصویریں دیکھئے۔

کل بھی بوندیں برسی تھیں
کل بھی بادل چھائے تھے
اور کوی نے سوچا تھا
بادل یہ آکاش کے سپنے ان زلفوں کے سائے میں
دوش ہوا پر مے خانے ہی مے خانے گھر آئے ہیں
رت بدلے گی، پھول کھلیں گے، جھونکے مدھ برسائیں گے

دوست رہ نماؤں کی شہادت، اردو کے ساتھ بے انصافی ہو یہ مزدور کسانوں کا استحصال ساحر کی آواز تھر بار رہی ہے۔ اور یہی ہم آہنگی انکی شاعری میں توانائی، سرمستی اور نغمگی بن کر ابھری اس کی واضح مثال "وہ تاج محل اور نور جہاں کے مزار پر" ہے

خطابت، ڈرامائیت اور تجسیمی محاکات سے کام لیکر تصورات کو حرکت اور عمل سے صورت حال میں ڈھال کر ایک تجربہ بنا دینا ساحر کا فن ہے۔ وہ غیر ضروری وضاحت سے دامن بچا کر یہ سب کچھ کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تصورات کو لمس اور حسیت کی لذت دیکر تجسیم کی صورت بخش دیتے اور شاید فلموں میں ان کی کامیابی کی بہت بڑی وجہ تھی اس کی ایک مثال پرچھائیاں ہے جو فلمی ڈھنگ کے مختلف مناظر سے معمور ہے اور اس اعتبار سے شاید اس تکنیک کی سب سے کامیاب نظم ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن اس بارے میں یوں رقم طراز ہیں۔ "وہ درمیانی کڑیوں کو چھوڑ کر موثر بلاغت کے ساتھ کسی ایک ڈرامائی موڑ کو بیان کر دینا بھی ساحر کی تکنیک کی خصوصیت ہے۔ وہ بیانیہ کم ہوتا ہے۔ صرف چند لکیروں سے تصویر مکمل کر لیتے ہیں۔ مگر فلمی سوں ٹاک کے طرز پر بکھری تصویروں میں سوچنا اور محسوس کرنا صرف ساحر کا کام تھا۔ جس کی مثال اردو شاعری میں کمیاب ہے ۔ اسی لئے ایک تفکر گر مرقع ساز شاعر کو فلمی دنیا میں اتنی کامیابی ملی اور اس لئے وہ پڑھنے والوں کے دلوں کو اس طرح چھوتا ہے کہ ان کی حیات کا حصہ بن جاتا ہے۔ ساحر اردو میں ڈرامائی لمحوں کا تنہا شاعر ہے۔"

(ساحر لدھیانوی — از محمد حسن)

باقی اگلے ہفتے

مادھوری نئے لباس میں

مادھوری فلمی دنیا میں اپنا ایک مقام ایک امیج رکھتی ہے ۔ اور فلمی پرستار اپنے محبوب اداکاروں کو ان کے مخصوص انداز ہی میں دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ ہر اداکار خواہ بڑا ہو یا چھوٹا اپنا امیج بدلنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اگر کرتا ہے تو اس کو ناکامی کا اندیشہ لگا رہتا ہے۔ امیتابھ بچن نے اپنی حالیہ فلم "میں آزاد ہوں" میں اپنا امیج بدلنے کی پہلی سنجیدہ کوشش کی تھی۔ پرستاروں نے امیتابھ بچن کے اس نئے امیج کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ نتیجے میں "میں آزاد ہوں" بری طرح فلاپ ہوئی۔ لوگ امیتابھ بچن کو اس کے اینگری ینگ مین رول ہی میں دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ مادھوری نے بھی فلموں میں اپنے امیج کو بدلنے کی کوشش کی تھی اس تصویر میں بھی اس نے اپنے فلمی امیج کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک نیا روپ دھارا ہے۔ مادھوری کو اس تصویر میں آپ ایک عام کسان کے ساتھ بالکل نئے لباس میں دیکھ سکتے ہیں۔

4-11-1990 The Daily Sultan - Bangalore - P 111

ساحر لدھیانوی شخصیت و فن

ڈاکٹر محمد صبغت اللہ،
گورنمنٹ آرٹس کالج، ہٹکور۔

ساحر لدھیانوی

ساحر لدھیانوی برصغیر ہند و پاک کے واحد شاعر تھے کہ جو ادب اور فلم دونوں میں ممتاز مقام بنائے رکھنے میں کامیاب رہے۔ ترقی پسند شعرا میں فیض احمد فیض کے بعد صرف ساحر ہی نے متاثر کیا تھا۔ ویسے مخدوم محی الدین علی سردار جعفری اور دوسرے کئی شعرا بھی فیض اور ساحر کی صف میں آتے ہیں لیکن ہند و پاک کے تمام ترقی پسند شعرا میں ساحر کو ایک ممتاز و منفرد مقام حاصل ہے۔ فلمی دنیا میں بھی ساحر کو جو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی بھی دوسرے ترقی پسند یا رومانی شاعر کو حاصل نہیں ہو سکی۔ ساحر لدھیانوی کے انتقال کو پورے دس سال بیت چکے ہیں لیکن انہوں نے ادب اور فلمی دنیا میں ایسے گہرے نقوش چھوڑے ہیں کہ جو مدتوں باقی رہیں گے۔ ساحر لدھیانوی کی دسویں برسی کے موقع پر روزنامہ سلطان نے اس عظیم فنکار کی یاد تازہ رکھنے کے لئے ڈاکٹر صبغت اللہ لکچرار گورنمنٹ آرٹس کالج ہٹکور سے ساحر لدھیانوی کی شخصیت اور فن پر ایک مکمل اور جامع مضمون لکھوایا لیکن ایک روزنامہ اخبار کی گنجائش کے پیش نظر ہم مضمون تین حصوں میں شائع کریں گے۔ ڈاکٹر صبغت اللہ نے بھی اپنے اس مضمون کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) ساحر کی شخصیت (۲) ساحر بحیثیت ادبی شاعر اور (۳) ساحر بحیثیت فلمی شاعر۔

یہ مضمون کی آخری قسط ہے۔

ادارہ

ساحر بحیثیت فلمی نغمہ نگار

ایک ادبی شاعر کو جب فلم سے منسلک ہونا پڑتا ہے جیسا کہ بہت سے شعراء کے ساتھ ہوتا آیا ہے اور ایسا آئندہ بھی ہوگا۔ جیسے مجروح سلطان پوری، شکیل بدایونی، جان نثار اختر، شہریار وغیرہ ان میں ساحر بھی ایک ہیں۔ اور اگر دیکھا جائے تو ایک حقیقت ہے کہ فلم عہد و دور کا سب سے مؤثر اور بہت ہی کارگر حربہ ہے۔ اگر ہمارے فلم پروڈیوسرس اس حربہ کو تعمیری اور تعلیمی مقاصد کے لئے استعمال کریں تو اس میں کوئی شک نہیں کہ عوامی شعور کی نشو و نما اور سماجی ترقی کی رفتار میں تیزی لائی جاسکتی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس پہلو پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ کیوں؟ اس لئے کہ یہ شعبہ ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جو ذاتی مفاد پر زیادہ توجہ دیتے ہیں اور سماجی خدمت پر کم۔ یہی وہ بنیادی سبب ہے جس کی وجہ سے فلمی کہانی، دھن اور گانے اپنے معیار میں کافی پست ہوتے ہیں اور ادبی حلقے اس فلمی ادب کو اس وجہ سے نفرت اور حقارت سے دیکھتے رہے ہیں۔

ایک ادیب، شاعر اور موسیقار کو جب فلم سے وابستہ ہونا پڑتا ہے تو سب سے پہلے اس کی آزادیٔ تخلیق سلب ہو جاتی ہے۔ ہر حال میں فلم کی مطابقت پر انہیں اپنے ادب کی تخلیق کرنی پڑتی ہے اور خاص کر شاعر کو، کرداروں کی مناسبت اور فلم کے حالات کو مدنظر رکھ کر اپنی شاعری کرنی پڑتی ہے یا دوسرے الفاظ میں فلمی گیت لکھنے پڑتے ہیں اس کا بنیادی سبب صرف فلم کے مجموعی تاثر میں اضافہ کرنا ہوتا ہے۔

فلمی گیت ادبی شاعری سے مختلف ہوتا ہے۔ یہ کام کافی مشکل ہوتا ہے کیونکہ فلم کے کرداروں کے لئے لکھے ہوتے ہیں اور وہ بھی بنی بنائی طرزوں پر لکھے جاتے ہیں۔ اسی لئے شاعر کو اکثر اوقات شاعری کے مقررہ اصولوں سے منحرف بھی ہونا پڑتا ہے۔ ساتھ ہی الفاظ کے انتخاب میں شاعر کو اس بات کا دھیان رکھنا پڑتا ہے کہ ملک کے کونے کونے میں بسنے والے لوگوں کا جن کی مادری زبان اردو یا ہندی نہیں ہے وہ بھی ان گیتوں کو سمجھ سکیں۔

اتنی ساری پابندیوں کے ساتھ جو ادب تخلیق ہوگا ظاہر ہے اس میں فنی بلندی نہیں پائی جاتی جس کو ہم ادب عالیہ کا حصہ کہہ سکیں۔ پھر بھی اس صنف سخن کی اہمیت اور افادیت سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا صرف اس لئے کہ فلم کا دائرہ و ذرائع ابلاغ کافی وسیع ہے اور بہت کم مدت میں عوام تک ہم اپنی بات پہنچا سکتے ہیں۔

ساحر ایک فلمی گیت نگار (نغمہ نگار) کی حیثیت سے فلم انڈسٹری میں قدم رکھا تو عام فلمی گیتوں کا معیار کافی ادنیٰ اور پست تھا۔ بنگال کی بعض فلموں میں آرزو نے جو گیتوں کو روپ دیا بنایا سنوارا تھا وہ بمبئی کے فلمی شاعروں کے ہاتھوں لٹ چکا تھا۔ لوگ تک بندی (وہ بھی ادنیٰ اور پست درجہ کی) کو نغمہ نگاری کی معراج سمجھنے لگے تھے اور یہ پروپگنڈہ بھی بڑے زور و شور کے ساتھ جاری تھا کہ فلمی گیتوں کا لکھنا بڑے ادیبوں اور شاعروں کے بس کا روگ نہیں ہے۔ ایسے حالات میں ساحر نے اپنی جنبش قلم سے پھر ان گیتوں کے معیار کو ابھارنے سنوارنے کی کوشش کی۔ فلمی گیتوں کو ذہنی گندگی سے نکالا، جس میں گھری اور صاف ستھری ادبیت بخشی فلمی گیتوں میں ادبی رنگ کو ابھارا۔ ایک طرف گیتوں کو حسن بیان عطا کیا تو دوسری طرف تخیل کی لطافت اور جذبات کی پاکیزگی بخشی اس ضمن میں جب ساحر کے گیتوں کا جائزہ لیا جائے تو وہ چاند مدھم ہے آسمان چپ ہے " ادبی شہ پارہ ہے اس گیت میں انتظار کے کرب والی کیفیت، محبوب کو دیکھنے کی بے پایاں حسرت ان سب کے سارے الفاظ میں سموئی ہوئی ہے۔ ساحر نے اس گیت کو اپنی فضا اور بحر سے ساتھ منفرد ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔

رو دو کی طرح آج بھی جلے
صبح کی گود میں کھو جائیں
آ تو ہے تم بھی جاگی آنکھیں
کہ ہے کہ ایک رات سو جائیں
چاند مدھم ہے آسماں چپ ہے
نیند کی گود میں جہاں چپ ہے

اسی طرح یہ گیت

آنکھ کھلتے ہی تم چھپ گئے ہو کہاں
تم ابھی تھے یہاں
ابھی سانسوں کی خوشبو ہواؤں میں ہے
ابھی قدموں کی آہٹ فضاؤں میں ہے
ابھی شاخوں پہ ہیں انگلیوں کے نشاں
تم ابھی تھے یہاں

یہ ان لطیف احساسات کی ترجمانی ہے جو محبوب کے تصور یا تخیل کو متشکل کرکے زندگی سے معمور کر رہا ہے۔

فلمی گیتوں کا ایک عام موضوع وہ محبت کا پہلا احساس ہے۔ ساحر کی زبانی ایک نازک انداز کے نازک اور جذبات کی ترجمانی دیکھئے۔

میں جھک کے اٹھے
پاؤں رک کے اٹھے
آگئی چال نئی
بات کچھ بن ہی گئی
زلف شانے پہ مڑی
ایک خوشبو سی اڑی
کھل گئے راز کئی
بات کچھ بن ہی گئی

ہجر و فراق کا موضوع بھی ساحر کا دلچسپ موضوع ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع سے شاعر کو فطری مناسبت ہے جس کی وجہ سے اس موضوع پر وہ بڑے ڈھنگ سے گیت لکھتا ہے۔

جانے وہ کیسے لوگ تھے جن کے پیار کو پیار ملا
مری عمر بے کسی ہو گئی
تم نہ جانے کس جہاں میں کھو گئے

دو سو بادل کی داستان " ساحر کا گیت ہندوستان گیر شہرت کا حامل ہے۔ یہ الفاظ اور جذبات ہی کی خوبصورتی گیتوں کی جان ہوتی ہے۔ ساحر ایک باشعور شاعر ہے اس لئے ان گیتوں میں بھی وہ عوام جانوں پر مشتمل ہیں ان کی ہنسی مل ہی جاتی ہے۔

جیسے — تم نے کتنے سپنے دیکھے ہیں نے کتنے گیت بنے
اس دنیا کے شور میں لیکن دل کی دھڑکن کون سنے

حسن کے کھلتے پھول ہمیشہ بیوپاروں کے ہاتھ بکے
اور چاہت کے متوالوں کو وصول ملی ویرانوں کی
دل کے نازک جذبوں پر بھی راج ہے سونے چاندی کا
یہ دنیا قیمت دے گی سادہ دل انسانوں کی

ساحر کے گیتوں میں سب سے اہم خصوصیت ترقی پسند مواد ہے۔ انہوں نے بڑی ہمت اور پوری طاقت کے ساتھ گیتوں میں یہ آواز اٹھائی۔ جیسی یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ فلمی دنیا میں داخل ہوتے وقت ساحر ایک پہلو منفرد اور پختہ شعور لیکر داخل ہوئے تھے۔ ان کی پہلی فلم "نوجوان" "بازی" میں یہ نغمہ

تدبیر سے بگڑی ہوئی تقدیر بنالے
انصاف ترے ساتھ ہے الزام اٹھالے
ٹوٹے ہوئے پتوار ہیں کشتی کے تو غم کیا
ہاری ہوئی باہوں کو ہی پتوار بنالے

قاتلوں کو چونکا دینے والا نعرہ تھا۔ یہ آواز فلمی گیتوں کے لئے نئی تھی اور ساحر نے اس آواز کو رفتہ رفتہ روز بروز تیز کیا۔ پھر کھل کر اپنے سماجی شعور کو فنکارانہ نزاکتوں کے ساتھ گیتوں میں پیش کرنے لگے۔

" یہ دنیا جہاں آدمی کچھ نہیں " اس گیت میں آدمی ٹکراتے ہوئے جتے ہیں تو انہیں گیتوں اور افادیت ہمیں کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ " یہ سڑکیں یہ ساری گلیاں ہی بتا ان کے لئے ہیں" " ان کے گیتوں میں عورت کی چیخ ہے " اور " پھر بھی ہے شیطان کی بیٹی ہے" ان کے گیتوں میں مزدوروں کی صدا ہے جن کی محنت کی بنیادوں پر دنیا کی سادی آسائشیں اور آسائشوں کی عمارت کھڑی ہے وہ سالی سے ہم نئیل نکالیں، سوتی

نہ مہی عملی ہے " شاعر اس استحصال کو برداشت نہیں کرتا اور لئے وہ ٹکرا کر گرج اٹھتا ہے۔ " وہ بات بڑھا کر بھی لو ہے " سینوں کی تصویریں " اور سرمایہ داری پر بھرپور ضرب لگاتا ہے۔ ایک گیت میں ساحر نے اس طرح کیا ہے کو بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے اور یہ سرمایہ دارانہ نظام زندگی کی پیداوار ہے اور جہاں پر لڑکو ہر کرکے موقع اور ذرائع حاصل نہیں ہوتے جس کی وجہ سے وہ پنپ سکتا ہے اور نہ ہی دوسروں کو بڑھ سکتا ہے تیجے ایک کی طرح میں سکھ تو دوسرے کی تجربے میں دکھ

وہ کیا سکھ ہیں
ایک پہرے کے بیچ گل ہے اور بچن ہی سن میں اتر آنے

ایک دھرتی کے جسم بڑے اور دھول میں مل جائے
کس کو فرصت کہ کوئی کس کو دوش لگائے

دو سکھیاں بچپن کی
ایک سنگھاسن پر بیٹھے روپ سنگھی کہلائے
دوجی اپنے روپ کے کارن گلیوں میں بک جائے
کس کو فرصت کہ کوئی کس کو دوش لگائے

ساحر اس ناانصافی کو برداشت نہیں کرپاتے وہ ایسے ناحق اور غیر مساوی نظام کے دشمن ہیں۔ لیکن ان کے ہاتھوں اس کا اس نہیں چھوٹتا اس اندھیرے کو چھٹا محسوس کرکے چیخ اٹھتے ہیں۔ وہ کس کے روکے رکا ہے سویرا ان کو نکتہ انہیں معلوم تھا کہ ہر عمل کا رد عمل ہے یہ فطری اور سائنسی اصول ہے اور وہ اس گر سے اچھی طرح واقف تھے۔

رات جتنی بھی سنگین ہوگی
صبح اتنی ہی رنگین ہوگی
غم نہ کر گر ہے بادل گھنیرا
کس کے روکے رکا ہے سویرا

ایک گیت " وہ صبح کبھی تو آئے گی " میں وہ ایک نئی صبح کو خوشخبری سناتے ہیں۔

دھرتی کے جھکے آنگن میں پل دو پل ہے رات کا ڈیرا
ظلم کا سینہ چیر کے دیکھو جھانک رہا ہے سویرا
ڈھلتا دن مجبور سہی چڑھتا سورج مجبور نہیں
رات کے راہی تھک مت جانا صبح کی منزل دور نہیں
اور پھر وہ وہ صبح کبھی تو آئے گی " والے گیت میں ہمارے تمام مصائب و آلام کے ختم ہونے کا یقین دلاتے ہیں
یہ نرک سے بھی گندی دنیا جب سورگ بن جائے گی
وہ صبح کبھی تو آئے گی

ساحر کی ہمیشہ یہ کوشش رہی تھی فلمی نغموں کو تخلیق اور تنقید کے بجائے تبلیغ کا پیغام بنائیں کہ ذریعہ جو سماجی اور سیاسی شعور کو عوام تک پہنچا سکے۔ اور اس کو ساحر کا کارنامہ ہی کہنا چاہئے کہ انہوں نے فلم کے لئے اپنے گیت لکھے جو سیاسی اور سماجی شعور سے لبریز تھے۔ یہ ایک بہت بڑا اور کافی دلیرانہ اقدام تھا جس کو ساحر نے بڑی دلیری سے نبھایا اور انہوں نے گیتوں کو ایک طرف حسن کی لطافت، نزاکت، عشق، درد و الم کی عکاسی تو دوسری طرف سماجی، سیاسی اور اقتصادی شعور دیا۔ انہوں نے ایک بیدار شاعر کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کیا اور وہ تجربات و حوادث کو

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

کہہ کر اپنے شعری تخلیقات کے مجموعے " تلخیاں " ۱۹۴۴

" پرچھائیاں " ۱۹۵۵ " گاتا جائے بنجارا " ۱۹۵۸ اور " آؤ کوئی خواب بنیں " ۱۹۷۳ " تلخیاں " دنیا کے سامنے رکھا۔ اپنے آپ کو " پل دو پل کا شاعر " کہنے والے اس شاعر نے ۱۹۸۰ میں مستقل خاموشی اختیار کرلی۔ لیکن جو خود ساحر نے دنیا کو اپنے نغموں کے روپ میں دیا ہے وہ صدیوں تک گونجا کریں گے۔ اور اس کے بدلے دنیا نے انہیں موتی، جنگ، پدم شری کا اعزاز، سوویت نہرو ایوارڈ عطا کیا۔ اپنے آبائی وطن لدھیانہ میں ان کے نام پر ایک سڑک اور ہندوستانی کوچوں نے ان کے نام ایک جوک منسوب کی۔ ساحر کے کلام کا ترجمہ انگریزی، روسی، عربی، فارسی اور جنگ وغیرہ زبانوں میں ہوا۔ ہندوستان کی دیگر زبانوں جیسے ہندی، بنگالی، مراٹھی میں بھی ترجمے ہوئے تھے۔ سنہ ۱۹۸۰ میں جناب عبدالحمید خاں صاحب نے ساحر کے اہم نغموں کا کنڑا منظوم ترجمہ ... شائع کیا ہے۔

سال ۱۹۸۰ء ہم اردو والوں کے لئے ایک منحوس سال تھا اس سال اردو دنیا کی ممتاز شخصیتیں، امتیاز علی عرشی، دانش فراقی، ڈاکٹر عبادت ... اور اطہر نفیس ہم سے جدا ہو گئے تو ان کے ساتھ ہی یہ رشتہ جو اب کی زبان دے کے عوام کا درد اپنے منظوموں میں آنکھیں دکھانے والا نغموں کی سادی مٹھاس کو زندگی کے اعلیٰ اقدار کرنے والا صاحب طرز ساحر بھی ہم سے جدا ہو گیا۔

وی شانتارام کی موت کے ساتھ جیسے فلمی دنیا کی پوری ایک صدی اختتام کو پہنچ گئی شانتارام ۱۹۲۵ سے فلمی دنیا سے وابستہ تھے اور گزشتہ ہفتے اپنی موت سے قبل تک وہ فلمی دنیا سے عملی طور پر وابستہ رہے تھے۔ شانتارام ایک مکمل فلمی شخصیت اور اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ انہوں نے فلمسازی اور ہدایت کاری میں جو اعلیٰ قائم کئے پانچ نسلیں ان اقدار سے متاثر رہیں گی شانتارام کی فلمیں ہندوستانی فلم انڈسٹری کے ہر دور کے خواہشمند کرتی ہیں اور انہیں ہدایت کاری کے فن میں ذریعۂ تعلیم کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے بحیثیت ہدایت کار

محسن کاکوروی

ایک عظیم نعت گو شاعر

ڈاکٹر صبغت اللہ بنگلوری

ایک اچھے شاعر کے لئے ان خصوصیات کا ہونا لازمی سمجھا جاتا ہے

۱) فکر

۲) جذبہ

۳) قدرتِ بیان

فکر کے معنی یہ ہیں کہ شعر میں کوئی مناسب خیال پیش کیا گیا ہو اور یہ خیال صالح ... [illegible]

[illegible]

اس نقطۂ نظر سے جب محسن کاکوروی کے کلام کو دیکھتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے رنگ میں ایک زبردست اور بے مثال ... [illegible]

شاعر تھے۔ محسن کے کلام کو پڑھ کر قاری پر پہلے تجسس کی کیفیت طاری ہوتی ہے ... [illegible]

[illegible]

[illegible]

طرزِ مضمون سے مجھے پیشِ نظر ہوا آگاہ

منظرِ چشمِ نبی پر بھی ذرا کیجئے نگاہ
ایسی نرگس کہیں دیکھی ہے نہ بادامِ سیاہ
چشمِ پرور عجب آنکھ ہے ماشاء اللہ

لاکھ اگر اچھی سے اچھی کوئی تشبیہ کہے
چشمکیں مارے سخن گو نظر فیض کہے

اک نیا نسخہ نکالوں دلِ پُر جوہر سے
صفحۂ سیم پہ رکھیں جسے آپ زر سے
پلکیں اکسیر کی بوٹی ہیں سنا اکثر سے
بوسۂ چشم پہ ہے آپ کے رخِ انور سے

صدقے ایسے طالعِ بیدار ترے سو گئے
ڈھیلے آنکھوں کے نہیں ڈھیلے ہیں سونے کے

جہاں تک جذبات کا تعلق ہے اس میں کوئی دو رائے نہیں ... [illegible]

[illegible]

[illegible]

The daily Sultan Bangalore - 16-12-90

The Daily Munsif Hyderabad
12-12-92 ۳
روزنامہ منصف حیدرآباد — سنڈے ایڈیشن

محسن کاکوروی — عظیم نعت گو شاعر

ڈاکٹر محمد صبغت اللہ (حیدرآباد)

ایک اچھے شاعر کے لئے ان خصوصیات کا ہونا لازمی مانا جاتا ہے۔
۱۔ فکر
۲۔ جذبہ
۳۔ قدرت بیان

فکر۔ اس سے مراد یہ ہے کہ شعر میں کوئی صاحب خیال پیش کیا جائے اور یہ خیال سامع کی ذہنی قوت کو ایک سرمایہ فراہم کرے۔ لیکن ایسا ہے کہ اگر شعر محض مضمون آفرینی یا خیال بندی ہی ہو گا تو وہ صحیح معنوں میں شعر کہے جانے کا مستحق نہ ہو گا اس لئے فکر کے ساتھ جذبات کا ہونا لازم ہے۔ محبت نفرت، خوشی، غم، غصہ وغیرہ کو اصل شعر کے لوازم میں شمار کرنا چاہئے۔ اہل منطق نے شعر کی تعریف یوں کی ہے کہ وہ ایسی چیز ہے جس سے نفس کو انبساط یا انقباض ہو۔ ان دونوں اوصاف کے ساتھ شاعر کے لئے قدرت بیان ضروری ہے۔ ایک شاعر اور غیر شاعر میں یہی چیز حد تک امتیاز کئے جانے والی ہوتی ہے۔ اگر شعر میں محض خیال بندی کی گئی ہے اور جذبات کی آمیزش نہیں ہے تو شعر بے کیف و بے رنگ ہو کر رہ جاتا ہے۔ جیسا کہ [illegible] کے اکثر اشعار ہیں۔ اگر شعر میں صرف سادگی اور سپاٹ جذبات نگاری لائی جائے تو اس کی حیثیت [illegible] کی جہاجانی سے زیادہ نہ ہوگی۔ ویسے دیکھا جائے تو ہر شخص اپنے تجربہ کی بنا پر کسی خیال کا اظہار کرتا ہے اور کسی نہ کسی جذبہ کا مظاہرہ کرتا ہے۔ لیکن بات کس طرح کی ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بات کہنے والے کو وہ بات کہنے والے کو حظ حاصل ہو۔ اور ہر شخص یہ محسوس کرے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا جیسا کہ کسی نے کہا ہے "[illegible]" اور یہی وصف ایک شاعر اور اچھے شاعر کی خصوصیات میں داخل ہے۔

اس نقطہ نظر سے جب محسن کاکوروی کے کلام کو دیکھتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے رنگ میں ایک زبردست اور بے مثال شاعر تھے۔ محسن کے کلام کو پڑھ کر قاری پر پہلے محسن کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ پھر یہی محسن حیرت میں بدل جاتا ہے اور بالآخر یہی حیرت شاعر کی عظمت و احساس میں بدل جاتا ہے۔ محسن کا کل شعری سرمایہ (مختصر عشقیہ کلام کو چھوڑ کر) نعت رسول پر منحصر ہے۔ جو غزل قصیدہ مثنوی قطعہ و رباعی سب پر حاوی ہے۔

محسن خود صاحب علم تھے اور ایک علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کو لکھنؤ اسکول کی روایات قدرتاً خاص لگاؤ تھا۔ نیز ان کو عشق رسول کی دولت سے وافر حصہ ملا تھا۔ اس لئے یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہ ہو گا کہ اب بھلا [illegible] صلات کا کامل جامعیت الوقت کے ساتھ ایک ہستی میں جمع ہونا زمانہ کی روش کو دیکھتے ہوئے بعید معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ اب اس پایہ کا نعت گو شاعر ہندوستان میں پیدا ہونا دشوار ہے۔ اس سے یہ قیاس کرنا درست نہیں کہ اب ان کی شاعری کا رنگ فرسودہ اور اس کی قدردانی و قدرشناسی کا دور ختم ہو چکا ہے۔ (محسن) کے ہاں علمی اصطلاحات اور اشارات کا استعمال بکثرت ہے اور وہ مسائل [illegible] اہمیت بھی روز بروز گھٹتی جا رہی ہے۔ ان حالات میں ان کے کلام کے سمجھنے والے اور قدر کرنے والے کم ہیں لیکن اب بھی ہر رنگ کے ایسے اہل ذوق مل جاتے ہیں جو محسن کے کلام کے قدر دان ہیں۔

محسن کے کلام میں فکر کا عنصر کس قدر غالب ہے اس کا اندازہ ان مثالوں سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی ملحوظ رہے کہ تشبیہ و استعارہ کی ایجاد اور استعمال بھی قوت متخیلہ کی فراوانی اور غور و فکر پر منحصر ہے۔ کوئی شخص جو قوت فکر کی بلندی نہ رکھتا ہو وہ ایک اعلیٰ تشبیہ یا استعارہ سوچنے پر قادر نہیں ہو سکتا۔ اس کے ساتھ اس کے لئے زبردست قوت مشاہدہ ہونا بھی ضروری ہے۔ شبلی نے ایک واقعہ شعرالعجم میں نقل کیا ہے۔

"ابن الرومی عرب کا ایک مشہور شاعر تھا ایک دفعہ اس کو کسی نے طعنہ دیا کہ تم ابن المعتز سے بڑھ کر ہو کر ابن المعتز کی سی تشبیہیں کیوں نہیں پیدا کر سکتے۔ ابن الرومی نے کہا کہ ابن المعتز کی کوئی تشبیہ سناؤ جس کا جواب مجھ سے نہ ہو سکے۔ اس نے شعر پڑھا شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہلال [illegible] جس طرح ایک چاندی کی کشتی جس پر اس قدر عنبر لاد دیا گیا ہے کہ وہ دب گئی ہے۔ کشتی پر جب بار زیادہ ہو جاتا ہے تو اس کا زیادہ حصہ پانی میں غرق ہو جاتا ہے اور صرف کنارے دکھائی دیتے ہیں۔ اس لئے ہلال کو کشتی کے کنارے سے تشبیہ دی ہے اور چونکہ آسمان کا رنگ نیلگوں ہوتا ہے اس لئے قرار دیا کہ کشتی پر عنبر لدا ہوا ہے۔ ابن الرومی نے [illegible] المعتز بادشاہزادہ ہے گھر میں جو دیکھتا ہے وہی کہہ دیتا ہے۔ میں وہ خیالات کہاں سے لاؤں۔"

جب اس نقطہ نظر سے محسن کے کلام پر نظر ڈالی جائے تو ان کی انفرادی اور بلند تشبیہات کی فراوانی اور اس کے قوت متخیلہ کی [illegible] سراپائے رسول اکرم صلعم در حقیقت ایک نادر اور لطیف تشبیہات کا گنجینہ ہے۔ جس کی مثال دوسرے شعرائے اردو کے یہاں مشکل سے ملے گی۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

[illegible]

جہاں تک جذبات کا تعلق ہے اس میں کوئی دو رائے نہیں ہو سکتیں کہ وہ ایک سچے عاشق رسول تھے۔ اور ان کی شاعری کا تمام تر موضوع رسول پاک صلعم کی تعریف آپ کی محبت اور آپ کی ذات اقدس سے والہانہ اظہار ہے۔ [illegible]

محسن کاکوروی
(بقیہ صفحہ ۳)

جس طرح سے صبح صادق [illegible]
[illegible]
کوئی عنبر کسی کے [illegible]
[illegible]
[illegible]
گلدستہ تری نعت کے سخن میں
رکھی ہے مثنوی گلشن میں

بھیگی ہوئی رات آئی ہے
داخل ہوئی کعبے میں وضو سے
[illegible] سے ہوئے [illegible] احرام
[illegible]
گویا کہ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

محسن نے اپنی طبیعت کے زور سے ایسی بلند و نادر تشبیہیں استعمال کی ہیں کہ ہر شخص ان کی طباعی کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے۔ انہوں نے [illegible] کو بازار سے اٹھا کر [illegible] کے حلقوں سے نکال کر اہل علم کی مجلس میں لا بٹھایا۔ حقیقت یہ ہے کہ [illegible] تشبیہات و استعارات قرآن و احادیث اور مختلف قسم کے علوم و فنون سے ماخوذ ہیں۔ اور جب تک کوئی شخص ان چیزوں سے کم و بیش مس نہ رکھتا ہو وہ محسن کے اشعار کو پورے طور پر سمجھ نہیں سکتا اور ان کے ساتھ انصاف کرنے سے قاصر ہے [illegible] رسول اکرم صلعم کی [illegible] اس [illegible]

[illegible]

محمد حسن عسکری کے اعتراضات میں ایک اعتراض ہے کہ محسن کی تمام تر [illegible] سمت کاشی سے [illegible] ہے۔

اس کے جواب میں [illegible] لکھتے ہیں کہ وہ جس جذبہ کے ساتھ دربار رسالت میں حاضر ہوئے ہیں وہ وہی ہے جو ایک امتی کو رسول سے ایک فدائی کو اپنے محبوب اور ایک شکر گزار فرد کو اپنے محسن سے ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک رسول اکرم کا جمال کمال اور احسان ہر چیز اس بات کا مستحق ہے کہ اگر موقع ملے تو اپنی جان تک آپ پر نثار کر دے۔ حالی نے اپنی شاعری میں آنحضرت صلعم کی شخصیت (اخلاقی حیثیت) کو پیش نظر رکھا اور محسن نے خود آنحضرت کو۔

آخر میں اتنا کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ حالات میں جبکہ نہ وہ عشق رسول کا جذبہ ہے اور نہ قرآن و احادیث اور مختلف علوم و فنون پر اس قدر گہری نظر ہے اب نعت گوئی میں کوئی ایسا نہیں جو محسن کی طرح [illegible] اس کی اصلی [illegible]

رہ گیا دشت و جبل باقی ہے

[illegible]

(باقی سلسلہ صفحہ [illegible])

25-1-91

حضرت خواجہ غریب نواز خواجہ اجمیری

از ڈاکٹر محمد صبغت اللہ
گورنمنٹ آرٹس کالج
بنگلور

حضرت سلطان العارفین سراج السالکین معین الدین حسن سجزی کا شمار مشائخ چشت کے اولیاء کبریٰ میں ہوتا ہے۔ آپ صحیح النسب سادات حسنی حسینی ہیں۔ آپ کی ولادت با سعادت ایران کے ایک شہر سجستان میں ۵۳۷ھ مطابق ۱۱۴۳ء سید غیاث الدین حسن سجزی کے گھر ہوئی۔ سجزی کی جگہ یہ لفظ سنجری کاتب کی تحریف سے مشہور ہو گیا ہے۔ اور عام طور پر خواجہ معین الدین سنجری کے نام اور زیادہ تر خواجہ غریب نواز اور خواجہ اجمیری کے نام سے مشہور ہو گئے ہیں۔ گیارہ برس تک نہایت ناز و نعم سے پرورش پائی جب عمر چودہ برس کی ہوئی تو آپ یتیم ہو گئے۔ سارہ جائیداد دو حقیقی بھائیوں میں تقسیم ہوئی۔ حضرت کے ترکہ میں ایک باغ اور پن چکی آئی جس کی آمدنی سے حضرت نے چند ایام گزارہ کیا۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ آپ اپنے باغ میں تشریف فرما تھے ایک مجذوب ابراہیم قلندر اس باغ

حضرت خواجہ غریب نوازؒ کا آج عروس شریف ہے

میں آئے۔ حضرت نے ان کو دیکھتے ہی کھڑے ہو کر سلام کیا اور بڑی عزت کے ساتھ ایک سایہ دار درخت کے نیچے لا کر بٹھایا۔ اور انگور کے خوشے پیش کئے۔ آپ نے بہ رغبت تمام ان کو کھایا اور تھوڑی سی کھلی اپنی بغل میں سے نکال کر اپنے منہ میں لی اور اس کو تھوڑے چبا کر اپنے ہاتھ سے حضرت خواجہ کے دہن مبارک میں دی۔ اس کے کھاتے ہی آپ کو دنیا سے نفرت ہو گئی۔ اسی وقت ... باغ کو اور تمام ... فروخت کر کے مساکین میں ... اور معرفت الٰہی کی تلاش میں گھر سے نکل پڑے۔ پہلے آپ سمرقند گئے۔ پھر عراق اور عرب کی طرف روانہ ہوئے۔ اس طرح آپ زمانے کے مشہور بزرگوں کی زیارت کرتے ہوئے نیشاپور کے ایک قصبہ ہارون میں پہنچے اور حضرت عثمان ہارونی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے مرید ہوئے۔ ۲۰ سال تک اپنے پیر و مرشد کی صحبت میں رہ کر فیضان حاصل کرتے رہے۔ پھر بغداد آئے اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی خدمت میں حاضری دی۔ کافی عرصہ تک دونوں ساتھ رہے ہیں۔ شیخ شہاب الدین سہروردی سے ملاقات رہی (سہروردی سلسلہ آپ ہی کے نام کی مناسبت سے ہے) آپ تبریز پہنچے اور وہاں ابو تبریزی سے ملاقات ہوئی۔ کچھ دنوں بعد غزنی پہنچے شیخ عبدالواحد غزنی سے ملاقات کی۔ اس سفر میں آپ نے کئی متبرک ہستیوں سے فیض حاصل کیا۔

ہندوستان کے سفر کے بارے میں آپ خود فرماتے ہیں کہ میں حضرت عثمان ہارونی کے ہمراہ کعبۃ اللہ شریف کی زیارت کے لئے گیا تھا۔ آپ نے میرے لئے خدا سے دعا مانگی اور مجھے پیش کیا۔ غیب سے آواز آئی معین الدین کو ہم نے قبول کیا ہے یہ آواز سن کر ہم خدا کے حضور میں سربسجود ہوئے شکرانہ ادا کیا اور پھر مدینہ کی طرف چل پڑے روضہ انور پر سلام عرض کیا تو روضۂ مطہرہ سے جواب ملا۔ وعلیکم السلام یا شیخ الہند اس جواب کو سن کر حضرت عثمان ہارونی فرش ... [illegible]

عثمان ہارونی نے آپ کو دعاؤں کے ساتھ ہندوستان کی طرف رخصت کیا۔ کئی دشواریوں کے ساتھ آپ نے یہ طول طویل سفر طے کرتے ہوئے سبزوار پہونچے۔ یہاں کا حاکم ایک شیعہ تھا ایسا تنگ نظر کہ اپنی رعیت میں کسی کو صحابہ کا نام لیتے ہوئے سن کر فوراً قتل کرا دیتا ایک دن یہ حاکم

فوراً شہر سے نکال دیا جائے۔ اناساگر کے کنارے کئی مندر بنے ہوئے تھے۔ جب حضرت خواجہ نے دیکھا کہ ان کی طرف ایک جم غفیر آ رہا ہے تو آپ نے ایک مٹھی خاک اٹھائی اور اس پر آیۃ الکرسی دم کر کے لوگوں کے گروہ کی طرف پھینکا تو سارا لشکر بدحواس ہو کر بھاگ کھڑا ہوا۔

آپ کے قدموں پر سر رکھ کر اسلام قبول کر لیا اس کے بعد آپ نے جے پال کو دعا دی جا خدا نے تجھے حیات جاودانی بخشی اور اللہ تجھ کو لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رکھے آپ نے اس کا اسلامی نام عبداللہ رکھا۔ روایت ہے کہ عبداللہ آج تک اجمیر کی پہاڑیوں میں رہتا ہے۔ اور بھولے بھٹکوں کو

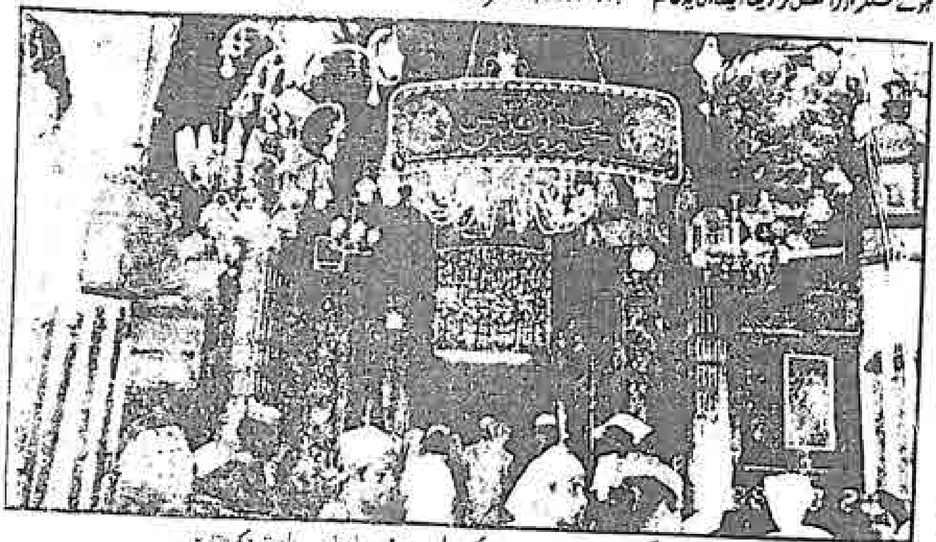

بھی اس جگہ آ گیا جہاں آپ تشریف فرما تھے آپ کو دیکھتے ہی چکرا کر بے ہوش ہو گیا۔ آپ نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے دیے تو ہوش ... [illegible]

آپ نے بڑے پیار سے کہا۔ توبہ کر اور اپنے گناہوں پر نادم ہو خدا تیرے گناہ معاف کرے گا۔ حاکم نے اپنے سارے لونڈی غلام آزاد کئے خزانہ غریبوں میں بانٹ دیا حضرت کے ہاتھ پر بیعت کر کے نیک منزل پر پہنچا وہاں سے دہلی کی طرف روانہ ہوئے تو اس وقت آپ کے ساتھ چالیس افراد تھے آپ اجمیر آئے۔ اجمیر پر اس وقت راجہ پرتھوی راج کی حکومت تھی۔ اس کی ماں علم نجوم کی ماہر تھی۔ اس نے علم نجوم کی مدد سے یہ معلوم کیا کہ یہاں عنقریب اسلام کا دور دورہ ہو گا اور اپنے بیٹے کو حضرت خواجہ صاحب کا حلیہ بھی بتا دیا تھا۔ پرتھوی راج نے اعلان کر دیا تھا کہ جو آدمی اس حلیہ کے آدمی کو گرفتار کر کے لائے گا۔ اسے کافی انعام و اکرام سے نوازا جائے گا۔ جب آپ کو راجہ کے ملازموں نے اجمیر کے نواحی پہاڑیوں میں دیکھا تو قریب سے قیام کے لئے وہ جگہ تجویز کی جہاں راجہ کے اونٹ بیٹھا کرتے تھے۔ لوگوں نے آپ کو بتایا کہ یہ مہاراجہ کے اونٹوں کی جگہ ہے آپ نے فرمایا کہ اچھا تو آرام سے بیٹھے رہیں یہ کہہ کر آپ وہاں سے اناساگر کے پاس تشریف لے گئے۔ جب صبح ہوئی تو اونٹ والوں نے اونٹوں کو چراگاہ کی طرف لے جانے کے لئے اٹھایا تو کوئی اونٹ اپنی جگہ سے ہل نہ سکا تو سب آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور معافی کے طلب گار ہوئے آپ نے مسکراتے ہوئے فرمایا جاؤ تمہارے اونٹ کھڑے ہوں گے جس وقت ساربان وہاں پہونچے تو یہ دیکھ کر حیرت ... اونٹ کھڑے ... [illegible]

دوسرے دن ایک بڑے مہنت رام دیو کو راجہ نے ایک لشکر جرار کے ساتھ روانہ کیا حضرت خواجہ کی نظر پڑتے ہی وہ تھر تھر کانپنے لگا ... [illegible] ... بدل گیا اور اسی وقت آپ کا مرید ہو گیا۔ آپ نے اس کا نام شادی دیو رکھا۔ اس واقعہ کی خبر اجمیر والوں کو پہنچی تو انہیں یہ خیال ہوا کہ یہ کوئی بہت بڑا جادوگر ہے۔ اور اس کا مقابلہ کوئی نامور جادوگر ہی کر سکتا ہے۔ چنانچہ راجہ نے اس وقت کے مشہور جادوگر جے پال کو حضرت خواجہ کے مقابلے کے لئے روانہ کیا۔ اس نے اپنا مرگ چھالہ ہوا میں پھینکا اور اس پر سوار ہو کر آسمان کی طرف اڑا۔ یہ دیکھ کر آپ نے اپنے جوتے کو حکم دیا کہ جا اسے واپس لا۔ حکم کے ملتے ہی جوتا کھڑا ہوا آسمان کی طرف اڑا اور جے پال کے سر پر تڑ تڑ مارتا ہوا زمین کی طرف لے آیا۔ جے پال اس حادثے سے اس قدر خوفزدہ ہوا کہ فوراً

راستہ دکھاتا ہے۔

آپ نے لوگوں کو حسن اخلاق سے گرویدہ کیا اور بہت سے لوگ آپ کے ہاتھ پر ایمان لائے آپ نے فرمایا جو خدا کا دوست ... [illegible] اس کی چار نشانیاں ہوں گی ... (۳) شفقت اور (۴) نیکوکاروں کی صحبت آپ نے فرمایا مرید وہ بہتر ہے جس سے ۲۰ سال تک کوئی گناہ سرزد نہ ہوا ہو اور عارف وہ شخص ہوتا ہے جس کے دل سے غیر حق نہ چھوٹے ... آپ نے اپنی پوری زندگی تبلیغ و اشاعت میں گزار دی۔ آپ نے بھی سماعت سے تبلیغ کا کام انجام دینے کا سوچا اور محفل سماع کی بنیاد ڈالی اور یہ محفل سماع آہستہ آہستہ قوالی کی شکل اختیار کر گئی۔ آپ نے اپنی وفات سے قبل خواجہ بختیار کاکیؒ کو خلافت عطا کی آپ کا انتقال ۶ رجب ۶۳۲ھ مطابق ۱۲۳۶ء اجمیر میں ہوا۔ اور آپ وہیں مدفون ہوئے۔

٭ ٭ ٭

خلیجی واقعات — ایک نظر میں

واشنگٹن: ذیل میں ترتیب وار وہ واقعات دیئے جا رہے ہیں جو خلیج فارس میں گذشتہ ساڑھے پانچ ماہ کے دوران پیش آئے اور جو جنگ کے مرحلے تک پہنچے۔

۲ اگست ۱۹۹۰ء تنازعہ علاقہ پر کئی ہفتوں کی کشیدگی اور تیل پیدا کرنے کے کوٹہ پر بحث کے بعد عراق نے اپنی پڑوسی کویت پر قبضہ کر لیا امریکی ایوان نمائندگان نے ایک بل منظور کیا جس کی رو سے امریکی صدر جارج بش کو عراق کے خلاف ... پابندی ... [illegible]

سفارتی کوششوں پر زور دیئے گئے۔

۲۵ اگست ۱۹۹۰ء اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے امریکہ کو معاشی پابندی کی خلاف ورزی کرنے والے جہازوں کے خلاف کم سے کم طاقت استعمال کرنے کا اختیار دے دیا۔

یکم ستمبر ۱۹۹۰ء عراق میں روکے ہوئے غیر ملکیوں میں سے پہلی بار (۷۰۰) مغربی اور جاپانی عورتوں اور بچوں کو لے کر تین ہوائی جہاز عراق سے نکلے۔

۹ ستمبر ۱۹۹۰ء عراق کے خلاف متحدہ ... قائم کرنے کے لئے صدر بش نے روسی صدر ... [illegible]

نواز شریف کیا ایک جامع کابینہ بنا سکیں گے

نئے پارلیمانی پارٹی کے سربراہ وزیر اعظم نواز شریف آج اسلام آباد میں اپنے عہدے کا حلف اٹھائیں گے اور ان کے ساتھ لگتا ہے کہ ۱۲ تا ۱۸ وزراء کی ایک مختصر کابینہ بھی حلف اٹھائے گی۔ دریں اثناء تمام نگاہیں اس امر پر مرکوز ہے کہ وہ خوش قسمت وزراء کون ہوں گے اور مسٹر شریف کی اسلامی جمہوری اتحاد سے باہر کس پارٹی کو مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کی کابینہ میں نمائندگی دی جائے گی۔ ظاہر ہے کہ دونوں کابیناؤں میں بھی قدرتی طور پر آئی جے آئی کا غلبہ رہے گا۔

قومی اسمبلی کی ۲۰۵ نشستوں میں سے جن کے لئے انتخابات ہوئے تھے آئی جے آئی کی اپنی ۱۰۵ نشستیں ہیں جب کہ بہت سی دوسری پارٹیوں کے لیڈر بھی ہیں۔ اور یہ تمام پارٹیاں صحیح معنوں میں آئی جے آئی اور اس کے طاقتور لیڈر مسٹر شریف کی حلیف ہیں۔ ان کے علاوہ مہاجر قومی تحریک (ایم کیو ایم) کے ۱۵ ارکان ووٹ ڈالیں جس پر مسٹر شریف انحصار کر سکتے ہیں۔ اگر آئی جے آئی اور اے این پی اتحاد برقرار رہے تو پھر عوامی نیشنل پارٹی کے چھ ارکان کے ووٹ بھی مسٹر شریف کی حکومت ہی کے حق میں جائیں گے خصوصاً شمال مغربی سرحدی صوبے کی صوبائی اسمبلی میں جہاں اے این پی کا وجود کافی مستحکم ہے۔

پنجاب میں آئی جے آئی کی اتنی قوت اتنی زیادہ ہے کہ اگر معمولی سا انحراف بھی واقع ہوا تو کوئی فرق پڑتا ہوا معلوم نہیں ہوتا۔ چونکہ آئی جے آئی اور مرکزی طاقت کی ساخت عوامی زندگی کے مختلف معاملات پر ایک ہی طرز فکر رکھتے ہیں اس لئے آئی جے آئی حکومت کو صوبے میں نہ تو مرکز سے اور نہ ہی اپوزیشن پی ڈی اے سے کسی قسم کے مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور اکتوبر کے صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں پی پی پی کو انتہائی غیر اہم جگہ تک دھکیل دیا گیا ہے۔

این ڈبلیو ایف پی کی تعدیل

شمال مغربی سرحدی صوبہ (این ڈبلیو ایف پی) میں صورتحال کسی حد تک آسان ہے جیسا کہ پہلے خدشات تھے۔ آئی جے آئی کو سب سے پہلے ۳۲ نشستیں ملی ہیں۔ اس کے بعد اے این پی کا نمبر آتا ہے جس کی ۲۲ نشستیں ہیں پھر ۱۸ آزاد ارکین آتی

خصوصی مضمون

جے آئی اور اے این پی انتخابات سے قبل اور بعد میں بھی ایک دوسرے کی حلیف ہیں اور دونوں طرف کے لیڈر اس اتحاد کو جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے درمیان نظریاتی اختلافات ابھر گئے ہیں۔ جیسا کہ کہا گیا ہے کہ آئی جے آئی بنیادی طور پر ایک طاقتور مرکزی حکومت کے حق میں ہے اور اے این پی صوبائی حکومتوں کے لئے زیادہ خود مختاری چاہتی ہے۔ اس کے باوجود شروعات کے لئے توقع ہے کہ دونوں ایک مخلوط حکومت بنائیں گے۔ امید ہے کہ عام احساس اور مرکز کی اعتدال پسندی سے صوبے میں ایک مضبوط حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ خواہ اتنے زیادہ آزاد ارکین کی خواہشات کچھ بھی ہوں۔

حالیہ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات نے صوبہ سندھ میں عجیب و غریب صورتحال پیدا کر دی ہے۔ نسلی اور لسانی عناصر کے خطرناک قوتوں نے شہری اور دیہی امتیاز کو کافی نمایاں کر دیا ہے۔ ۱۰۹ ارکنی ایوان میں اب پی ڈی اے کی طرف ۴۷ نشستیں ہیں اور بعض آزاد اور اقلیت کی حمایت کے دعوؤں کی تصدیق نہیں ہوئی ہے۔ دونوں کی دوسری سب سے بڑی قوت مہاجر قومی موومنٹ ہے جس کے ۲۸ ارکان ہیں۔ کافی طویل مذاکرات کے بعد اس نے نگران کار وزیر اعلیٰ کی حمایت کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

نگران وزیر اعلیٰ کی جانب سے سندھ میں حکومت تشکیل دینے کی بات کسی حد تک باہر والے کے لئے بڑی حیرت انگیز ہے کیونکہ انہیں کسی پارٹی کی حمایت حاصل نہیں ہے۔ درحقیقت وہ ایک آزاد امیدوار کی حیثیت سے منتخب ہوئے ہیں۔ لیکن جام صادق علی مستقل مرکزی حکام کے پسندیدہ لیڈر معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے بارے میں خیال ہے کہ وہ حتی الامکان گفت و شنید کے ذریعہ کام کرنے والے اور سیاسی جوڑ توڑ کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ بہرحال ان کا دعویٰ ہے کہ ۱۰۹ ارکان میں سے انہیں ۷۶ ارکان کی حمایت حاصل ہے اور ان کے علاوہ ایم کیو ایم کی تائید بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تقریباً ۱۵ آزاد ارکان اور اقلیتی فرقے کے ۹ ارکان کی حمایت انہیں حاصل ہے۔ اس طرح جام صادق علی کی حکومت تشکیل دینے کی کوششوں کو کامیاب بنانے کی کلید اب آزاد اور اقلیتی فرقے کے ارکین کے ہاتھوں میں ہے جب کہ پی پی پی بھی یہ دعویٰ کر رہی ہے کہ اسے بھی بعض آزاد اور اقلیتی ارکین کی حمایت حاصل ہے۔

کس طرح اس بات کا فیصلہ ہوگا یہ غیر یقینی ہے البتہ جام صادق علی کی وزارت یقینی معلوم ہوتی ہے۔

بلوچستان کا نقشہ

بلوچستان کا معاملہ اور بھی پیچیدہ ہے۔ یہاں بھی کسی ایک پارٹی کو واضح اکثریت حاصل نہیں ہے تاہم نقشہ مختلف زون کے اعتبار سے بالکل صاف ہے۔ شمالی زون نسل پرست پختونوں سے آباد ہے جب کہ جنوبی زون میں بلوچ سے کے

حضرت نظام الدین اولیاءؒ "ہنوز دلی دور است"

از: ڈاکٹر محمد صبغت اللہ شکور

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ ۶۳۴ھ مطابق ۱۲۳۶ء میں بدایوں (یوپی) میں پیدا ہوئے آپ کے والد حضرت سید احمد بخاری اپنے زمانے کے ولی تھے۔ وہ ہمیشہ قوالیوں اور بادشاہوں کے دربار سے دور رہتے یہی وجہ تھی کہ آپ کی ساری عمر مفلسی فقر و فاقہ میں گذری۔

محبوب الٰہی کا ابھی دور طفلی ہی تھا کہ آپ سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ والدہ نے کافی محنت و مشقت سے محبوب الٰہی کی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ ابتدائی تعلیم آپ نے بدایوں کے مشہور عالم مولانا شادان سے حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد آپ پہلے دہلی تشریف لائے پھر اجودھن (جو آج کل پاک پٹن کہلاتا ہے) کی راہ لی وہاں پہنچ کر بابا فریدالدین گنج شکر کے خاص مریدوں میں شامل ہو گئے۔ حضرت بابا صاحب سلطان بلبن (۶۶۴ھ تا ۶۸۵ھ ۱۲۶۶ء تا ۱۲۸۸ء) کے دور کے تھے مگر آپ کی غذا سوکھی روٹیاں اور نمک ایلو تر کاری تھی حضرت نظام الدین کے ذمے بابا فریدالدین اور ان کے مریدوں کے لئے سالن پکانے کا انتظام تھا۔ ایک دن پیر و مرشد کی محبت سے بے قرار ہو کر آپ نے ٹرونس بیچنے سے نمک قرض لے کر سالن میں ڈال دیا۔ حضرت بابا پہلا نوالہ منہ میں لیتے ہوئے اچانک رک گئے اور فرمایا آج میرا ہاتھ کچھ بھاری معلوم ہوتا ہے یہ سالن کس نے پکایا ہے؟ محبوب الٰہی نے ساری حقیقت بیان کر دی۔ بابا نے ناراضگی سے فرمایا "درویش

فاقے سے مرنا گوارا کر لیتا ہے مگر کسی سے قرض لینا گوارا نہیں کرتا۔ پھر آپ نے حکم دیا کہ "آج کا کھانا فقیروں میں تقسیم کر دیا جائے۔" محبوب الٰہی پر اس واقعہ کا بہت اثر ہوا۔ کچھ عرصہ بعد حضرت بابا کے حکم سے محبوب الٰہی دہلی تشریف لائے اور غیاث پور میں قیام فرمایا۔ آپ کے ساتھ آنے والے فقراء کی تعداد چالیس تھی۔

آپ کا یہ معمول تھا کہ دن رات پنج وقتہ نماز کے علاوہ نوافل کا اہتمام کرتے۔ مریدوں کو درس قرآن و حدیث دیا کرتے قائم اللیل بھی تھے جس میں گریہ وزاری ہوا کرتی۔ صبح سے شام تک آپ کے دروازے پر ضرورت مندوں کی بھیڑ لگی رہتی لیکن کوئی شخص آپ کے در سے خالی نہ لوٹتا۔

> **حضرت محبوب الٰہی کے عرس شریف کی تقاریب کا آج سے آغاز ہو رہا ہے**

محبوب الٰہی ہندوستان کے سب تاجدار ان کا بادشاہ تھے۔ دہلی کے امیروں اور وزیروں کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی ہے کہ آپ کی صحبت میں بیٹھیں۔ مگر آپ انہیں سخت ناپسند فرماتے۔ علاؤالدین خلجی جیسا بادشاہ بھی آپ کی قدم بوسی کیلئے ترستا رہا۔ جب بادشاہ کا اصرار بہت بڑھا تو اور قدم بوسی کے لئے درخواست بھیجی تو آپ نے جواباً لکھ بھیجا کہ "فقیر کے گھر کے دو دروازے ہیں تو ایک سے داخل ہوگا تو میں دوسرے سے نکل جاؤں گا تو اور زیادہ تنگ کرے گا تو تیرا ملک چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ خدا کی زمین تنگ نہیں ہے۔" شہنشاہ نے یہ جواب پاکر اپنا ارادہ ترک کر دیا اور دعا کی درخواست بھیجی تو آپ نے کہلا بھیجا کہ "مجھے یہاں آنے کی ضرورت نہیں عدل و انصاف سے حکومت کرتا رہ میں تیرے لئے دعا کرتا رہوں گا۔"

ہندوستان میں چند بادشاہ ایسے بھی گذرے ہیں جنہوں نے اپنے اقتدار کے نشے میں چور ہو کر آپ کو تکالیف دیا کرتے۔ انہیں بادشاہوں میں غیاث الدین بلبن بھی ایک تھا۔ مصاحبوں کے مشورہ پر اس نے آپ کے خلاف سازشوں کا جال بچھانا شروع کیا تو ایک دن اچانک سلطان بلبن کا پیشاب رک گیا۔ شاہی طبیبوں نے لاکھ کوشش کی مگر علاج نہ ہو سکا اور بلبن پر نزع کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ سلطان بلبن کی اس حالت کو دیکھ کر سلطان کی ماں محبوب الٰہی کی خدمت میں حاضر ہوئی اور بہ ہزار نامیدی زار و قطار گریہ و زاری کے ساتھ عرض کیا کہ میرے بیٹے کے لئے دعا کریں۔ حضرت نے فرمایا کہ جب وہ ہندوستان کی بادشاہت میرے نام لکھ کر اس پر دستخط کرا دے تو میں اس کے لئے دعا کروں گا۔ بادشاہ تکلیف سے مجبور ہو کر دستاویز لکھ دیا اور حاضر کیا تو آپ نے خلیفہ بنا کر اس کی ماں کو دیا اور کہا کہ "اس کو طشت میں رکھ کر بادشاہ کو پیشاب کراؤ" ماں نے ایسا ہی کیا اور سلطان بلبن کو اس اذیت ناک تکلیف سے نجات مل گئی۔ تو بلبن معافی مانگنے کے لئے آپ کے حضور میں حاضری دی اور کہا کہ معاہدہ کی رو سے بادشاہت آپ کے حوالے کرنے آیا ہوں۔ حضرت نے فرمایا جس بادشاہت کی قیمت انسانی پیشاب کے برابر ہے اور ایسی شئے جو پیشاب کی طرح غلیظ ہے مجھے دینے آئے ہو؟ جا اپنا کام کر اور خدا کی مخلوق کو ستانے سے باز آ۔

ایسے ہی بادشاہوں میں ایک غیاث الدین تغلق بھی تھا۔ اس نے بنگال کی مہم پر روانہ ہوتے ہوئے محبوب الٰہی کو حکم بھیجا کہ میرے بنگال سے لوٹنے سے قبل دہلی خالی کر دیں ورنہ انجام برا ہوگا۔ حضرت نے بادشاہ کے خط کی پشت پر لکھا "ہنوز دلی دور است" (ابھی دلی دور ہے)

بنگال کی مہم سے فارغ ہو کر غیاث الدین تغلق دلی واپس لوٹا تو دہلی میں فتح کا جشن منانے کے لئے اس کے بیٹے جونا خان نے جشن کے لئے ایک محل تعمیر کروایا۔ جوں جوں بادشاہ دلی کے قریب آتا تھا مریدوں کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی مگر آپ مسکرا کر بار بار یہی کہا کرتے تھے کہ "ہنوز دلی دور است" غیاث الدین تغلق جشن میں شرکت کرنے کیلئے محل میں داخل ہوا ہی تھا کہ اچانک سارا محل زمین بوس ہو گیا اور اس کے ساتھی بھی ملبے میں دب کر ہلاک ہو گئے۔ حضرت نظام الدین نے ۱۸ ربیع الثانی ۷۲۵ھ مطابق ۱۳۲۵ء میں انتقال فرمایا اور غیاث پور کی خانقاہ میں سپرد خاک کئے گئے اب اسی جگہ بستی نظام الدین آباد ہے۔ بے شمار لوگ آپ کے مرید تھے لیکن آپ کو سب سے زیادہ محبت امیر خسرو سے تھی اور انہیں کو آپ نے خلیفہ بنایا تھا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اوقافِ جامع معروف (رجسٹرڈ)

۱۵۱، جمعہ مسجد روڈ، بنگلور ۵۶۰۰۰۱

AWKAF-E-JAMEA MAROOF (R)

151, Juma Masjid Road, Bangalore - 560 001

مدرسہ عربیہ شاہ ولی اللہ
احاطۂ مسجد جمیل
ٹیانری روڈ، بنگلور

مسجد جمیل
(مکان کی مسجد)
احاطۂ قبرستان جدید، ٹیانری روڈ، بنگلور

مسجد معروف
(لال مسجد)
۱۵۱ جمعہ مسجد روڈ، بنگلور

Ref :

Date : 26/2/92

مخدوم ومکرم جناب ڈاکٹر محمد ضعیف اللہ صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آج کے روزنامہ سالار میں احقر کے مضمون بعنوان "مسجد کو اصلاح معاشرہ کا مرکز بنائیں" پر آپ کے تفصیلی تبصرہ سے آپ کا تعارف ہوا۔

یہ اللہ عزوجل کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ مجھ جیسے ہیچمدان ذرۂ ناچیز کے مضمون کو اس نے مقبولیت بخشی۔ ساتھ ہی آپ کا بصمیم قلب شکر گذار ہوں کہ آپ نے اپنے گرانبہا تبصرہ کو بغرض اشاعت "سالار" ارسال فرماکر مجھے مشکور و ممنون فرمایا۔ اگر ایک مسجد بھی میری تجاویز پر عمل درآمد کرے تو میں سمجھوں گا کہ میری نجات ہوگئی۔

تعاونوا علی البر والتقویٰ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہر مومن مسلمان کا شعار ہے۔ ہمارے معاشرہ کو خالص اسلامی سانچے میں ڈھالنے کیلئے ضروری ہے کہ ہم وہ قدم اٹھائیں جس پر چل کر ہمارے اسلاف نے ہماری شاندار تاریخ تخلیق کی تھی۔

احقر دوبارہ آپ کا شکریہ ادا کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو

وہیں کا بہترین اجر عطا فرمائے ۔

امید ہے مزاج بخیر ہونگے۔

والسلام

نیازمند

[signature]

ظفر الاسلام ظفر ایم اے (اردو) بی ایس سی ایل ایل بی

سکریٹری اوقاف جامعہ معروف ۔ بنگلور

بمعرفت مارشل فوٹ ویر

۴۱۳، جامع مسجد روڈ ۔ بنگلور ۵۶۰۰۵۱

ZAFRUL ISLAM ZAFAR
C/O MARSHAL FOOTWEAR
413, JUMA MASJID ROAD
BANGALORE - 560051.

مورخہ ۱۹ مارچ روزنامہ [illegible] ۱۷ [illegible] میں [illegible] کا مضمون

"مسجد کو اصلاح معاشرہ کا مرکز بنایا جائے" نظر سے گزرا۔ اصلاح معاشرہ کے سلسلہ میں

مسلمانوں نے یہ نیک قدم اٹھایا ہے نہایت ہی ایک اہم مفید اقدام ہے۔ آج جب سے معاشرہ

میں [illegible] رسوم اور اسراف نے سر اٹھایا ہے ان کی روک تھام ضروری ہے۔ قابل

مبارکباد ہیں وہ لوگ جنہوں نے اس اقدام میں اپنی انتھک کوششوں سے اس کا [illegible]

[illegible] کیا ہے اور اگر ہر مسلمان اس میں اپنا دست تعاون دراز کرے تو وہ دن دور

نہیں کہ ہم ایک سادہ اور پاکیزہ معاشرہ دیکھ سکیں۔ روزنامہ [illegible] بھی قابل مبارکباد

ہے کہ اس مخصوص اقدام کو لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ خصوصاً [illegible]

کے اس مضمون کو جتنا بھی سراہا جائے کم ہے جو جامع اور پر اثر ہے [illegible] انہوں نے [illegible]

[illegible] وہ قابل غور ہیں اور ان کی روشنی میں چند تجاویز پیش کی ہیں۔ میرا [illegible] ہے کہ

[illegible] اور [illegible] انسان ان سے متفق ہوگا۔ اس ضمن میں اپنے [illegible] کا اظہار

کرنا اور بہتر معاشرے کے قیام میں اپنا دست تعاون دراز کرنا ہر ایک کا لازمی فرض ہے

(۱) ایک تجویز یہ بھی ہے کہ ہر مسجد کا ایک حلقہ یعنی ایک ایریا (Area) مخصوص کر دیا جائے

[illegible] اس کی وجہ سے اس حلقہ میں رہنے والے مسلمان اپنے سارے

مسائل اور [illegible] کو ایک مرکز پر [illegible] کر سکیں گے۔

(۲) [illegible] ایک تحریری دستاویز ضروری ہے جس کے لئے رجسٹر ضروری ہے

[illegible] ہر طبقہ کے لوگوں کا [illegible] ہوگا جس میں [illegible]

[illegible] درج ہوگا۔ [illegible]

[illegible] کا نام بھی رکھا جائے تاکہ [illegible] معلوم ہو سکے۔

(۳) [illegible] کے [illegible] میں ان [illegible] کا ہونا ضروری ہے جو خدمت خلق کے جذبے سے معمور ہوں

اور ہر وقت ملت کے لئے اپنی ایثار و قربانی کے لئے تیار رہیں۔

(۱۴) ہر مسجد میں بیت المال کا قیام لازمی طور پر ہونا چاہیے۔ یہ ادارہ حلقہ کے ہر شہری کی معاشی حالت کے لیے ریڑھ کی ہڈی کا کام کر سکے گا۔ بشرطیکہ حلقہ کا ہر شہری اپنے صدقات خیرات نیز واجب زکات چرم قربانی و عشر وغیرہ لازمی طور اسی حلقہ کی مسجد کے بیت المال میں ایماندارانہ طور پر پہنچا دے۔ اس کے لیے ایک کمیٹی کی تشکیل ہو جانی چاہیے۔ اور کمیٹی کے ارکان حلقہ کے ہر گھر میں ایک منی بکس گولک پہنچا دیں جس میں گھر والے اپنی استطاعت کے مطابق روزانہ کچھ رقم بطور اللہ کے نام سے ڈالتے رہیں اور نذر و نیاز وغیرہ بھی اسی میں ڈالتے جائیں۔ اور اس منی بکس گولک کو بیت المال پہنچا دیں تاکہ یہ رقم ملت کے کام آ سکے۔ بیت المال کمیٹی کے ذمہ داروں کا اب یہ فریضہ بن جاتا ہے کہ وہ ایمانداری اور ضمیر کی بیداری سے اس فنڈ کو اجتماعی مصرف میں لائیں جیسے کہ صاحب موصوف نے نیز مصارف سامنے رکھے ہیں مستحق غربا بیواؤں یتیموں اور معذوروں کی امداد مستحق طلبا و طالبات کے لیے ماہانہ وظائف، ناگہانی حادثات کے شکار ہونے والے لوگوں کی امداد تعلیم اور غریب لڑکیوں کی شادی کا انتظام چھوٹی موٹی تجارت کے لیے قرض وغیرہ۔ میرا خیال ہے کہ اس پر عمل کرنے سے حلقہ کے مسلمانوں کو اپنی معاشی حالت کے سدھارنے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔ بشرطیکہ صاحب استطاعت حضرات اپنے صدقات زکات وغیرہ بیت المال میں جمع کروائیں۔ کمیٹی کے ارکان دانشمندی سے پوری واقفیت حاصل کرنے کے بعد ایمانداری سے کام کریں۔

(۱۵) ادارتی مساجد کے ساتھ مدارس بھی دیکھنے میں آتے ہیں لیکن ہر مسجد کے ساتھ ایک دینی مدرسہ کو لازمی طور پر ہونا چاہیے اور ان میں مستند یا فتہ عالموں کا تقرر عمل میں لایا جائے۔ اس کے ساتھ ہی تعلیم بالغان کا بھی انتظام ہو اور ہر آتی کو اس مدرسہ میں لانے کے لیے رضاکاروں کی خدمات حاصل کی جائیں۔ اس سے حلقہ کا ہر مسلمان علم کی روشنی سے مستفیض ہو سکے گا۔ مدرسہ میں لائبریری ہونی چاہیے اس کے ساتھ ہی میرا خیال ہے ایک دارالمطالعہ کا انتظام بھی ہونا چاہیے۔

(۱۶) شفاخانہ کی تجویز بھی عمدہ تجویز ہے اس حلقہ کے عوام کو شفائی فائدہ پہنچ سکتا ہے

[illegible]

۷ شرعی پنچایت کا قیام اگر عمل میں آیا تو ملت کے مسلمانوں کے لئے یہ بڑی نیک شگونی ہوگی۔ اس میں قرآن اور حدیث کی روشنی میں جو بھی فیصلے دئے جائیں گے مسلمانوں کو ماننا لازم ہوگا۔ کورٹ کچہریوں کے چکر سے ملت کے شہری نجات حاصل کر سکیں گے اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ مسلمانوں کا وقت اور پیسہ دونوں بچ سکتے ہیں۔

۸ نکاح کے متعلق یہ تجویز کہ ہر شہری کا نکاح مسجد میں مسنون طریقے سے ہو۔ یہ تو بڑی بہترین بات ہوگی۔ اس سے طرفین کو جو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جیسے شادی محلوں کو بک کرانے کا انتظام یعنی بارات میں تقریب میں شامل ہونے والے احباب کو تکلیف دینا وغیرہ وغیرہ جیسے کا ازالہ ہو جائے گا۔ مسجد میں آنے والا ہر شخص باوضو ہوگا اور اس تقریب نکاح میں انسانوں کے علاوہ خدا کی پاکیزہ اور برگزیدہ ہستیاں فرشتے بھی شامل ہوں گے اور ان کے ساتھ ہونے والی یہ مجلس نکاح کتنی باسعادت ہوگی۔ یہاں مسنون طریقہ سے نکاح کی تقریب کے عمل میں آنے سے ہمارے معاشرے میں ہونے والے بے جا رسومات اور لہو و لعب حرکتوں سے جہاں ہم چھٹکارا حاصل کرتے ہیں وہیں ہم دولت کا بیش قیمت سرمایہ جو ان باتوں پر بے جا طریقے سے خرچ ہوتا ہے طرفین کو بچ سکتا ہے اور اسی طرح آنے والے مہمانوں کی خاطر تواضع اگر گلاس شربت پر ہو جائے تو کتنا سیدھا سادہ اور پاکیزہ منظر ہماری مسجدیں دکھانے کا موقع ملے گا۔

۹ دفتری نکاح کے ساتھ دفتر منگنی کی تجویز بھی اچھی ہے۔ ملت کے ہر شہری کو اس سے مطلع کر دینا چاہئے کہ طرفین کے لوگ باقاعدہ طور پر دفتر کا اندراج اس دفتر میں کروادیں۔ اس کو لازمی قرار دیا جائے تو اور ہی اچھی بات ہوگی جہاں وہ اقرارناموں پر دستخط کریں۔ میرے خیال سے دفتر نکاح میں اس کا خیال بھی دینا چاہئے۔ جن اقرارناموں پر وہ دستخط کریں گے ان پر پوری طرح سے جب تک عمل پیرا نہ ہوں نکاح خوانی کی اجازت نہ دی جائے اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ طرفین میں یکسوئی اور اطمینان ہوگا اور نو بیاہتا جوڑے کو بھی اطمینان بخش زندگی گذارنے کا موقع مل سکے گا۔ اگر ان شرائط کی پابندی زندگی

کی تجویز کے مطابق اگر لڑکے اور اس کے رشتہ داروں کا سماجی بائیکاٹ اس وقت تک لازمی طور پر کرنا ہوگا جب تک وہ راہ راست پر نہ آجائیں اگر نکاح کے بارے میں پیش کردہ ان شرائط اور تجاویز پر عمل درآمد ہوا تو حلقہ کا ہر شہری بڑی حد تک خود کو اطمینان بخش زندگی گزارنے کا موقع دے سکے گا اور شادی بالکل ہی ایک مذہبی فریضہ بن جائے گی ان تجاویز پر عمل درآمد سے لڑکی اور اس کے والدین اور رشتہ داروں کو سماجی و معاشرتی تحفظ فراہم ہو سکے گا۔ لڑکی کے استحصال کا موقع بھی ختم ہوجائے گا۔

"آج کل کے ماحول میں ہر مسلم کے علاقہ میں دفاع کی تربیت اور تیاری ضروری ہے۔ حلقہ کا ہر نوجوان لگن محنت اور شوق و جوش و خروش سے یہ تربیت حاصل کرے تو ہر نازک مرحلہ پر حلقہ کے لوگ خود اپنے نوجوانوں کی مدد سے اپنا دفاع آپ کر سکیں گے۔ تمام آدمی بھی اچھی طرح واقف ہو جائیں گے کہ مسلمانوں کا سابقہ اچھی بات اپنی ہے بشرطیکہ ہمارے نوجوان اس دفاعی تربیت و تیاری کو حاصل کرنے کی مشق مسلسل کریں اس سے ایک فائدہ یہ ہوگا ہر نوجوان صبح کی نماز پابندی سے پڑھے گا اور خود اپنی صحت بھی بنا سکے گا۔

امید کی جاتی ہے کہ ان تجاویز پر عمل درآمد کرنے کے لئے ہر محلہ متفق ہوگا اور ان تجاویز کو جاری کرنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کے لئے ہر مسلمان اپنا دست تعاون دراز کرے اپنی دنیا و عاقبت دونوں کو سنوارنے میں اپنی مدد آپ کرے گا۔

ڈاکٹر محمد حشمت اللہ
شعبۂ اردو
گورنمنٹ آرٹس کالج
ٹمکور

شعبۂ اردو جامعہ بنگلور کی تحقیقی خدمات

ڈاکٹر محمد صبغۃ اللہ
نمبر ۳۲ امتیاز بلڈنگ فورتھ
کراس ماروتی نائن سی نگر
بنگلور ۔ ۲

۱۹۷۳ء کو جامعہ بنگلور میں شعبۂ اردو قائم ہوا۔ اس کے لیے اہل بنگلور کی کوشش قابل ستائش ہے۔ ۱۹۶۷ء میں اس کوشش کی ابتدا ہوئی جس میں اردو کے نوجوان شامل تھے لیکن ڈاکٹر آمنہ نے یہ کوشش ۱۹۶۴ء ہی میں شروع کر دی جو اس شعبہ کے لیے بنیادی کام تھا۔

ڈاکٹر آمنہ خاتون صدر شعبۂ اردو جامعہ بنگلور (جولائی ۱۹۷۳ء تا دسمبر ۱۹۷۸ء) اس شعبہ کے قیام کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

”بنگلور یونیورسٹی اور حکومت کرناٹک کے ارباب حل و عقد نے اردو کے بہی خواہوں کی کوششوں کو جولائی ۱۹۷۳ء میں بارآور کیا۔ دس سال بنگلور یونیورسٹی میں اردو کا شعبہ قائم ہو گیا۔ ۵۱ میں سے ۲۶ طلبہ کو داخلہ ملا۔ اس شعبہ کے لیے انھوں نے جو کوشش کی اس کے بارے میں لکھتی ہیں کہ:

”۱۱ اگست ۴۳ء سے مہارانی کالج بنگلور..... مہارانی کالج میسور سے تبادلے کے بعد متعین ہوئی۔ اس وقت اردو بولنے والوں کے اپنے کالج نہیں تھے۔ اردو بنگلور کے چند ہی کالجوں میں بحیثیت ثانوی زبان پڑھائی جاتی تھی۔“

ڈاکٹر صاحبہ نے ۶۵۔۱۹۶۴ء میں مہارانی کالج بنگلور میں اردو مینر (MINOR) کی جماعت بنائی۔ یونیورسٹی میں ایم اے کی جماعت قائم کرنے کے لیے طلبہ کو اردو بحیثیت اختیاری مضمون پڑھنا تھا۔ مہارانی کالج میں اردو میجر (MAJOR) کلاس قائم کروانے کے لیے انھوں نے ہفت خوان طے کیا اس کے بعد دشوار ترین کام کافی تعداد میں طلبہ کو آمادہ کرنا تھا۔ اس کے لیے بھی طالبات فراہم کیے۔ ۶۶۔۱۹۶۵ء سے مہارانی کالج بنگلور میں اردو میجر کی جماعت قائم ہوئی۔ طالبات میں کتابیں مفت تقسیم کیں۔ اپنی طرف سے انعام دیے۔ سازگار ماحول پیدا کرنے کے لیے ہر سال اردو کے جلسے منعقد کرواتی رہیں۔ اردو میجر کی قلیل تعداد یونیورسٹی میں اردو شعبے کے لیے کافی نہیں تھی اس تعداد میں اضافے کے لیے انھوں نے حیدرآباد، علی گڑھ، دہلی، لکھنؤ، آگرہ، ناگپور وغیرہ کی کئی یونیورسٹیوں کے ایم۔ اے میں داخل ہونے لگیں

منگوائے اور ان کی بنیاد پر یہ استدلال کیا کہ جب دوسری یونیورسٹیوں میں کسی مضمون کو اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھنے کی شرط نہ ہو تو میسور اور بنگلور یونیورسٹی ہی میں اس پر اصرار کیوں ہو۔ ایک تفصیلی نوٹ حوالوں کے ساتھ فروری ۱۹۶۷ء میں بنگلور یونیورسٹی کے وائس چانسلر جیاراین کو پیش کی۔ انھوں نے اکیڈمک کونسل میں اس کو منظور کروالیا اس تاریخ سے انگریزی، کنڑی اور دوسری زبانوں میں بھی ثانوی حیثیت سے پڑھے ہوئے طلبہ کو ایم۔ اے میں داخلے ملتے ہیں۔ میسور یونیورسٹی میں بھی اس قاعدے کے تحت ۱۹۶۷ء کے بعد داخلے ملنے لگے۔

یونیورسٹی میں شعبے کے قیام کے لیے نصاب کی ضرورت تھی ڈاکٹر صاحبہ نے آٹھ یونیورسٹیوں کے نصابوں کے مقابلے اور موازنے کے بعد اردو ایم۔ اے اور اردو آنرز کا نصاب تیار کیا۔ بورڈ آف اسٹڈیز میں منظوری حاصل کی اور ایم۔ اے کی جماعت کھولنے کی سفارش کے ساتھ بنگلور یونیورسٹی کو پیش کیا۔ ایسی سفارشیں فوراً اکیڈمک کونسل کے سامنے پیش ہو جاتی ہیں، لیکن اردو کے معاملے میں حالات دگرگوں رہے۔ اردو کے شعبے کو قائم کرنے کے لیے کئی ارباب حل و عقد نے وعدہ کیا۔ لیکن اس کو قائم کرنے کا سہرا وائس چانسلر ڈاکٹر ایچ۔ نرسمہا کے سر بندھا جنھوں نے نہایت خوش دلی سے اس شعبہ کو قائم کیا۔ طلبہ اور ڈاکٹر آمنہ خاتون کی کوششیں ثمر آور ہوئیں۔ اس دن سے آج تک یہاں تدریس و تحقیق کا کام جاری ہے۔ بنگلور یونیورسٹی کے نصاب کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہاں طلبہ و طالبات کو ایم۔ اے اردو کے آخری سال میں ایک مقالہ تحریر کرنا پڑتا ہے جس سے ان میں تصنیف و تالیف کی استعداد اور صلاحیت اجاگر ہوتی ہے۔ ان میں سے کئی مقالے زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ایکسٹرنل (EXTERNAL) ایم۔ اے کا کورس بھی ہے جس میں برسر روزگار اور بیرونِ جامعہ کے طلبہ اردو ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحبہ نے ٹیپو سلطان [illegible]

اردو ایم۔ اے میں امتیازی نشانات (پہلا رینک) حاصل کرنے والے طلبہ کو جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر دیا جاتا ہے۔ ۱۹۷۶ء میں پہلا گولڈ میڈل فاطمہ زہرہ بیگم نے حاصل کیا، دوسرے سال مہ نور زمانی بیگم نے یہ میڈل حاصل کیا۔ اس کے بعد سے میڈل کے بجائے مساوی رقم میڈل کے نام پر دی جاتی ہے۔

اردو ایسوسی ایشن کے تحت طلبہ کی تقریری قابلیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے ان تین مقابلوں کا اہتمام کیا گیا ہے۔

(۱) ڈاکٹر ایچ۔ نرسمہا وائس چانسلر بنگلور یونیورسٹی رولنگ شیلڈ بین الکلیاتی اردو مباحثے کے لیے۔

(۲) ڈاکٹر ایم شیخ ڈاکٹر سوامی پرنسپل سنٹرل کالج رولنگ شیلڈ پوسٹ گریجویٹ شعبوں کے طلبہ طالبات کے اردو مباحثے کے لیے۔

(۳) مولوی محمد خاں رولنگ شیلڈ بین الکلیاتی فی البدیہہ تقریر کے لیے۔

شعبے کے ادبی کارناموں میں سالانہ ترجمان شائع ہوتا ہے۔ اوراق بصیرت افروز کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں ”فکر و ادب“ کا مثنوی نمبر شائع ہو چکا ہے اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً منعقد ہونے والے سیمینار، ادبی نشستیں، توسیعی لکچر کے علاوہ ہفت روزہ سیمینار بھی اہمیت کے قابل ہیں۔

اردو میں تحقیق کی روایت کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ طلبہ میں تحقیق کا شعور بیدار کرنے کے لیے اس جامعہ کے شعبۂ اردو میں ایم۔ فل کا کورس بھی قائم ہے جو ایک سال کی مدت پر مشتمل ہے۔ اس طرح طلبہ کو تحقیق کی تکنیک اور طریقہ کار سے واقف کرایا جاتا ہے اس کے علاوہ پی۔ ایچ۔ ڈی بھی ہے۔

جولائی ۱۹۷۳ء میں شعبہ کا قیام عمل میں آیا۔ ڈاکٹر آمنہ خاتون کے ساتھ ڈاکٹر فہمیدہ بیگم کا بھی تقرر ہوا۔ آمنہ خاتون صاحبہ صدر شعبہ تھیں تو فہمیدہ بیگم لکچرر، دو سال بعد ڈاکٹر صوفیہ حیرت کا تقرر ہوا۔ ڈاکٹر آمنہ خاتون کی وظیفہ یابی دسمبر ۱۹۷۸ء کے بعد ڈاکٹر فہمیدہ بیگم کا تقرر بحیثیت ریڈر و صدر شعبۂ اردو ہوا۔ ماہ فروری ۱۹۷۹ء میں ڈاکٹر صوفیہ حیرت بیمار ہوئیں اور یہ بیماری ان کے حق میں جان لیوا ثابت ہوئی۔ شعبۂ

اردو جامعہ بنگلور میں ڈاکٹر فہمیدہ بیگم تنہا رہ گئیں۔ شعبۂ اردو کی ساری ذمہ داری کا بوجھ آپ کے کندھوں پر آن پڑا۔ آپ نے تنہا مسلسل تین سال تک یہ ذمہ داری بڑے سلیقے سے نبھائیں۔ طلبہ اور جامعہ کو کسی شکایت کا موقع نہ آنے دیا۔ ایم۔ اے فائنل والوں کو مقالوں کے عنوانات دیے جا چکے تھے ان کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا ایک کٹھن مرحلہ تھا۔ فروری تا اپریل ۱۹۷۹ء آپ نے اپنی نگرانی میں آٹھ مقالے تیار کروائے اور یونیورسٹی کو پیش کرایا ان کی تفصیل آگے آئے گی۔

شعبہ کی صدارت کے ساتھ ساتھ آپ کو یونیورسٹی کے زنانہ ہاسٹل کی وارڈن کی ذمہ داری بھی سونپی گئی تھی۔ ۱۹۷۹ء میں آپ کرناٹک اردو اکیڈمی کی رکن نامزد ہوئیں۔ ۱۹۸۰ء میں محمود ایاز صاحب کے مستعفی ہونے پر حکومت کرناٹک نے اکیڈمی کی صدارت بھی سونپ دی۔ اکیڈمی کی صدارت کے دوران ڈاکٹر صاحبہ نے اہم اسکیمیں شروع کیں۔ اکیڈمی کے بجٹ میں اضافہ کرایا۔ اکیڈمی کے اشتراک سے ۲۷؍اکتوبر ۱۹۸۱ء میں ترقی اردو بیورو نے کتابت سنٹر قائم کیا۔ آپ نے جن جن اسکیموں کو شروع کیا تھا وہ آج بھی جاری ہیں۔ اکیڈمی سے کچھ اور بہترین کارکردگی کی توقعات وابستہ تھیں کہ آپ کا تقرر ترقی اردو بیورو کی سربراہ کی حیثیت سے عمل میں آیا۔ اب تک وہ ایک محدود دائرہ کار، جامعہ بنگلور اور کرناٹک میں اردو کے فروغ کے لیے کوشاں تھیں لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ آپ اس عہدہ پر فائز ہوئیں اور فروغ اردو کے لیے جو خدمات انجام دے رہی ہیں وہ اظہر من الشمس ہے۔

جولائی ۱۹۸۲ء میں آپ کی جگہ ڈاکٹر عبدالاحد اردو لکچرر کی حیثیت سے مقرر ہوئے۔ ۱۹۸۷ء میں ریڈر بننے کے بعد صدر شعبہ ہوتے پھر چند دن بعد ڈاکٹر محمد نور الدین سعید شعبۂ اردو میں آئے۔ ۸۲ تا ۹۰ء میں جامعہ کے نصاب میں شاید تبدیلی آگئی یا کچھ اور وجہ تھی کہ دوسری جامعات کی طرح یہاں بھی صرف روایتی تدریسی سلسلہ جاری رہا۔ ایم۔ اے کے طلبہ کے مقالے لکھنے بند ہو گئے۔ ایم فل کی ڈگری

بھی بند ہو گئی صرف پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے چھ طلبہ نے داخلہ لیا۔

۱؍دسمبر ۱۹۹۰ء میں ڈاکٹر م۔ ن سعید نے شعبۂ اردو کی صدارت کا جائزہ لیا۔ سعید صاحب کے آنے پر شعبہ میں ایک نئی زندگی لوٹ آئی ہے۔ نصاب کے تحت مقالے لکھے جا رہے ہیں۔ انجمن پھر سے فعال ہو گئی ہے۔ بین الکلیاتی بحث مباحثے، تقریری مقابلے منعقد ہوتے رہیں توسیعی لکچرس کا اہتمام ہو رہا ہے۔ ایک مجلہ نکالنے کی کوشش جاری ہے۔ ایم فل کا کورس بھی مکمل ہو چکا ہے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے کام ہو رہا ہے۔ ۱۷؍جنوری ۱۹۹۱ء کو ڈاکٹر ثمینہ شوکت صدر شعبۂ اردو حیدرآباد یونیورسٹی نے اردو کی ترسیلی لسانیات اور اس کے مضمرات پر ایک لکچر دیا۔ یہ پروگرام نہایت کامیاب رہا۔

شعبۂ اردو جامعہ بنگلور کے تحقیقی مقالوں کے لیے موضوعات کے انتخاب میں ایک تنوع قائم ہے۔ یہاں دیے جانے والے موضوعات ادبی تاریخ کے قابل لحاظ گوشوں کو اجاگر کرتے ہیں اسی طرح اردو نثر و شعری اصناف میں تعلیمی تہذیبی سماجی اور مذہبی اقدار کو پیش کیا گیا ہے۔ خصوصی طور پر دکنی ادب کی فروغ و اشاعت کو منظم طریقہ سے تحقیق کا موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ فن اور شخصیت حیات اور کارنامے جیسے موضوعات پر مقالات پیش ہوئے ہیں۔

آج کے ادبیات میں خصوصی طور پر اردو میں فارغ ہونے پر روزگار کا حاصل کرنا کافی مشکل کام ہے۔ اس جامعہ کے فارغ التحصیل طلبہ بھی اس کا شکار ہیں۔ اس بحران کے تحت طلبہ و طالبات تحقیق میں مجبوراً حصہ لیتے ہیں لیکن تحقیق جیسے اعلیٰ کام کے لیے یہ روّیہ مناسب نہیں۔ یہ کام اپنی وسعت و وقعت کے پیشِ نظر جستجو اور لگن کے ساتھ ساتھ یکسوئی بھی چاہتا ہے۔ جامعات میں علمی تحقیق کے کام کو قوانین کی پابندی کے ساتھ ایک معینہ مدت میں مکمل کرنا ہوتا ہے اس کے تحت ایم۔ فل و پی۔ ایچ۔ ڈی کے طلبہ و طالبات کو سخت محنت کرنی پڑتی ہے۔ جامعہ بنگلور

([illegible])

نے ڈالی تھی۔ "چراغ راہ" کے علاوہ اس ادارے کی سرپرستی میں اقبال پر تنقیدی مضامین کا ایک انتخاب بھی "اقبالیات" کے نام سے شائع ہوا جس میں اقبال کی شاعری کے مختلف گوشوں پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ اقبال کے سلسلے میں یہ ایک معیاری و مستند کتاب سمجھی جاتی ہے کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے طلبہ جو اقبال اسکول سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے لیے یہ کتاب بڑی مفید ہے۔ مگر افسوس کہ یہ کمیاب ہے۔ اس کتاب میں نیاز صاحب کا بھی اقبال پر ایک مضمون ہے "اقبال کے مذہبی وسیاسی افکار" کے عنوان سے اردو ریسرچ اکیڈمی کا مقصد تھا نقد ادب کی اشاعت کرنا اور اسے کم قیمت پر مہیا کرنا، تخریب اخلاق بازاری لٹریچر سے تمام پڑھنے والوں کی توجہ ہٹا کر اسے صحت مند ادب کی جانب مائل کرنا، اردو ادب کے سرمایہ کو فنا ہونے سے بچانا، ہندی، بنگلہ اور اردو ادبیات کے مابین رابطہ قائم کرنا اور اردو کے ریسرچ اسکالروں کی معاونت کرنا نیز علمی تفتیش کو منظر عام پر لانا۔

۱۹۴۹ء میں نیاز صاحب کے ادبی مضامین کا پہلا اور آخری مجموعہ "میزان" کے نام سے شائع ہوا۔ یہ مجموعہ اب نایاب ہے۔ اس کے علاوہ ان کے مضامین مولانا آزاد کالج کے میگزین میں مل جاتے ہیں مثلاً "بے خود بحیثیت شاعر" "یادگار ہارلی" وغیرہ

نیاز صاحب کے عقیدت مندوں اور شناساؤں سے پتا چلتا ہے کہ ان میں ACTIVISM کا جذبہ بے حد تھا جس کی وجہ سے وہ انسانی معاملات میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا کرتے تھے۔ ان کے اندر خدمت خلق کا جذبہ بھی تھا اور وہ دوسروں کی تکلیف میں خود تڑپ اٹھتے تھے اور ان کی یہ اولین کوشش رہتی تھی کہ اس پریشانی کا مناسب حل تلاش کیا جائے جس کی وجہ سے بسا اوقات ان کو کئی کاری ضربیں بھی لگیں لیکن ہمدردی و اخلاص کے اس پیکر کی محبت میں ذرا بھی کمی نہیں ہوئی۔ ایک عمر میں آکر ان کی قوت گویائی مجروح ہوگئی تھی۔ ادبی اور علمی حلقوں میں لوگ صرف اتنا ہی جانتے ہیں لیکن ان کی قوت گویائی پر حملہ کیوں کر ہوا، اس سے بہت کم لوگ واقف ہوں گے۔ دراصل اس کے پیچھے بھی ان کی خدمت خلق کا جذبہ تھا جس کے عوض ان کو صعوبت انتہائی بڑی اور اپنی شگفتہ بیانی سے محروم ہونا پڑا۔ اس سلسلے میں پروفیسر مقبول صاحب نے وضاحت کی کہ "نیاز صاحب مجلسی آدمی تھے اور دوسروں کے کام میں آگے آگے رہتے تھے۔ ان کے مکان کے نیچے والے مکان میں الٰہ آباد کے آل حسن صاحب رہتے تھے۔ اتفاق سے ایک بار وہ اپنے چند سال کے بچے کو گھر میں چھوڑ کر اپنی بیگم کے ساتھ بازار چلے گئے، لوٹے تو کمرے سے بچے کی رونے کی آواز آرہی تھی۔ انھوں نے تالا کھولا تو علم ہوا کہ چٹخنی اندر سے بند ہوگئی ہے۔ نیاز صاحب کو علم ہوا تو دوڑے ہوئے آئے اور کہا کہ گھبرائیے نہیں۔ یہ کہہ کر اپنے کمرے کے برآمدے سے چادر کی رسی نیچے برآمدے میں لٹکائی اور اس کے سہارے کود پڑے۔ نیاز صاحب کو اوپر سے اندازہ نہیں تھا لہٰذا چادر چھوٹی پڑنے پر بلندی سے کودنا پڑا۔ جس سے ان کی ایڑی میں زبردست چوٹ لگی اور وہ کئی ماہ بستر پر پڑ گئے۔ اس چوٹ کا اثر نیاز صاحب کے دماغ پر بھی پڑا اور کچھ دنوں کے بعد ان کی زبان پر فالج کا حملہ ہوا۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ اس کی چوٹ نے ان کی قوت گویائی کو متاثر کیا ہے۔" نیاز صاحب اپنی طرف سے بہت لاپروائی برتتے تھے بستیدہ بازغہ بیگم کے انتقال کے بعد ان کی کمر ٹوٹ سی گئی تھی اور وہ دل برداشتہ سے رہنے لگے تھے۔ اس سانحے سے ان کے اندر لاپروائی حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی اور ان کی زندہ رہنے کی خواہش ختم ہوگئی تھی۔

علاج بھی اپنے عقیدت مندوں اور دوستوں کا دل رکھنے کی خاطر کیا کرتے تھے۔ آخر دنوں میں نیاز صاحب نے محفلوں میں آنا جانا بھی ترک کر دیا تھا اور گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی۔ آخرکار ان کی اپنے آپ سے بے نیازی اور حد درجہ لاپروائی رنگ لائی اور ۲۱ جون ۱۹۹۰ء کو فالج کا دوسرا زبردست حملہ ہوا جس کی وہ تاب نہ لاسکے۔ نیاز صاحب بے ہوشی کے عالم میں اپنے رفیقوں، اپنے شاگردوں کو روتا چھوڑ کر اور ہمیشہ کے لیے اس فانی دنیا سے رخصت ہوگئے۔

●●

امیر خسرو کا ہندوی کلام

پروفیسر گوپی چند نارنگ

قیمت : ۱۳۰ روپے

دیواروں کے بیچ

ندا فاضلی

قیمت : ۹۰ روپے

(بقیہ صفحہ ۳ سے آگے)

میں تحقیق و تنقید کی رفتار میں خوشگوار تبدیلیاں رفتہ رفتہ آرہی ہیں جس کا ان تفصیلات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس جامعہ سے پی۔ ایچ۔ ڈی حاصل کرنے والے امیدواروں میں ڈاکٹر محمد صبغۃ اللہ کو اس جامعہ کا پہلا پی۔ ایچ۔ ڈی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ کل تین پی۔ ایچ۔ ڈی اور آٹھ ایم۔ فل کی ڈگریاں ۱۹۹۲ء کے اواخر تک دی جا چکی ہیں۔

جامعہ بنگلور سے اب تک تین ریسرچ اسکالروں نے اردو میں ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کیں:

موضوع تحقیق	مقالہ نگار	نگراں	سال
(۱) غواصی کی مثنویوں کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر محمد صبغۃ اللہ	ڈاکٹر فہمیدہ بیگم	۱۹۸۹ء
(۲) جنوبی ہند کی متصوفانہ مثنویاں	ڈاکٹر نورانی بیگم	" "	۱۹۹۰ء
(۳) اردو میں تاریخی ناول نگاری	ڈاکٹر محمد اقبال احمد	" "	۱۹۹۰ء

ان امیدواروں نے شعبۂ اردو جامعہ بنگلور میں تحقیقی مقالے داخل کیے ہیں:

موضوع تحقیق	مقالہ نگار	نگراں
(۱) اضطراب سلطانی ادبی و تاریخی مطالعہ	عبدالمناف	ڈاکٹر م۔ن۔ سعید
(۲) بیسویں صدی میں اردو طنز و مزاح	زبیدہ بیگم	" "
(۳) پریم چند کا سماجی تفکر	عارف النساء اے پٹھان	" "

ان امیدواروں کی فہرست جن کے تحقیقی مقالات کا جامعہ بنگلور شعبۂ اردو میں رجسٹریشن ہوچکا ہے ان میں سے چند مقالہ نگار اپنے تحقیقی مقالے عنقریب داخل کرنے والے ہیں:

موضوع تحقیق	مقالہ نگار	نگراں
(۱) محمود خاں محمود حیات و خدمات	سید رفیق	ڈاکٹر عبدالاحد
(۲) امتیاز علی تاج	طاہرہ جبیں	" "
(۳) مولانا اشرف علی تھانوی کی ادبی خدمات	ملہار قیصر	" "
(۴) اردو ادب میں گاندھی ازم	ایوب خاں	" "
(۵) کرناٹک میں اردو تعلیم	ذاکر حسین	" "
(۶) پریم چند اور کرشن چندر کا تقابلی مطالعہ	سید احمد اشفاق	ڈاکٹر م۔ن۔ سعید
(۷) اردو کی ترقی میں قطعہ ملناڈ کی خدمات	سید خلیل احمد	" "
(۸) تواریخ ادب کا تنقیدی مطالعہ	حشمت النساء	" "

ان امیدواروں کی فہرست جنھیں تحقیقی مقالات پر ایم۔ فل کی ڈگریاں دی گئیں:

موضوع تحقیق	مقالہ نگار	نگراں	سال
(۱) تاریخ ادب اردو کا تنقیدی جائزہ (حصہ اول)	حشمت النساء	ڈاکٹر فہمیدہ بیگم	۱۹۷۷ء
(۲) کرشن چندر کے ناولوں میں نسوانی کردار	منور زمانی بیگم	ڈاکٹر آمنہ خاتون	۱۹۷۸ء
(۳) قومی سالمیت اور سر سید	فرزانہ بیگم	" "	۱۹۸۰ء
(۴) احمد اللہ دیوانہ حیات اور شاعری	نصرت زریں	" "	۱۹۸۰ء
(۵) کرناٹک کا اصلاحی ادب	فہیم النساء	ڈاکٹر فہمیدہ بیگم	۱۹۸۰ء
(۶) نذیر احمد اور پریم چند کی ناولوں کا تقابلی مطالعہ	پروین بیگم	" "	۱۹۸۰ء
(۷) رشید احمد صدیقی کی خاکہ نگاری	سروری صدیقہ	ڈاکٹر عبدالغفار شکیل	۱۹۸۱ء
(۸) اقبال اور بچوں کا ادب	زیب النساء	ڈاکٹر فہمیدہ بیگم	۱۹۸۲ء

ان امیدواروں کی فہرست جو ایم۔ فل کے لیے مقالات داخل کر چکے ہیں یا کرنے والے ہیں:

موضوع تحقیق	مقالہ نگار	نگراں
(۱) حضرت نفیس بنگلوری حیات و خدمات	ایم۔ محمد ابراہیم	ڈاکٹر م۔ن۔ سعید
(۲) علامہ اقبال کا دورۂ بنگلور و میسور	ظفر الاسلام ظفر	" "
(۳) ترقی پسند تحریک کا عروج اور زوال	کے۔ بی۔ منیر احمد	ڈاکٹر عبدالاحد

ان طلبہ و طالبات نے ایم۔ اے کے لیے مقالے لکھے اور ڈگری حاصل کی:

موضوع	مقالہ نگار	نگراں	سال
(۱) مقدمۂ شعر و شاعری میں حالی کا شعور اخلاق	بی بیراں	ڈاکٹر آمنہ خاتون	۱۹۷۸ء
(۲) ڈراما انارکلی کا تنقیدی مطالعہ	خدیجہ عبرت	ڈاکٹر فہمیدہ بیگم	۱۹۷۹ء
(۳) قدیم اردو مثنویوں میں منظر نگاری	ملنسار اطہر احمد	" "	"
(۴) پریم پچیسی پر ایک نظر	ممتاز النساء	" "	"
(۵) محمد اکبر الدین صدیقی حیات اور کارنامے	زبیدہ بیگم	" "	"
(۶) رفیعہ شبنم کے ناولوں کا تنقیدی تجزیہ	وجیہہ ناز بانو	" "	"
(۷) میرے بہترین افسانے کا مطالعہ	ثریا پروین	" "	"
(۸) نوکری خوشحالی کا باعث ہے یا ذریعۂ عزت سر سید اور ان کے رفقا کی نظر سے	نگینہ جبیں	" "	"
(۹) کرناٹک کے اردو اساتذہ کی نثری کاوشیں	سید افتخار قریشی	" "	"
(۱۰) اقبال اور ترقی پسندی	ضمیر احمد سرکاد	" "	"
(۱۱) سر سید اور انشائیہ نگاری	عبدالمناف	ڈاکٹر عبدالغفار شکیل	۱۹۸۱ء
(۱۲) سر سید کے اصلاحی کارنامے (ایک تنقیدی تجزیہ)	سی۔ کے غفار، شریف سکندر	" "	"
(۱۳) سب رس کے حروف	آصفہ بیگم	ڈاکٹر فہمیدہ بیگم	"
(۱۴) حضرت حکیم محمد امام امامی حیات و خدمات	نصرت بانو	ڈاکٹر م۔ن۔ سعید	۱۹۹۲ء
(۱۵) قطب مشتری کا تنقیدی مطالعہ	اقبال النساء	ڈاکٹر محمد اقبال احمد	۱۹۹۲ء

ان طلبہ و طالبات کی فہرست جو مقالے تحریر کر رہے ہیں اور ایم۔ اے کی ڈگری لینے والے ہیں:

موضوع	مقالہ نگار	نگراں
(۱) سید احمد ایڈوکیٹ حیات و خدمات	سلمیٰ سلطانہ خانم	ڈاکٹر م۔ن۔ سعید
(۲) ڈاکٹر حبیب النساء بیگم حیات و خدمات	محمد کفایت اللہ	" "
(۳) ضلع کولار کی ادبی خدمات	محمد منظور نعمان	" "

DAILY SALAR B'lore.

۲۲ جمادی الاول ۱۴۱۴ھ | 5 | 8-11-93

اردو مثنوی - مطالعہ و تدریس

ڈاکٹر محمد صبغتہ اللہ پروفیسر و صدر شعبہ اردو
گورنمنٹ آرٹس کالج ، بنگلور

****

مصنف : ڈاکٹر فہمیدہ بیگم
بار اول : ۱۹۹۳
ضخامت : ۳۱۲ صفحات
قیمت : ۱۰۰
ناشر : مصنف
پتہ : ڈی II اے 1 موتی باغ 1 نئی دلی ۱۱۰۰۲۱

ہئیت اور ساخت کے اعتبار سے دوسرے اصناف سخن کے مقابلے میں مثنوی میں زیادہ وسعت پائی جاتی ہے - اس صنف سخن میں اشعار کی تعداد کی قید نہیں ہوتی - اسی سہولت کی بنا پر مثنوی نگار اپنے بیان کو جاری رکھتا ہے - اس صنف سخن میں دلچسپی کا باعث اس کا تسلسل بیان ہے -

اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کے آئینہ میں کسی بھی عہد کی معاشرتی کیفیت حالات وغیرہ کا بآسانی مطالعہ کیا جا سکتا ہے جیسے مذہبی طور طریقہ ' دنیوی روایات ' ملبوسات زیورات ' تیم مذہبی عقائد ' توہمات ' تہوار میلے ٹھیلے ' ادبی رجحانات ' علم و فن کی باتیں وغیرہ - ان سب کی عکاسی ہمیں مثنویوں میں ملتی ہے - نویں صدی کے آغاز سے آج تک جتنی مثنویاں لکھی گئیں ان کا مطالعہ کرنے سے زمانے کے بدلتے رجحانات کے ساتھ ساتھ اس کے بدلتے روپ بھی سامنے آتے ہیں -

دکنی ادب کا ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے خاص کر قدیم مثنوی میرا دلچسپ موضوع رہا ہے - اس وقت میرے پیش نظر ماہر دکنیات ' دکنی ادب کے ایک درخشاں ستارہ محترمہ ڈاکٹر فہمیدہ بیگم صاحبہ ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو نئی دلی کی مثنوی کے موضوع پر ایک اہم کتاب " اردو مثنوی مطالعہ و تدریس " ہے - اس کا سرورق خوبصورت رنگین اور دیدہ زیب ہے - اچھے کاغذ پر نہایت صاف ستھری چھپی ہے - کتاب کے اندراج اپنی زبان حال سے یہ کہہ رہے ہیں کہ مصنفہ کو اس موضوع پر کافی دسترس حاصل ہے -

جہاں تک مجھے علم ہے آپ کی تحقیق کا موضوع مثنوی ہی تھا " ریاست میسور میں اردو مثنوی کا ارتقا " اس مقالے کو مکمل کرنے کے لئے آپ نے بنت عنوان الکلیم لے کیا میسور حیدرآباد اور لندن کے کتب خانوں کے علاوہ بہت سے نجی کتب خانوں سے بھی استفادہ کیا - قدیم اردو مخطوطات سے اردو مثنوی کا ایسا مواد ڈھونڈ نکالا جو آپ سے پہلے کسی کے ہاتھ نہیں آیا تھا - ان میں میراں جی شمس العشاق ' شیخ محمود خوش دہاں کا کلام اہم ہے - کرناٹک کے اہم مثنوی گو شعرا کا کلام جس میں عبد مجید کے ملک الشعرا حسن علی عزت ' شاہ صدر الدین علوالگی ' عارف شاہ قادری اور حسین بن قادر سراوی کا کلام اہم ہے - مندرجہ بالا شعرا کا تذکرہ شاذونادر ہی آپ سے پہلے تفصیلاً کسی نے کیا ہو - ریاست کرناٹک کے شعرا کا تذکرہ جو اس مقالہ میں شامل ہے اس کا علم نہ ہونے کے برابر تھا - ڈاکٹر صاحبہ نے اردو دنیا کو پہلی بار ان شعرا سے متعارف کرایا میسور یونیورسٹی نے ۱۹۷۳ء میں آپ کو اس مقالہ پر ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری عطا کی جس کو ریاست کرناٹک کی یونیورسٹیوں میں اردو کی اولین ڈاکٹریٹ ہونے کا فخر حاصل ہے - دراصل یوں کہنا چاہئے کہ آپ کی یہ تحقیق مثنوی پر ایک بنیادی دستاویز ہے - پھر آپ درس و تدریس کے میدان میں آئیں ساتھ ہی تحقیق کا ذوق و شوق بھی جاری رہا " میسوری اردو اور نے " اس کتاب پر میسور اور بنگلور یونیورسٹیوں نے انعام سے نوازا - پھر " کلاسیکات اردو مثنوی " ترتیب دی - اس کو ایک ریڈی ریکنر کہنا چاہئے جس مثنوی کے بارے میں آپ کو کوئی جانکاری حاصل کرنی ہوتی ہو تو اس کو دیکھ لیجئے پورا ریفرنس مل جائے گا - اب یہ کتاب ہمارے سامنے ہے اور اپنے پروگرام میں آئندہ ایک اور اہم کتاب قدیم مثنویاں ایک مطالعہ منظر عام پر آنے والی ہے -

اردو مثنوی مطالعہ اور تدریس کے ابتدائی اوراق میں اپنی بات میں بتایا ہے کہ اس میں دو باتوں کو مدنظر رکھا گیا ہے -

(۱) طالب علم کو مثنوی کے بارے میں ایسا مواد ملے جس سے کسی حد تک اردو مثنوی کی اہمیت کا اندازہ ہو اور مطالعہ کا موقعہ ملے -

(۲) ہندوستان میں اردو مثنوی کا سرمایہ ابھی تک علاقہ و ادوار یعنی زمان و مکان کے خانوں میں بٹا ہے - ڈاکٹر صاحبہ نے اس تقسیم کو مٹانے اور مثنوی نگاروں کو ایک دھاگہ میں پرونے کی کوشش کی ہے - اردو مثنوی کے تاریخی تسلسل کو واضح کیا ہے اس کے ساتھ ہی جدید و قدیم مثنویوں کے انتخاب کو پیش کیا ہے جو تقابلی مطالعہ کے کام بھی آئے گا - اور کافی دلچسپ بھی ہوگا -

اس کتاب میں جو انتخاب پیش کیا گیا ہے اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کی مثنویوں کو ایک زنجیر میں پیش کرنا تھا - لیکن اس میں انہیں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی امید ہے کہ یہ کمی آئندہ ایڈیشن میں پوری ہو سکے گی -

اس کتاب میں کل پندرہ مثنوی نگاروں کے منتخب کلام کو پیش کیا ہے تو مثنوی نگار اور ان کی مثنویوں کا انتخاب دکن سے ہے -

(۱) حضرت شاہ برہان الدین جانم مثنوی ارشاد نامہ (۲) عبدل بیجاپوری مثنوی ابراہیم نامہ (۳) امین گجراتی مثنوی یوسف زلیخا (۴) غواصی گولکنڈوی (۱) مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال (۲) مثنوی مینا ستونتی (۵) صنعتی بیجاپوری مثنوی قصہ بے نظیر (۶) رستمی بیجاپوری مثنوی خاور نامہ (۷) ابن نشاطی گولکنڈوی مثنوی پھولبن (۸) ملا نصرتی مثنوی علی نامہ (۹) روشن علی سیار گجپوری مثنوی عاشور نامہ اور دیگر مثنوی نگاروں میں اورنگ آباد ' دلی لکھنو وغیرہ کے مثنوی نگار ہیں - جیسے (۱) اسمٰعیل امروہوی مثنوی معجزہ انار (۲) سراج اورنگ آبادی کی تین مثنویاں (۱) مثنوی بوستان خیال (۲) مثنوی سوز و گداز (۳) مثنوی خط بندگی (۳) میر تقی میر دہلوی کی چار مثنویاں (۱) مثنوی در کاسب آغا رشید (۲) در ہجو خانہ خود (۳) مثنوی در ہجو خانہ خود (بہ سبب شدت باراں خراب شدہ بود) (۴) مثنوی کتخدائی بشن سنگھ (۴) مرزا محمد رفیع سودا کی دو مثنویاں (۱) مثنوی در بے نشتی شاہ جہاں آباد (۲) مثنوی دربیان شدت گرما (۵) میر حسن دہلوی مثنوی سحرالبیان (۶) دیا شنکر نسیم لکھنوی کی مثنوی گلزار نسیم -

قدیم مثنویوں کے ثقیل اور متروک الفاظ کے معنی فٹ نوٹ میں دے دیئے ہیں تاکہ مطالعہ کا تسلسل اور دلچسپی قائم رہے - اور یہ اس لئے بھی ہے کہ امتحانات کی تیاری کرنے والے طالب علموں کا مواد کی تلاش میں وقت ضائع نہ ہو بلکہ مزید مطالعہ کا شوق ان میں پیدا ہو سکے - میر حسن ' دیا شنکر نسیم کے وغیرہ مثنویوں کے معنی فٹ نوٹ میں نہیں دئے کیوں کہ زبان جدید ہے -

انتخاب کلام سے پہلے اردو مثنوی کی ابتدا میں لکھی ہیں کہ اس کا آغاز نویں صدی ہجری سے ہوتا ہے اس پر آپ نے ایک خاص نظر ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ زیادہ شہرت جنوبی ہند اور لکھنو و دلی کے بعض مثنوی نگاروں کو حاصل ہوئی -

اقسام مثنوی پر بھی تفصیل نہیں ہے موضوع کے اعتبار سے اس کی موٹی موٹی یہ تقسیم کی گئی ہے - (۱) عشقیہ (۲) تاریخی (۳) سوانحی (۴) متصوفانہ (۵) مذہبی اور (۶) رزمیہ اور یہ تقسیم مرکزی خیال کے تحت صرف مطالعہ کی سہولت کی خاطر ہے دراصل قدیم اردو مثنویوں کے موضوعات بہت گیر ولا محدود ہیں - اس کے کل سرمایہ کا اندازہ لگانا مشکل ہے - اردو مثنوی کا بڑا حصہ مخطوطات کی شکل میں کتب خانوں میں بند ہے - ان مثنویوں کی ادبی و لسانی اہمیت کی بنا پر تاریخ ادب اردو ' اردو زبان و ادب کے ارتقا کی تاریخ ادھوری رہ جانے گی یہی نہیں تہذیب و تمدن کی تاریخ بھی ادھوری رہ جانے گی اس لئے کہ ان مثنویوں میں اپنے عہد کی تحریکوں ' رہنماؤں ' مذہبی پیشواؤں اہم اشخاص راجا مہاراجہ و سلاطین کی زندگی کے مختلف واقعات و حالات محفوظ ہیں -

ناول افسانہ اور ڈرامہ کی طرح مثنویوں میں کردار بھی اہم رول ادا کرتے ہیں ان میں قیاسی حقیقی اور مافوق الفطرت کردار آتے ہیں اور بعض اوقات سمندر ' پہاڑ ' ندی بھی مجسم شکل اختیار کرتے ہیں مثنویوں میں دیو پرستی کا عنصر غالب ہے - مثنویوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ذیلی عنوان کے تحت الگ الگ قصے کہانیاں مرکزی کہانی سے منسلک ہوتے ہیں عام طور سے یہ ذیلی عنوان فارسی میں ہیں ذرا اور وضاحت کے ساتھ آگے آنے والے حکایت کے مرکزی خیال کو اکثر شاعروں نے سرخی کے طور پر ایک شعر میں سمو دیا ہے - اور ان ذیلی سرخی والے اشعار کو یکجا کردیا جائے تو مثنوی میں بیان کردہ کہانی کا خاکہ سامنے آ جاتا ہے -

اس کتاب کے صفحہ ۱۵ سے اردو مثنوی کی تدریس کے اہم نکات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور یہ چار صفحات پر مشتمل ہے - اس میں مثنوی کی تدریس کا طریقہ کار بتایا گیا ہے اور یہ نکات ایک استاد اور طالب علم دونوں کے لئے مفید اور کارآمد ثابت ہوں گے اور ڈاکٹر صاحبہ نے ان نکات کو مختلف مثالوں سے ظاہر کیا ہے مثلاً قصہ کا ماخذ ' تاریخ تصنیف ' محور مثنوی کی مدت ' مثنوی کے نام کی صداقت ' مثنوی میں دیگر اصناف نظم ان میں شامل غزل رباعی قصیدہ وغیرہ کی بحریں ڈاکٹر صاحبہ نے اپنے تدریسی تجربہ کے تحت ان مختلف عنوانات کے تحت مختلف نکات کو واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے - اور گہرے مطالعہ سے ہی طلبا کو مثنوی پڑھائی جا سکتی ہے ڈاکٹر صاحبہ کا کہنا صحیح ہے کہ یہ نکات نہ تاریخ ادب میں ملیں گی نہ تنقیدی مطالعہ کی کتابوں میں - ان نکات کی روشنی میں مزید مطالعہ اور تجربہ ہو تو پڑھنے والے کے سامنے اور نئے نئے نکات اور پہلو سامنے آ سکتے ہیں -

ہر مثنوی کے انتخاب سے پہلے ہر شاعر اور اس کی مثنوی کے بارے میں تعارفی طور پر ایک دو دو صفحات دئے گئے ہیں ڈاکٹر صاحبہ نے قارئین مثنوی کے لئے ایک ان سارے امور کے ذریعہ اردو مثنویات کے بھرپور مطالعہ کے ساتھ تحقیق و تلاش کی بھی دعوت فکر دی ہے - اور اس سرمایہ کا جائزہ لیا ہے -

The Daily Pasban. Bangalore-

25-4-1994

طالبین و سالکین کے لئے گرانقدر تحفے

کتاب :- تذکرہ حضرت رفاعیؒ

مصنف :- شاہ قادری سید مصطفےٰ رفاعی ندوی

قیمت :- 20/-

دوسرا ایڈیشن :- 1992ء

پتہ :- الاصلاح نمبر 25 پہلا فلور عید گاہ کامپلکس، بی یس اے روڈ بنگلور 5 کرناٹک

جملہ صفحات :- 142

تبصرہ نگار :- ڈاکٹر محمد صبغتہ اللہ صدر شعبہ اردو گورنمنٹ آرٹس کالج تمکور

تصوف پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ یہ بے عملی پیدا کرتا ہے - یہ الزام درست ہے اور قدیم بھی تصوف برائیوں کا تدارک کرکے برے کاموں کے لئے بے عمل کر دیتا ہے - تصوف کا علم عمل سے جڑا ہوا ہے - مسائل کو خود ہی اس میدان عمل میں کودنا پڑتا ہے - جس کو دوسرے الفاظ میں تزکیۂ نفس کہا جاتا ہے جس سے پندار وجود کو اخلاق و اخلاص کے راستہ پر گامزن کیا جاسکتا ہے اور اس کے جو طریقے ہیں وہ مجاہدہ کہلاتے ہیں - اسی سبب سے یہ مستقل کوئی مخصوص اعتقادی نظام نہیں کہا جاسکتا کہ یہ ذات کے اندر مسلسل سفر ہے جس کی منزل اخلاق اعلیٰ ہے - اس سفر میں مشاہدات، منازل کے ثمرات ہوتے ہیں جن کی تلخی و شیرینی سے سالک خود ہی آگاہ ہوتا ہے - اس کے تجربات وہ دکھایا بتا نہیں سکتا - تصوف پر بحث لاحاصل اور مضر ہے - فقہی مباحث سے بھی زیادہ کیونکہ اس میں حجابات کے مقصود بن جانے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں -

عوام کی عقیدت اور مریدوں کی ارادت کا انحصار ولیوں کی کرامت پر ہوتا ہے - لیکن کرامت کسی صوفی کا مقصود نہیں ہوتا اور قصداً کرامت کا صدور ہوتا ہے اور نہ کرامت معیار ولایت ہے یہ اخلاص کا انعام ہوتا ہے جو سکرو صحو سے پیدا ہوتا ہے - صوفی کی ذات، ذات ہے تو کرامت کرشمۂ ذات اور ایسا تبھی ممکن ہے جب عبد و معبود کا رشتہ اخلاص سے استوار ہوجائے -

بلاد اسلامیہ میں بیشتر سلاسل طریقت رائج ہیں جن میں قادریہ و رفاعیہ مشہور و معروف ہیں - قادریہ سلسلہ کے بانی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی اور رفاعیہ سلسلہ کے بانی حضرت شیخ احمد کبیر رفاعی قدس سرہما، دونوں معزز ہستیاں ہم عصر بلند پایہ اور کامل تھیں - ان دونوں ہستیوں کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے - ایک دوسرے کا اکرام و اعزاز ہر دو کی مجلسوں میں پایا جاتا ہے لیکن ایک عرصہ کے بعد ان دو سے متجاوز ہوگئے - اس موضوع کی تفصیل ہمیں تریاق المحبین اور فتح المبین اور المعارف المحمدیہ میں ملتی ہیں -

اس مسئلہ پر قابو پانے کے لئے اور دونوں فریقین کو ایک درمیانی راستے پر چلانے کے لئے حضرت سید عبدالرزاق بن حضرت جیلانیؒ نے اپنے قادری طریقۂ اصلاح کے ساتھ رفاعی طریقۂ اصلاح کو اختیار فرمایا میں سے یہاں یہ سلسلہ احمدیہ قادریہ چلا، پھلا پھولا ہے - آج ہندوستان کے مختلف حصوں میں ہزاروں کی تعداد میں اس مسلک کے ماننے والے فقرا موجود ہیں -

ریاست کرناٹک میں اسی خانوادہ کی ایک بزرگ ہستی، محترمی مکرمی فقیر سید مصطفےٰ شاہ الاحمدی القادری عرف چاند پاشاہ المعروف بہ شاہ قادری سید مصطفےٰ رفاعی

آپ، ایک پختہ کار صاحب طرز انشاپرداز، مورخ تاریخ اسلامی، بحر حقیقت کے غواص اور راہ درویشی کے مربی و رہنما، علامہ وقت حضرت شاہ سید ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہ العالی کے شاگرد رشید ہیں - ان کے مجاز و خلیفہ ہیں -

آپ جب دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ کے آخری درجہ فضیلت میں پہنچے تو سند فراغ کے لئے کسی موضوع پر عربی میں مقالہ لکھنا ضروری تھا - طبعاً حضرت جیلانیؒ اور حضرت رفاعیؒ کی دونوں ہستیاں آپ کے سامنے تھیں یہ فیصلہ کرنا محال ہوا کہ ان میں کس پر لکھنا چاہئے - اپنے مربی اور مرشد مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی اور مولانا محمد زکریا صاحب کے ایما پر آپ نے حضرت رفاعیؒ قدس سرہ کو اپنے مقالہ کا موضوع بنایا - اپنے اس مقالے میں آپ نے ان دونوں عظیم ہستیوں کو ان کے اپنے "عطائی مرتبہ، وہبی مقام" پر فائز و قائم رکھنے کی کوشش کی ہے -

عام طور پر سیرت و سوانح میں کسی شخصیت کے تعارف و تذکرہ کا جو طرز تحریر اوائل میں پایا جاتا ہے اس سے بالکل ہٹ کر ایک نئی روش اختیار کرتے ہوئے فاضل مقالہ نگار نے حضرت رفاعیؒ کے معمولات، دینی مشغولیات، مذہبی خدمات، ذاتی اوصاف و کمالات اخلاق و عادات کو خوصی طور پر نمایاں اور اجاگر کیا ہے - تذکرۃ " حالات زندگی اور کرامات بھی پیش کئے ہیں - اصلاً یہ مقالہ عربی زبان میں تھا - لیکن ہندوستان میں اس کے اردو ترجمہ کی ضرورت تھی - حالات کے تقاضوں کے تحت آپ نے اس مقابلے میں کچھ ترمیم و اضافہ کے ساتھ ترجمہ پیش کیا ہے یوں تو آپ کا ارادہ حضرت رفاعیؒ پر ایک مستقل کتاب اردو میں پیش کرنے کا تھا -

حضرت رفاعیؒ قدس سرہ کی متحرک، پاکیزہ زندگی امت اور امت کے ہر طبقہ کے لئے راہ نما ہے - یہی کسی دینی شخصیت پر لکھنے والے کا مقصود ہوتا ہے اور اس

کتاب :- پیکان تکبر

ناشر :- مصنف

قیمت :- =25/

مصنف :- سلطان جمہوری

اشاعت :- دسمبر 1993

پتہ :- محمد سلطان سی کیو اے یل جے سی نگر بنگلور - 6

سلطان جمہوری کا میرے لئے کوئی غیر معروف نام نہیں ہے - قریباً 16,15 سال سے مختلف اخبارات و رسائل میں انہیں پڑھتا آ رہا ہوں - میں نے یہی محسوس کیا کہ وہ اپنی تحریروں کے ذریعہ ہمیں ایک منفرد سماجی شعور سے روشناس کرانے کی کوشش میں جٹے ہوئے ہیں -

ادب میں طنز و مزاح ایک ایسا عنصر ہے جس پر مصنف سماج کی کمزوریوں پر اپنے طنز کے تیر چلاتا ہے اور اس کا مذاق اڑاتا ہے - جب قاری اس طنز و مزاح کو پڑھتا ہے تو محظوظ ہوتا ہے اور طنز کی کڑواہٹ کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا - آپ کی پہلی کتاب "گفتار و خار و گل" اسی عنصر سے پر تھی -

آپ نے یہ دوسری کتاب قارئین کی خدمت میں پیش کیا ہے - اس کتاب میں طنز و مزاح کے عناصر جگہ جگہ موجود ہیں - اس کتاب میں شامل " مضامین میں ایک مضمون بر صفحہ 66 پیکان تکبر ہے یہی مضمون کا محور ہے اور اسی کو کتاب کا نام دیا ہے اور ساری کتاب میں قاری اسے محسوس کرسکتا ہے -

کتاب کے مضامین مختصر ہیں اور اس کے دو وجوہات مصنف نے یہ بتائیں ہیں (۱) وقت اور (۲) مہنگائی -

بہرحال آپ نے ان دونوں کا خیال رکھ کر اردو قاری پر بڑا احسان کیا ہے - وہ اپنے تخلیق کا بصارتی لفوظے کرتے ہوئے قاری کو ایک ایسے موضوع کی طرف لے آتے ہیں جس کی سنگینی سے ساری دنیا دوچار ہے اور اپنے پڑھنے والے کو وہ یہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ دنیا میں جاری اس ظلم و تشدد سے ہم کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں - معرکہ خیر و شر دنیا میں ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا - ایسے میں مصنف کا طرز عمل دانشورانہ ہوتا ہے - وہ انسانی صورتحال کا اسی طرز عمل سے مشاہدہ کرتے ہیں تاہم ان کا ردعمل ایک مصلح قوم کا ہے - ان کا طریقۂ اظہار تجربے کی سچائی اور جذبات کے خلوص سے پر ہے اور اپنے فن میں وہ اس کا بھرپور استعمال کرتے ہیں - ان کے اس فنی رویہ نے ان کو اس مجموعہ " پیکان تکبر " کو ایک رنگارنگ توانائی بخشی ہے - میری طرح دیگر قارئین اکرام بھی اس کو محسوس کریں گے -

ڈاکٹر صبغتہ اللہ

پایہ اور کامل تھا - ان دونوں ہستیوں کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے - ایک دوسرے کا اکرام و اعزاز ہر دو کی مجلسوں میں پایا جاتا ہے لیکن ایک عرصہ کے بعد ان دو مسلکوں کے ماننے والوں میں تو تشویش و تنافر پیدا ہوگیا تنازع اس مسئلہ پر ہوا کہ سردار اولیا کون ہے؟

رفاعی فقرا شدومد کے ساتھ حضرت رفاعی قدس سرہ کو سردار اولیا ثابت کرتے اور مختلف پیروں سے قادری حضرت جیلانی کی سرداری ثابت کرتے - اس مسئلہ میں بڑی افراط و تفریط ہوئی - دونوں فریق نے

سے اور ساری کتاب میں قاری اسے محسوس کرسکتا ہے -

کتاب کے مضامین مختصر ہیں اور اس ... کریں گے -

ڈاکٹر صبغۃ اللہ

اور اس طریقہ سلوک کا نام "احمدی قادری" رکھا - چنانچہ رفاعی فقیر ہونے کے لئے پہلے طریقہ قادریہ میں مرید ہونا لازم قرار دیا گیا

دو صدی پیشتر اس خانوادے کے بزرگ دعوت و تبلیغ اصلاح و ارشاد کے لئے ہندوستان تشریف لائے جس میں سے بیاں تم سلسلہ احمدیہ قادریہ و تبلیغ اصلاح و ارشاد کے لئے ہندوستان تشریف لائے جس

ندوی مدظلہ العالی ندوۃ العلما کے فارغ التحصیل اپنی تحریر و تقریر کے ذریعہ عرصہ دراز سے دین کی خدمت کرتے چلے آ رہے ہیں - آپ تصوف کا منہ بولتا نمونہ ہیں - مولوی بھی اور صوفی بھی - تصوف کے ذریعہ آپ نے اخلاص و عشق پیدا کیا اور جو کام عشق کی طاقت سے اخلاص کی برکت سے ہوسکتا ہے وہ اس کے بغیر نہیں ہوسکتا - آ

حضرت رفاعی قدس سرہ کی متحرک، پاکیزہ زندگی امت اور امت کے ہر طبقہ کے لئے راہ نما ہے - یہی کسی دینی شخصیت پر لکھنے والے کا مقصود ہوتا ہے اور اس شخصیت کو پڑھنے والے کا مقصد بھی یہی ہونا چاہئے -

اس کتاب پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی نے مقدمہ تحریر فرمایا ہے تو شاہ سید عبدالرب صوفی صاحب نے پیش لفظ تحریر کیا ہے اور اس کے علاوہ حضرت محمد زکریا صاحب نے بھی اس کتاب کی اشاعت کے لئے دعائیہ کلمات سے نوازا ہے - اور ان کا گرامی نامہ اس کتاب کی زیب و زینت میں اضافہ کرتا ہے - یہ تینوں چیزیں اصل کتاب سے زیادہ گرانقدر و قیمتی ہیں -

اس کتاب کے جملہ 11 ابواب ہیں جن کی روشنی میں حضرت سید احمد رفاعی قدس سرہ کی حالات زندگی کا ایک مکمل نقشہ سامنے آتا ہے اور مصنف کتاب کی محنت و خلوص کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے - مراجع کتب ظاہر کرتے ہیں کہ ان حالات کو جمع کرنے میں قابل مصنف نے بہت سی قلمی کتابوں سے استفادہ کیا ہے اور نادر کتابوں اور قدیم تذکروں سے بھی بھرپور فائدہ اٹھایا ہے اور اس کا عطر اس کتاب میں اردو داں طبقہ کے لئے پیش کردیا ہے - یوں تو ہماری ریاست کرناٹک بہت پہلے سے اپنے پھولوں اور خوشبودار سامان اور مشام نوازی کے لئے مشہور ہے - اب یہ ایک نیا جانواز اور عطر بیز جھونکا اس طرف سے آپ لائے ہیں -

اس کتاب کے علاوہ اسی سلسلہ کی چند اور کتابوں کا آپ نے ترجمہ کیا ہے اور ان کو ترتیب دیا ہے - (۱) ارشادات رفاعی، (۲) طبقۂ خواص کے لئے رفاعی دستورالعمل، (۳) رموز رفاعیہ، (۴) اللہ کے ساتھ اولیا اللہ کا حال، (۵) مجالس رفاعیہ - یہ کتب حضرت سید احمد کبیر رفاعی قدس سرہ کی ہیں جن کو قابل مترجم و مرتب نے کافی عرق ریزی سے اردو کا جامہ پہنایا ہے - ان کے علاوہ، (۶) دو ہیرے (فاتحہ کا بھید - عرش کا راز)، (۷) ظاہر و باطن (منظوم مجموعہ کلام) کو آپ نے تصنیف و ترتیب دیا ہے -

یہ ساری کتابیں کافی دیدہ زیب و خوبصورت طبع ہوئی ہیں یہ ساری کتابیں کسی بھی تنقید و تبصرہ سے بالاتر ہیں - ان کتابوں کی تصنیف ترتیب اور ترجمہ سے آپ نے عام مسلمانوں پر بالعموم اور رفاعی خانوادہ کے متعلقین فقرا و سالکین و مریدین پر بالخصوص احسان عظیم فرمایا ہے - اللہ تعالیٰ آپ کی اس عظیم خدمت کو شرف مقبولیت عطا فرمائے -

The daily Pasban. Bagalore
2-5-1994

پیاسا شہر پیاسے لوگ

تقریباً دو سو صفحات کی اس کتاب میں ۲۷ افسانے شامل ہیں اور ان افسانوں سے قبل مصنف کتاب ہذا کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے ۲۶ صفحات مستعمل ہوئے ہیں - اور اس سے افسانہ نگار کی شخصیت اور فن کا ایک ہلکا سا خاکہ قاری کے سامنے آتا ہے -

فیاض قریشی آندھرا کے ایک جاگیر دار اور قاضی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں - والدہ محترمہ اقبال النسا مرحوم نے ۲۲ سال تک انہیں اپنے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھایا - وہ صبر و قناعت کا مجسمہ تھیں تو عزم و استقلال اور بلند حوصلگی کا جیتا جاگتا نمونہ انہوں نے اپنی اولاد کی بہترین تربیت کی جس کی وجہ سے ان کے لڑکے فیاض قریشی کو بڑی سے بڑی پریشانی اور مصیبت کو بھی خندہ پیشانی کے ساتھ جھیلنے کا حوصلہ ملا - انہوں نے نہایت کم عمری سے ہی سخت محنت اور جدوجہد کی اور سماج میں اپنا ایک مقام بنایا - اس کے ساتھ ہی اپنے استاد محترم میر جعفر علی صاحب مرحوم نے بھی ان کی ادبی اور سماجی زندگی کو بنانے اور سنوارنے میں کافی اہم رول ادا کیا ہے - جس کی وجہ سے رفتہ رفتہ ان کے دوست احباب کا حلقہ وسیع ہوتا گیا - اور یہ اس کام میں ایک فعال کارکن بن گئے - ان ادبی و سماجی اداروں سے انہیں کافی کچھ حاصل ہوا لیکن بسا اوقات انہیں اپنے دوستوں سے مالی اور ذہنی پریشانی بھی اٹھانی پڑی لیکن دوستی کے حق میں وہ انہیں بہت حقیر سمجھتے ہیں -

فیاض قریشی کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ وہ اپنی قوم اور ملت کے بچوں کو زندگی کے ہر موڑ پر ترقی کرتے ہوئے دیکھیں وہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے دیگر ترقی یافتہ اقوام کے درمیان جاری ملت کے بچے ان کے شانہ بہ شانہ چل کر اس تیز رفتار دور میں ان سے آگے نکل جائیں اور ملت کا سر بلند رکھیں - اسی نیت سے انہوں نے ۱۹۸۳ میں قائم شدہ ملت ایجوکیشنل ٹرسٹ سے وابستگی اختیار کی اور اپنی ملازمت کے بعد انہیں جو کچھ وقت ملتا ہے وہ ملت ٹرسٹ کی ترقی کے لئے دیا کرتے ہیں -

مصنف	فیاض قریشی
سنہ اشاعت	بار اول جنوری ۱۹۹۰
قیمت	....
تبصرہ نگار	ڈاکٹر محمد صبغۃ اللہ گورنمنٹ آرٹس کالج ٹمکور
پتہ	مصنف نمبر ۲۳ جی جی بی لے آوٹ پانچوں مین روڈ گنگا نگر، بنگلور ۳۲ وغیرہ

یہ کتاب کرناٹک اردو اکاڈمی بنگلور کی جزوی مالی اعانت سے شائع ہوئی

فیاض قریشی کا ادبی سفر مضمون نگاری سے شروع ہوتا ہے - پہلا مضمون بادہ غفلت خدارا ہوشیار اب بھی - لکھا آسی رام نگری سے اس پر اصلاح لی - پھر ایک مجرمانہ غفلت جو سرکاری اردو مدارس کی زبوں حالی پر لکھا جو لوح و قلم میں شایع اور یہ سلسلہ اخباروں اور دیگر رسائل سے وابستہ ہوتا گیا - رفتہ رفتہ افسانہ نگاری کی صلاحیت نے ان میں جنم لینا شروع کیا - ان کا پہلا افسانہ بے انتظار، ادب نواز شخصیتوں نے ان کی حوصلہ افزائی کی - اخبار سالار بنگلور کے ادبی ایڈیشن میں ان کا پہلا افسانہ شائع ہوا - اس افسانے کی اشاعت کے ساتھ ہی آل انڈیا ریڈیو بنگلور والوں نے انہیں دعوت دی - اس طرح " رحیم چاچا " افسانہ انہوں نے پہلی مرتبہ ریڈیو کے ذریعہ اردو سامعین کی خدمت میں پیش کیا - اس مجموعہ میں شامل پچھتر فیصد افسانے ریڈیو سے نشر کر چکے ہیں - اور اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں - - ۱۹۹۰ میں کرناٹک اردو اکاڈمی بنگلور کے جزوی مالی تعاون سے آپ نے ان اوراق پریشان کو کتابی شکل دی -

قصہ کہانی انسان کی کمزوری ہے - بچہ ہو یا جوان عورت ہو یا مرد، ادھیڑ ہو یا بوڑھا - ہر ایک کو کہانی سے دلچسپی ہے - اسی باعث اس کا سفر داستان سے شروع ہو کر آج مختصر اور منی افسانوں پر جاری ہے - بادشاہت، جاگیر دارانہ نظام اور آج کے مشینی دور میں بھی کہانی کو مقبولیت حاصل ہے - ایک زمانہ تھا کہ بادشاہ جاگیر دار امیر ادیبوں اور شاعروں کی سر پرستی کرتے تھے - وہ ان کے کارناموں سے خوش ہو کر انہیں ہیرے جواہرات سے تول دیا کرتے تھے - یہ ان کی سرپرستی اور انعام و اکرام سے نوازنے کا طریقہ تھا لیکن آج کے دور میں ادیب اور شاعر کا انعام قاری کی پسند پر منحصر ہے - اور اس کی پسند سے ہی ادیبوں اور شاعروں کے لئے بہت بڑا انعام ہے -

زمانہ دراز سے اچھے اقدار انسانی معاشرے کی ایک حد تک حفاظت کرتے آ رہے ہیں - اور انسان جو دراصل حیوان کی سب سے اعلیٰ نسل سے متعلق ہے اس کو اپنی حیوانیت سے اس کو بے راہ روی سے بچانے کی کوشش کر رہے ہیں - فیاض قریشی بچپن ہی سے ایک سماجی کارکن کی حیثیت سے سرگرم عمل رہے ہیں - زندگی کا بہت قریب سے مطالعہ کیا ہے - اپنی قوت مشاہدہ کی گہرائی سے کام لیکر سماجی برائیوں کو دور کرنے کا حل انہوں نے روایات اور رواجوں میں تلاش کیا ہے - ان برائیوں کو دور کرنے کی ایک مستقل لگن ان میں پائی جاتی ہے - افسانوی ادب پند و نصیحت، تعلیم و تربیت، افہام و تفہیم کے علاوہ انسان کے فطری و سماجی تقاضوں کی تکمیل و سربراہی کرتا آ رہا ہے - فیاض قریشی نے بھی اپنی افسانہ نگاری کو اسی ماحول کی آواز بنا کر پیش کرنے میں لگے ہوئے ہیں تاکہ انفرادی خوشی پر اجتماعی خوشی کو برتری حاصل ہو سکے -

فیاض قریشی کے یہ افسانے جو اس مجموعے میں پیش کئے گئے ہیں ہلکے پھلکے اور مختصر ہیں - اور اپنے مقصد میں بھر پور پائے جاتے ہیں - افسانوں میں پیش کردہ واقعات اور کردار تخلیقی یا ما فوق الفطرت نہیں وہ ہمارے جانے پہچانے ہیں - اور ہمیں روزانہ ان سے سابقہ پڑتا ہے - ان کے افسانوں میں ابہام و ایہام نہیں پایا جاتا - بلکہ یہ ہماری زندگی کے اہم مسائل کی تصاویر پیش کرتے ہیں - جیسے بی بی کی زندگی اور پھر موت سے متاثر ہو کر " مسجد کی چوکھٹ سے ریلوے پل تک " جائیداد کی خاطر آپس میں بھائیوں کا خون خرابہ اور کورٹ کچہریوں کے چکر کاٹتے ہوئے دیکھا تو " پیاسا خنجر " کو کاک رپورٹ کی سازش اور پھر اس میں ملوث اپنے ہی آدمیوں کو دیکھا تو " زخم پکارے گا " - بلاری کے فسادات سے متاثر ہوئے تو " وردی اتار دو " تعلیم یافتہ ہونے کے غرور میں جب ایک گھرانے کی لڑکیاں خوب سے خوب تر کی تلاش میں اپنی عمریں گنوانے لگیں - تو کمزور توحید پرستو، مقدس پیر ہیے اس ... اقدار کو پامال ہوتے دیکھا تو پھانس کا پھندا " لاوا جو پھوٹ پڑا " اور " کالی " جیسے افسانے لکھے - " حسن چارہ گر، پھر کالا نہ کرنا، رحیم چاچا، اب پچھتائے کیا ہوت ہے، ماں جی، جلد باز یہ وہ افسانے ہیں جن کے ذریعہ آپس میں پیار و محبت وفا خلوص اور ہمدردی جیسے جذبوں کو ابھارنے کی کوشش کی ہے -

ادب میں مختلف " ازم " پلتے جاتے ہیں - لیکن وہ کسی سے وابستہ نہیں - خود کشمکش حیات کے نشیب و فراز سے گذر چکے ہیں - معاشرتی برائیاں جو سماج میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل رہی ہیں فیاض قریشی نے ان کا بڑا گہرائی سے مشاہدہ کیا ہے - آج کے دور کے انسانی روح کے اضطراب، انسانی اقتصادی مسائل بے بسی اور تلخیاں جو اس کا مقدر بن چکے ہیں *

Daily
The Pasban - Bangalore
30-5-1994

بوئے گل نالۂ دل

نام کتاب :-	بوئے گل نالۂ دل
مصنف :-	حسرت سہروردی
سال اشاعت :-	1993 دوسرا ایڈیشن معہ ترمیم و اضافہ
قیمت :-	40 روپئے مجلد 55 روپئے
ناشر :-	مصنف
پتہ :-	19 " دامن " خواجہ ملائے ترچناپلی 23
صفحات :-	72
مبصر و نگار :-	ڈاکٹر محمد صبغت اللہ شعبۂ اردو گو. منٹ آرٹس کالج نگ. 2

پروفیسر حسرت سہروردی دکن کے ایک مانوس ادیب و شاعر ہیں - ترچناپلی کے ایک کالج میں شعبۂ اردو کے سربراہ رہ چکے ہیں - گذشتہ تین دہوں سے ترچناپلی کے ادبی و شعری ماحول کو زندگی بخشنے میں کلیدی رول ادا کیا ہے - ان کے مضامین اخبارات و رسائل میں پڑھ کر متاثر ضرور تھا لیکن ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا - سال رواں کے ماہ جنوری کے ایک آل انڈیا مشاعرہ و سیمینار منعقدہ مدراس میں آپ سے ملاقات ہوئی - سیمینار میں خیالات کا سننے کا موقع ملا تو مشاعرہ میں ان کے کلام کو سننے کا موقع ملا ان سے بے حد متاثر ہوا - آپ ایک پختہ کلام شاعر ہیں جنہوں نے ترچناپلی جیسے ... میں رہ کر اردو زبان و ادب میں مختلف رنگ کے عطر بیز پھول کھلائے ہیں - آپ کی درج ذیل تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں - آپ کی پہلی تصنیف تذکرہ شعرائے ... قدیم قلیم نگر مدراس سے 1959 میں شائع ہوئی

١) "کڑل" تامل ادب کا اخلاقی شاہکار - اردو ترجمہ 1965 ⎫ ان دونوں کتابوں کو ساہتیہ
٢) سبر منیم بھارتی - اردو ترجمہ 1990 ⎭ اکیڈمی دلی نے شائع کیا
٣) تامل افسانے - اردو ترجمہ 1971 ⎫ ان دونوں کتابوں کو نیشنل
۴) گوبر جنس تامل ناول - اردو ترجمہ 1977 ⎭ بک ٹرسٹ دلی نے شائع کیا

تامل ادب کے منتخب شاہکار کتابوں سے آپ اردو داں طبقہ کو متعارف کرایا - آج کے اس دور میں علاقائی ادب سے واقفیت ضروری ہے - جنوبی ہند میں خاص طور پر دو لسانی طبقہ پایا جاتا ہے اور اس طرح کے لسانی خدمات سے ایک دوسرے کے ادب سے واقفیت ہوجاتی ہے - حسرت کا یہ کارنامہ ہی کہنا چاہئے کہ انہوں نے یہ گرانقدر ادبی خدمت انجام دی - ہندوستان کے مشہور و معروف اداروں نے ان کی خدمات کا اعتراف ان کی کتابوں کی اشاعت کی صورت میں کیا ہے -

بوئے گل نالۂ دل آپ کا شعری مجموعہ ہے جو پہلی بار شاہکار پبلیکیشنز حیدرآباد نے 1973 میں شائع کیا تھا اور اب اس کا دوسرا ایڈیشن 1993 میں معہ ترمیم و اضافہ شائع ہوا ہے -

اس شعری مجموعہ میں ۲ نظمیں اور ۵۳ غزلیں شامل ہیں - اسی مجموعہ پر سجاد ظہیر (بنے بھائی) نے ۱۶ جون ۱۹۶۰ میں پیش لفظ لکھا جو اس ایڈیشن میں شامل ہے - سجاد ظہیر کی ۱۹۶۳ میں حسرت سے ملاقات ترچناپلی میں ہوئی جبکہ وہ ایک مشاعرہ میں شریک تھے - پہلی نظر کا پیار جس طرح ... ہوتا ہے سجاد ظہیر بھی پہلی ہی ملاقات میں ان سے بہت متاثر ہوئے - ان کے کلام کو سن کر تو وہ ان کے گرویدہ ہوگئے - حسرت سہروردی ایک سنجیدہ شخصیت کے مالک ہی نہیں بلکہ اعلیٰ ظرف صاف ستھرے ادبی ذوق کے مالک بھی ہیں - انہی باتوں نے بنے بھائی کو خاص طور پر متاثر کیا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ آہستہ کلام اور منکسر شخص کتنا اچھا انسان بھی ہے ایک اچھا شاعر ہونے کے لئے یہ صفات بھی ضروری ہیں ... حسرت کی ...

بوئے گل نالۂ دل اس کی اشاعت کے بارے میں جان کر کافی خوشی محسوس کی اور اس پر اپنا پیش لفظ لکھا - حالانکہ حسرت سہروردی کا یہ خیال بس یہ وہ ایک حد تک متفق ہی نہیں بلکہ بڑی مضبوطی کے ساتھ عمل پیرا بھی ہیں - شاعر کو دوام صرف اپنی شاعری ہی بخش سکتی ہے قدر آور شخصیتوں کی تقریظیں زیب داستاں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی - ان سے فائدہ تو نہیں ہوتا بلکہ الٹا نقصان ہوتا ہے - اس سے شاعر کی انا مجروح ہوتی ہے - لیکن بنے بھائی کی خواہش کا احترام ہے ... اس پیش لفظ کو لکھوایا جس میں ان کے خلوص کو دیکھا جاسکتا ہے -

حسرت سہروردی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ نظم نہیں کہہ سکتے - مجموعہ کی پہلی نظم "شاہجہاں کی آواز" تاج محل پر آج تک بہت سے شعرا نے متعدد نظمیں لکھیں - اپنی اپنی دانست کے مطابق کسی نے اس کو منزل رومان سمجھا تو کسی نے والہانہ عشق کی علامت کہا - کسی نے عمارت کی خوبصورتی کو سراہا - تو ساحر نے اسے غریبوں کی محبت کا مذاق کہا لیکن حسرت کا نظریہ ان سب سے بالکل الگ ہے -

یہ میرا تاج محل اور یہ میرا قلعہ
ان کا ہر نقش یہ دیتا ہے گواہی اے دوست
میں نے مزدور کے فن کاروں کو پہچانا ہے
میں نے مزدور کو بخشی ہے حیات جاوید
اور پھر آگے چل کر لکھتے ہیں
میں تو تاریخ کے صفحات میں چھپ جاؤں گا
کون جانے کہ نئی پود مجھے بھول ہی جائے
لیکن اے دوست میرا تاج محل ہے جب تک
جگ فنکار کی عظمت کو نہیں بھولیں گے
لوگ فنکار کے اخلاص کے گن گائیں گے

محنت کی لگن مزدور کا خلوص تھا کہ فن کا یہ نمونہ تخلیق ہوسکا - فنکار کے فن کو ابھار کرنے میں بے شک شاہجہاں کی دولت نے ایک کیٹیلسٹ (Catalyst) کا کام کیا جس سے آج یہ دنیا کی خوبصورت عمارت ... میں شاہجہاں کے ...

جس سے حسرت متاثر ہیں - وہ اپنے آپ کو کسی 'ازم' سے متعلق نہیں کرتے بلکہ انہوں نے سارے 'ازم' کو اپنے آپ میں ضم کرلیا ہے -

حسرت کے کلام میں جہاں اروایتی رومانی اشعار ملتے ہیں وہیں غم جاناں کی روئیداد بھی ملے گی - اور غم دوراں کی تلخیاں بھی اور یہ بھی سچ ہے کہ وہ غم جاناں سے حوصلہ حاصل کرکے غم دوراں کا مقابلہ کرتے نظر آتے ہیں جیسے "تجدید" میں یہ کہا

جب بھی ہوتی ہے میرے پاس تو اے جان حیات
ہوش اتنا بھی نہیں ہوتا کہ میں ہوں کہ نہیں
زندگی اور تسلسل ہی سہی کچھ بھی سہی
چند لمحوں کیلئے خود کو بھلا دیتا ہوں

"محبت" میں قرب نے خود فراموشی کی حالت پیدا کردی - غم محبت دراصل تجدید محبت ہے اور آخری بند میں کہتے ہیں

اب میرے غم کو غم زیست کے پہلو میں نئے
بھی چلا ہوں میں اسی منزل دوراں کی طرف
جس جگہ آدمی انسان سے بیگانہ نہیں
تیری قربت سے میں اب ہوش نہیں کھوتا ہوں

ایک نئے موڑ پر لایا ہے تیرا پیار مجھے
روایتی رومان کی مثال دیکھئے
جانے کیوں میری آنکھ بھر آئی
آج شاید کسی سے ٹکرائی
اور
ایک مدت ہوئی ہے بات ہوئے
بھی کوئی تعلقات ہوئے
ایک تعلق تو ان سے ہے حسرت
ہجر ہو کر یا ہو وصال مجھے

حسرت کی غزلوں میں ان کا موضوع یعنی عشق و محبت ، مشاہدۂ و عرفاں کا دلکش بیان موجود ہے - اس کے ساتھ ہی آج کی ہماری زندگی کے بیشتر اور وسیع مسائل پر ان کا اور پر خلوص تبصرہ ہے اور اسی چیز نے ان کی غزل کو ایک نیا سوز عطا کیا -

تمہاری بزم میں ہوں یا تمہاری بزم سے دور
جہاں جہاں بھی رہیں گے رہیں گے ہم مسرور
نہ زندگی کا سلیقہ نہ زندگی کا شعور
جناب شیخ ہیں اس پر بھی کس قدر مغرور
تمہاری بزم سے اٹھے تو ہوگئے معذور
لبوں پہ مہر لگی ہے تو پاؤں میں زنجیر
تمہاری بزم کا دستور بھی ہے کیا دستور
اس کے علاوہ انسان اور انسانیت پھر ...

ساتھ یہ آواز دیتے ہیں -
زندگی با صد سلامت ، ٹوٹ جائے
اگر پتوار ، تو کچھ غم نہیں ہے
بڑھائے جاؤ مستقبل کی جانب
مزاج زندگی برہم نہیں ہے
اسی خیال کو ایک جگہ یوں پیش کرتے ہیں
دیکھو جہاں ہار گیا
ہمت والے اور بلند
عظمت انساں کے صدقے
چاندوں پر پڑتی ہے کمند

زندگی منزلوں کا ایک لامتناہی ... ہے اس میں تسلسل بھی ہے اور ارتقا بھی ... اے دنیا کے رہبرو اے اہل سیاست ... تو ، تم نے کیا کیا اپنی خاطر دنیا میں چھوڑے ہیں
اور یہ چیلنج دیکھئے
بھولی بھولی موجوں کو اے دوست نہ دیکھ حقارت سے
ان موجوں نے بھی اکثر طوفاں کے رخ موڑے ہیں

ان اشعار میں لفظ 'دوست' کے طنز تخاطب کو دیکھئے اور بھولی موجوں کی طاقت کو محسوس کیجئے -

حسرت میر سے صرف متاثر ہی نہیں بلکہ ان کے مطابق میں نے میر کے رنگ کو حسرت ایک نیا انداز دیا ہے اور حسرت نے میر کو ایک نیا انداز ہی نہیں ایک نیا مواد بھی دیا ہے
رشتے ناطے ٹوٹ گئے
ظلم کی بات چلی
تم نے کوئی بات نہ کی
بات آئی تو بات چلی

حسرت کے کلام میں اس سے بھی زیادہ آپ کو پڑھنے کو ملے گا جس میں یاسیت ، درد و الم ، انسان کی بے بسی ، دنیا کی بے اعتباری یہی چیزیں ان کی شاعری کے محرک ہیں - سبک ہندی الفاظ کے استعمال کے علاوہ بیان کی شوخی اور خیال کی ندرت نے ان کے کلام کو شگفتہ بنادیا ہے - ان کی شاعری میں دردمندانہ صدا بھی ملے گی - حسرت کی غزل کے چند اشعار پر اپنی بات ختم کروں

کچھ تیری کہانی ہے کچھ میرا فسانہ ہے
دنیا سے کہتے ہیں بس اس کے سوا کیا ہے
اور ہر ایک کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ
دیکھو نہ حقارت سے ہم خاک نشینوں کو
تہذیب نے پالا ہے، تاریخ نے سینچا ہے
اور اس خیال سے ہر ایک متفق ہونا پڑے گا
شکوہ نہ شکایت ہے دنیا سے مجھے حسرت
دنیا نے بھلا کس کو خوش ہوتے دیکھا ہے

حسرت کے کلام کی طرح کتاب بھی بہت اچھی چھپی ہے - عمدہ کاغذ اچھی کتابت مجلد خوبیاں ہیں جو کتاب کی خوبی میں چار چاند لگاتی ہیں -

Part I The Daily Pasban - Bangalore

27-6-1994

نئی نسل کے نام علامہ اقبال کا پیغام

ڈاکٹر محمد صبغت اللہ
نمبر 4/2 امتیاز باڈ نگ
فورتھ کراس
مار پا گارڈن، جے سی نگر،
بنگلور

اقبال کا تعلق نئی نسل سے بہت گہرا ہے۔ اس کا اندازہ ان نظموں سے بھی کیا جاسکتا ہے جو انہوں نے شاعری کے ابتدائی دور میں بچوں اور نو عمروں کے لئے کہی ہے۔ سیرت تعمیر کے سلسلے میں "بچے کی دعا" کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ بچہ بارگاہ ایزدی میں اپنی تمنا لئے ہوئے دست بہ دعا ہے کہ وہ کبھی شمع کبھی آفتاب، کبھی خوشبو، کبھی بلبل کبھی پھول اور کبھی پروانہ بننے کی تمنا کرتا ہے وہ دعا کرتا ہے کہ اس کے ہاتھ سے کسی جاندار کو تکلیف نہ پہنچے۔ ضعیفوں دردمندوں اور غریبوں کی مدد کرنا اس کا شیوہ ہو۔ دکھ سے پریشان ہو کر کبھی حرف شکایت زبان پر نہ ہو۔ بلکہ ہر حال میں شکر گذار ثابت ہو ان تمام صفات کی تمنا کرتے ہوئے بچہ دعا کرتا ہے کہ خدا اسے بھی گمراہ نہ کرے۔ بلکہ صراط مستقیم پر چلائے جو دینی تعلیمات میں سے ہے۔

ہمدردی اور ایک دوسرے سے بھلائی چاہت کا جذبہ "ہمدردی" میں کار فرما ہے۔ جو اپنے ساتھی کی بے بسی کے وقت پر خود کو روشن کر کے رات کی تاریکی کو دور کر کے منزل مقصود تک پہنچانا دنیا و آخرت میں ناموروشن کرتا ہے۔

چاپلوسی اور خوشامدی سے کسی کو بہلا پھسلا کر اپنی غرض پوری کرنا کسی کی زندگی کو ختم کر کے اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کا کام اچھا نہیں ہے۔ اس طرح اقبال نے خود غرضی کو برا بتلاتے ہوئے دوسروں کو اپنا شکار بنانے کے بجائے خودی اجاگر کرتے ہوئے سوت کو ترجیح دی ہے۔ خوشامدی اور چاپلوسی سے دوسروں کو دھوکہ دینے سے گریز کا سبق "ایک مکڑا اور مکھی" میں دیا ہے۔

عملی زندگی پر ترجیح دیتے ہوئے بتلاتے ہیں کہ قوت عمل ہی زندگی کا اصل سرچشمہ ہے۔ قد و قامت نہیں "ایک پہاڑ اور گلہری" نظم کے ذریعہ یہ پیغام دیا ہے

انسان زمین پر خدا کا نائب ہے۔ انسان سے گلہ اور شکایت بے جا ہے اس کا وجود ساری مخلوق کے لئے باعث رحمت ہے۔ اپنی ناتجربہ کاری کے سبب دوسروں پر الزام عائد کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ سوچ سمجھ کر کام کریں۔ اس طرح سبق آموز واقعات "ایک گائے اور بکری" اور "کوؤں کی مجلس" میں پیش کئے ہیں [illegible]

دونوں غیر مطبوعہ ہیں)

حب الوطنی، آزادی سے لگاؤ، غلامی سے نفرت پیدا کرنے والی نظموں میں "ترانۂ ہندی"، "ہندوستانی بچوں کا گیت" اور "پرندہ کی فریاد" میں یہ جذبات پائے جاتے ہیں۔

حد سے بڑھتی ہوئی دنیاوی محبت ترقی کی راہ میں رکاوٹ کا باعث بنتی ہے ماں جو خواب کے عالم میں اپنے بچے کو دیکھتا اور وہ بھی بجھا ہوا دیا تھامے ہوئے سب سے پیچھے چلتا پھر دیا بتا کر ماں سے یہ شکایت کرتا کہ آپ کے آنسوؤں سے بجھا ہوا یہ دیا میرے لئے بھلائی کی راہ نہیں بتا سکتا۔ ابدی زندگی ہی سب کچھ ہے اور زندگی کا آغاز دراصل یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ اور اس کے لئے رونا دراصل زندگی کی ترقی میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ یہ تمام باتیں نظم "ماں کا خواب" میں سمجھائی گئی ہیں۔

ہر شئے میں خدا کو تلاش کرنے والوں کو خدا کا حسن بھی یعنی حسن ازل کی ارزانی اتنی عام ہوئی کہ مظاہر فطرت میں اس حسن ازل کی بوقلمونی نظر آنے لگی۔ ہر چیز حسن ازل کے نور سے معمور دکھائی دینے لگی۔ اقبال کو بھی ہر چیز میں اسی حسن ازل کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ غرض اس حسن ازل کی ارزانی عام ہے۔ کائنات کی ننھی سی اشیا سے لیکر بڑی سے بڑی چیز میں اس حسن کا پرتو موجود ہے۔ ہر چیز حسن ہے اسی وجہ سے عالم کائنات میں دلکشی اور رعنائی اپنے نقطۂ کمال پر ملتی ہے۔ علامہ اقبال نے یہ خیالات "جگنو" اور "ایک پرندہ اور جگنو" میں پیش کئے ہیں۔ طاقتور کو کبھی کمزور پر حاوی نہیں ہونا چاہئے۔ جگنو اور پرندہ کو اللہ تعالیٰ نے سوز و ساز عطا کیا یہ ایک دوسرے کے مخالف نہیں بلکہ دوست ہیں۔ انہیں دو پہلوؤں سے کائنات قائم ہے۔ مناظر فطرت کی مصوری کے ساتھ ساتھ اتحاد و اصلاح کا جوش و جذبہ بھی موجود ہے۔

اقبال نے بچوں کے لئے جو نظمیں کہی ہیں اب ان کا دوسرا رخ دیکھئے کہ اس کے در پردہ وہ بڑوں کو کیا نصیحت کر رہے ہیں۔ اور اس میں کیا پیغام دیا ہے۔

"بچے کی دعا" اس نظم میں اقبال کہتے ہیں کہ جب تک انسان خود کو نہیں سمجھتا خدا کو نہیں پہچانتا اور جب تک خدا کو نہیں پہچانتا وہ بچہ ہی رہتا ہے۔ اقبال کی [illegible] انسان روح کو پہچانے [illegible]

پیدائش سے دنیا کا اندھیرا دور ہو جائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ میری زندگی غریبوں کے لئے وقف ہو اسی عبادت مجھوں کا۔ اور اس کو آخرت کی پونجی بھی۔ بچہ بذات خود ایک خواہش ہے جو آخر تک سوچتا رہتا ہے۔ خدا جس سے محبت کرتا ہے وہ تقدیر بناتا ہے۔ اگر خدا اپنے معزز بندوں کو نوازتا ہے تو وہ اس کے پیغام کو پہنچانے میں کوتاہی نہیں کرتے۔ اقبال خدا کا پیغام پہنچاتے ہیں تو بچے کی خواہش کی مدد سے جیسے بچے کی تمنا ہوتی ہے۔

نظم "ہمدردی" اس نظم میں اقبال کا پیغام یہ ہے کہ کائنات کے موجودات کو ہم اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ ہم اپنی ہستی کے موجودات کو نہیں سمجھتے۔ تمام وہ راز جو خدا کی ہستی میں ہیں وہ انسان کی ہستی میں ہیں۔ اقبال نے ہستی کو انسان کی ہستی کی ایک شاخ سے تشبیہ دی ہے۔ جس پر ایک بلبل جس طرح کہ جس کی خاصیت ہمیشہ دنیاوی پریشانیوں میں مبتلا رہنا ہے جب اس کی سانس قریب ختم ہوتی ہے تو اسے اس وقت احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنی ساری زندگی بیکار گزار دی۔ آخرت کی پونجی حاصل نہ کی۔ یہی اداسی رات کی تاریکی معلوم ہوتی ہے۔ انسان کی روح انسانی میں پوشیدہ ہے جیسے رات کے اندھیرے میں جگنو روشن معمولی سا شعلہ ہے لیکن اس کے باوجود زندگی سے مایوس ہستی کو راہ راست پر لاتی ہے۔ خدا نے روح کو اس روشنی سے آراستہ کیا جس سے وہ ہستی کو صراط مستقیم پر لاتی ہے۔

نظم "ایک مکڑا اور مکھی" میں شاعر روح اور نفس کی گفتگو کو پیش کرتے ہوئے بتایا ہے کہ نفس اور روح میں کیسے فرق ہے۔ نفس ان خواہشات کو کہا جاتا ہے جو لاشعور سے پیدا ہوتی ہیں۔ روح وہ قوت ہے جو خدا کے صفات سے قوت پاتی ہے۔ جب روح انسانی خواہشات کی آرزو کرتی ہے تو اپنی حقیقت کو بھلاتے ہوئے کہتی ہے کہ یہ دنیا کیسی اور کہ دنیا اس لئے کہ جب انسانی نفسانی خواہشات میں پھنس جاتا ہے تو اس جال سے نکلنا مشکل ہے جو نہایت ایک گورکھ دھندا ہے۔ اور جب ہم اپنے اچھے ہیں تو راز کھلتے جاتے ہیں۔ اور انسان کو خود اندازہ اس کا پتہ چلتا جاتا ہے۔ انسان کا نفس ہوش میں ہو کا پتہ چلتا ہے۔ اور روح ازلی

نازل ہے کہا جاتا ہے۔

نظم "ایک پہاڑ اور گلہری" میں شاعر کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ہر چیز میں قدرت کا راز پوشیدہ ہے اس لئے کسی چیز کو حقیر سمجھنا اپنے آپ کو حقیر سمجھنے کے برابر ہے۔ گلہری کا مفہوم انسان سے لیا گیا ہے۔ انسانی ہستی کتنی ہی ادنیٰ کیوں نہ ہو اگر اس میں قلندرانہ شان آجائے تو وہ ساری کائنات پر چھا جاتی ہے۔ انسانی ہستی ذرہ بھی بن سکتی ہے۔ اور پربت بھی چھوٹا بڑا دراصل اس کی حکمت ہے۔

نظم "گائے اور بکری" میں انسان کی عظمت پوشیدہ کو ظاہر کیا ہے۔ انسانی اور حیوانی کے قانون الگ الگ ہیں۔ آزمائشوں کا فعل حقیقت ہے اس کے ہر فعل کو الٰہی طور پر قبول کرنا چاہتا ہے۔ اگر وہ بے کار رہتا ہے تو قوم کے رات اور دن میسر نہ آتے۔

نظم "ماں کا خواب" میں انسان کے جسم فانی کی حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔ انسان جب نیند میں ہوتا ہے تو اس کی روح اس کے جسم سے پرواز کر جاتی ہے۔ اسے نیند کے اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اس اندھیرے میں اس کا رواں رواں کانپ جاتا ہے۔ اقبال کا کہنا ہے کہ روح آخرت کے اور ہے تو جسم میں قوت نہیں ہوتی۔ اس کے ہاتھ کی مشعل بجھی ہوئی ہے اور وہ یہ نہیں چل سکتا۔ ساری زندگی ضائع ہو جاتی ہے۔ اگر ماں روحانی اور جسمانی خواہشات پر قابو پالے۔ روح کو ترقی لاتی تو آج اسی منزل کی طرف رواں ہوتی بجائے رواں دواں ہیں۔

نظم "پرندے کی فریاد" [illegible]

[illegible]

علامہ اقبال کا پیام

از: ڈاکٹر صبغت اللہ

علامہ اقبال کو علم سے گہری دلچسپی تھی - والدین اور اساتذہ کی تربیت کے فیض سے اخلاقی اقدار پر ان کا پختہ یقین، اقبال کی شخصیت کے یہ دونوں عناصر ترکیبی تھے - جوں جوں اقبال نے منزلوں کو طے کیا ان کے فکر و احساس کی قوتیں ایک ہی نقطہ پر مرتکز ہوتی گئیں - اور ان کا واحد مقصد مسلمانوں میں اسلام کی تعلیمات عام کرنا بن گیا -

اقبال کے خیال میں موجودہ نظام تعلیم اپنے مقصد میں بالکل فضول رہا ہے - اور وہ ایسی نسل کو تربیت نہیں دے سکا جو اپنی معلومات سے فائدہ اٹھاتی اور زندگی میں ہم آہنگی پیدا کر کے ایک صالح معاشرہ کی بنیاد رکھتی بلکہ اس کے برعکس وہ افریقہ اور قطب شمالی کی نا معلوم سرزمین سے واقف اور حیوانات سے آگاہ ہے - لیکن انسانیت کی پہچان اور خودی کے قطعاً غافل! برق و نجارات، ایٹمی و جوہری توانائی اور نیو کلیائی طاقت کا پتہ اس نے لگالیا لیکن اپنی طاقت کا اندازہ اسے نہیں ہوا - دنیا کو مسخر کر لیا لیکن خود پر قابو نہیں پاسکا - یہ سارا قصور نظام تعلیم کا ہے جس نے اس کا توازن غلط اور مزاج فاسد کر دیا ہے - چنانچہ وہ لکھتے ہیں :-

" یہ عجب بات ہے کہ شعاع شمسی کو گرفتار کرنے والا اپنا مقدر نہ چمکا سکا، نظام سیارگان کو جلنے والا کسی راہ عمل پر نہیں پہنچ سکا اور سائنس کا محقق اپنے نفع نقصان کو بھی نہیں سمجھ سکا " -

اقبال کے فکر و فن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی توجہ "کیا ہے" سے زیادہ "کیا ہونا چاہئے" پر مذکور تھی - حال سے بیزاری اور جہاں تازہ کی تحقیق کے ذریعہ خوش آئند مستقبل کی آرزو مندی و بشارت ان کے فلسفہ حیات کے ایسے موضوعات ہیں جن کا ذکر اقبال کی شاعری میں بار بار آتا ہے - اس شاعری میں ان کا مخاطب بزرگوں اور ہم عصروں سے زیادہ نئی نسل سے ہے - اقبال کو یہ یقین تھا کہ نوجوان ہی ان کے آرزوؤں کے چراغ اور امیدوں کے آفتاب و مہتاب ہیں - ان کی روشنی آج مدھم ضرور ہے کل تیز ہوگی - ضرور اور مستقبل کی شاہراہ اس روشنی سے جگمگا اٹھے گی

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویران سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

اقبال کا پیغام حیات دراصل نئی نسل سے ان کے تعلق کو استوار کرتا ہے - ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ انقلاب کی کشمکش سے بھر پور زندگی قوموں کی بقا ارتقا کی ضمانت اور انقلاب سے محروم زندگی موت کا پیغام ہوتی ہے - زندگی کا یہ انقلاب کسی وقتی ہیجان یا جذباتی طوفان کا نہیں بلکہ قدرت فکر و عمل جو اپنی دنیا آپ پیدا کرتی - اپنے طور پر سنوارتی بناتی اور پروان چڑھاتی ہے - قوموں کا شباب اور سوز آرزو اسی قدرت فکر و عمل سے عبارت ہے - یہ ذوق انقلاب یا ندرت فکر و عمل انسان کی فطرت میں ہے - اس کی روح کی ٹھہراؤ یا ثبات میں نہیں بلکہ تغیر و انقلاب میں قرار ملتا ہے - یہ تغیر انقلاب زندگی کی دائمی صفت ہے اس کی شکلیں بدلتی رہتی ہیں - لیکن روح کبھی فنا نہیں ہوتی اس روح کا دوسرا نام چراغ مصطفوی نیکی اور یزدانیت ہے - یہ ندرت فکر و عمل یا ذوق انقلاب کا ذکر اقبال کے ہاں بار بار آتا ہے - ان کے اس عقیدے کا جزو لاینفک ہے کہ زندگی جامد و ساکت نہیں نامیاتی حرکت ہے -

اقبال کا کہنا ہے کہ بے عملی سے ساری شخصیت ختم ہوجاتی ہے - عمل سے وہ اپنی شخصیت کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے - اقبال کی کہی ہوئی " بچوں کی نظموں " میں عملی طور پر کچھ کر دکھانے کا جوش اور ولولہ " ایک پہاڑ اور گلہری "، " ماں کا خواب "، " ہمدردی " (" محنت " چاند اور شاعر " چند نصیحتیں " (غیر مطبوعہ) سے پیدا ہوتا ہے - ان نظموں سے سیاسی بیداری " حب الوطنی " غلامی سے نجات حاصل کر کے آزادی سے لگاؤ کا ذوق اتحاد و اصلاح کا جذبہ اور باہمی ہنگاموں سے اختلاف پیدا کرنے والی نظموں میں ترانہ ہندی، ہندوستانی بچوں کا گیت، پرندے ، ایک پرندہ اور جگنو " وغیرہ ہیں - اقبال نے غلامی اور آزادی کے موضوع پر نوجوانوں کو احساس دلایا کہیں آزاد اور محکوم کے اخلاق و اعمال کا فرق واضح کر کے نوجوانوں میں جوش حریت و حمیت پیدا کیا تو کہیں شاندار ماضی اور اسلاف کے کارناموں کے حوالے سے کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ حاصل کرنے پر ابھارا اور بے عملی پہ غیرت دلائی - اس نفسیات غلامی پر روشنی ڈالا تو کہیں نفسیات خلق کو موضوع سخن بنایا - غرض طرح طرح سے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ نوجوانوں کے کردار و مستقبل کی تباہی میں محکومی یا غلامی کا بڑا ہاتھ ہے - جب تک اس سے نجات نہ ملے کی ملت کے دن نہیں اور اس سے نجات پانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ملت کے افراد خصوصاً نوجوانوں میں غلامی کی زندگی سے نفرت پیدا ہو - ان کے جذبہ خودداری و غیرت مندی کو جوش آئے اور وہ ہر قیمت پر محکومی کی لعنت سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرے -

اقبال کے ہاں فرزند کہستانی یا نو جوان کا ایک اور نام بھی ہے اور وہ ہے شاہین " بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اقبال نے اپنے کلام میں اپنے مثالی نوجوانوں کو اسی نام سے پکارا ہے - اس لئے کہ ایک نوجوان میں وہ جس قسم کے مردانہ اوصاف دیکھنے کے آرزو مند ہیں وہ انہیں " شاہین " میں نظر آتے ہیں - خود اقبال نے ایک جگہ کہا ہے کہ " شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں ہے اس پرندے میں اسلام فقر کی تمام خصوصیات پائے جاتے ہیں - خود دار غیرت مند ہے - اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا بے تعلق ہے آشیاں نہیں بناتا بلند پرواز ہے خلوت پسند ہے - تیز نگاہ ہے ... جگہ جگہ شاہین اور اس کی صفات کا ذکر کیا ہے - لیکن اقبال کی مراد نوجوانوں ہی کے سیرت و کردار سے ہے کیونکہ وہ خود اپنی پوری زندگی ایک ذمہ دار شہری اور فرد کی حیثیت سے بسر کی - اقبال کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خیال میں تعلیم کا مقصد تخلیقی ہے - اور وہ مضمون قابل درس او تدریس ہے - جو تخلیقی مقصد کو پورا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو - سائنس کی تعلیم اس صورت میں پسندیدہ اور ضروری ہے - جب وہ تسخیر کائنات اور انسان کی بہتری کا وسیلہ بنتی ہے - لیکن جب سائنس جذبات و روح کو کچلنے کی صورت اختیار کر لیتی ہے تو اقبال کہتے ہیں

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

علامہ اقبال اس علم کے مداح اور داعی ہیں جو دین سے بیگانگی نہیں سکھاتا بلکہ خود دین کی حدود میں محفوظ رہتا ہے

P.T. 6.7.1994 The daily Salar Bangalore

شہر گلستاں بنگلور میں "انڈین اسوسی ایشن آف مسلم سوشل سائنٹسٹس" کا کنونشن

نقوش و تاثرات

سورخہ ۱۸ ماہ رواں کا اردو روزنامہ سالار بنگلور میرے لئے ایک نوید مسرت لایا، اس کے صفحہ ۳ پر حضرت شاہ قادری سید مصطفیٰ رفاعی جیلانی صاحب کے مضمون کا عنوان "شہر گلستان بنگلور میں آئی اے ایم ایس ایس کا دو روزہ عظیم الشان کنونشن" دیکھ کر، قلم میں تو یہیں آ گیا کہ یہ "آئی اے ایم ایس ایس" کیا ہے۔ مولانا کا مضمون پڑھنے کے بعد ساری بات سمجھ میں آئی۔ اس انجمن کے اغراض و مقاصد پڑھ کر ایک سماجی سائنس داں ہونے کے ناطے میں نے یہ طے کیا کہ ضرور اس میں حصہ لینا چاہیے چنانچہ شروع سے آخر تک اس میں شریک رہا۔

مسلم سماجی سائنس دانوں کا یہ عظیم الشان اجتماع دنیا میں دوسری مرتبہ منعقد ہوا ہے۔ اور اس شہر گلستان کو یہ فخر حاصل ہوا کہ ملک کے نامور مسلم سماجی سائنس داں ہندوستان میں پہلی مرتبہ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے۔ کنونشن کے انتظامات کے لئے اس انجمن کے کنوینر تجربہ کار و باوقار بزرگ شخصیت جناب کے جی منشی پروفیسر شعبۂ اقتصادیات گجرات یونیورسٹی گجرات سے بہت پہلے تشریف لائے اور اپنی بصیرت و تجربات کی بنا پر انہوں نے منتظمین کی رہنمائی کی۔

اس تحریک کے روح رواں عالی جناب ڈاکٹر منظور عالم صاحب کے بارے میں بہت پہلے سے سنا تھا اور یہ آرزو بھی رہی تھی کہ اس ہمہ داں اور مخلص ہستی سے ضرور ملنا چاہیے اور ان سے اگر ہو سکے تو کچھ دیر بات چیت کرنا چاہیے۔ کنونشن سے ایک دو دن پہلے ڈاکٹر صاحب کی بنگلور تشریف آوری ہوئی۔ آپ نے بڑی خندہ پیشانی سے ملاقات کی۔ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت میں ایک مقناطیسی کشش ہے جس سے ہر شخص متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چہرہ پر ہمیشہ مسکراہٹ اور غور و فکر کی جھلک میں نے دیکھی اور ان سے بہت متاثر ہوا۔ آپ نہ صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ و مہذب شخصیت کے مالک ہیں بلکہ حقیقی طور پر دانشور بھی ہیں۔ بنگلور آتے ہی آپ بھی ایک سرپرست کی حیثیت سے منتظمین کنونشن کی رہنمائی اور فائنل ٹچ اپ میں مشغول ہو گئے۔ ملک گیر پیمانے پر اس قسم کے کنونشن، سیمینار، ورکشاپ، سمپوزیم وغیرہ منعقد کرنے میں آپ ماہر ہیں۔ ان کا حسن انتظام اور طریقۂ کار کافی بہتر ہے۔ اصل کنونشن کے انعقاد کے لئے وہ انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز کا عملہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ آپ کی طرح آپ کے انسٹی ٹیوٹ کا عملہ بھی نوجوانوں سے پُر ہے اور انتھک محنت ان کا شعار ہے۔

منتظمین کنونشن نے کنونشن کے انعقاد کے لئے پُر فضا اور بڑی خوب صورت جگہ کا انتخاب کیا تھا اور کرسلامار شاہی یتیم خانہ جس مقام کا ذکر کیا تھا اس سے یہ تاثر تو نہیں ملا تھا کہ اتنے بڑے کنونشن کے لئے اس جگہ کا انتخاب کیوں کیا گیا ہے مجھے پتہ تو نہیں تھا کہ یہ جگہ ایسی ہوگی لیکن جب میں کیمپس کے احاطہ میں حاضر ہو گیا اور وہاں کی نئی اور شاندار اور خوبصورت عمارتوں اور ان میں موجود جدید سہولیات کو دیکھا تو دل باغ باغ ہو گیا۔ واقعی بہترین جگہ کا انتخاب کیا گیا تھا جو کنونشن کے لئے نہایت موزوں تھی۔ وہ احاطہ بیچ و بیچ کھلا میدان اور احاطہ کے اندر بڑے بڑے ہرے بھرے درخت راستہ سے کافی دور فاصلہ پر اندر کے حصہ میں یہ عمارتیں بنی ہوئی ہیں جس سے ٹریفک کا شور کارروائی میں خلل انداز نہیں ہو سکتا۔ یہاں مسجد بھی واقع ہے جہاں پر پنج وقتہ نماز کی سہولت بھی موجود تھی۔ ان سب امور اور سہولیات کی وجہ سے مندوبین و شرکاء بھی اس جگہ سے کافی متاثر رہے۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ ہمارے اور آپ کے آقا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی تو یتیم ہی تھے اور یتیمی آپ کی سنت ہونے کے ناطے یتیم خانے میں پہلے کنونشن کا منعقد ہونا باعث عزت و شرف ہی نہیں بلکہ باعث برکت بھی ثابت ہوا۔

اب یہ یتیم خانہ وقف بورڈ کی تحویل میں ہے۔ وقف بورڈ کے چیئرمین عالی جناب شفیق الدین صاحب آنریری جناب بشیر الدین صاحب اور یتیم خانے کے ایڈمنسٹریٹر پروفیسر جناب سراج الدین صاحب ان تمام حضرات نے اس مقام میں ممکنہ سہولیات فراہم کرنے میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ مورخہ ۱۵ رجب

بقیہ ماہ ربیع الاول ....

سنت میں اس کو تشہیر کی جائے حق کی تلقین کرتا ہو اور باطل کی تردید کرتا ہو۔ دونوں مواقع میں مثبت انداز فکر اور ایجابی طریقہ کار کی ضرورت ہے۔ ملت اسلامیہ کے تمام مسلکوں و جماعتوں اور طبقات کے عالم و غیر عالم تعلیم یافتہ تمام مرد و عورتیں آج تک ناموس تاجدار ختم المرسلین سرور کائنات حضرت محمد بن عبداللہ بن عبد المطلب صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری نبی و رسول ہونے پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس عقیدہ کا اظہار و تذکرہ کرنا اور ہمیشہ کرتے رہنا بھی ضروری ہے تاکہ یہ عقیدہ نئی نسل کی گھٹی میں پڑ سکے۔ اور اس کے دل و دماغ میں راسخ و پیوست ہو سکے۔

اس نورانی محفل میں تمام حاضرین نے اس بات پر اتفاق کیا کہ اس رواں ماہ محرم سے آئندہ ماہ محرم تک تمام سال کو "سال خاتم النبیین" کے طور پر منائیں، اور خاص طور پر آنے والے ماہ ربیع الاول کو "ماہ خاتم النبیین" کے طور پر منایا جائے۔ ماہ ربیع الاول کے تمام جلسوں کو "جلسہ خاتم النبیین" کا نام دیں اور مقررین حضرات جلسوں میں اور ائمہ حضرات مساجد میں "ختم نبوت و رسالت" کے بنیادی عقیدہ پر خاص طور سے روشنی ڈالیں اور آسان پیرائے اور انداز میں اسی منطقی عقیدے کو بیان کریں۔ اگر ختم رسالت و نبوت کا ہمارا عقیدہ مستحکم ہوگا تو مسلم معاشرہ میں نہ کوئی فتنہ سر ابھار سکتا ہے اور نہ اختلاف ہو سکتا ہے۔ علمائے دین اور تعلیم یافتہ طبقہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ "خروج" اور خاص طور پر عقیدوں پر اثر انداز ہوئے لیکن ختم المرسلین کی حفاظت کا بندوبست اور سامان کرتے رہیں۔ اس مبارک اور نورانی محفل میں حاضرین کے اتفاق سے ایک تجویز منظور ہوئی جس کا متن یہ ہے:

"ایمان کے دو جز ہیں ایک توحید دوسرا ختم رسالت۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کو ایک مانتا ہے مگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی و رسول تسلیم نہیں کرتا بلاشبہ وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ قادیانی فرقہ ختم رسالت کی تاویلات کر کے عقیدہ مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی و رسول مانتا ہے۔ اور خود مرزا غلام احمد قادیانی نے بھی اس کا دعویٰ کیا ہے۔ ممالک عالم کے شیعہ اور سنی مسلمانوں نے اس فرقہ کو کافر قرار دیا ہے۔"

ربیع الاول کا مبارک مہینہ تشریف لا رہا ہے۔ اس ماہ مبارک میں شہر شہر دیہات دیہات میں محفل میلاد النبی کے جلسے منعقد ہوتے ہیں۔ یہ جلسے ختم نبوت کے اعلان و اظہار کے لئے بہت مفید اور معین ہیں۔ علمائے کرام و ائمہ کرام اور مقررین کرام سے خصوصی درخواست ہے کہ وہ سیرت کی تقریروں میں ختم نبوت کے مضمون پر زور دیں اور پوری وضاحت کے ساتھ اس مضمون کو بیان کریں۔

اس مبارک محفل میں یہ بھی طے پایا کہ اس ادنیٰ رفاعی فقیر کے مرتب کردہ رسالہ "مدعی نبوت مرزا غلام احمد قادیانی" باطل نظریات کا پول ساڑھے ... ائمہ مساجد کو اس درخواست کے ساتھ بھیجا جائے کہ اپنے خطبات جمعہ میں اس کو موضوع بنائیں۔ یہ مبارک محفل امیر شریعت مولانا ابو سعود احمد کی رقت انگیز دعا پر اختتام پذیر ہوئی۔ ●●

از: ڈاکٹر محمد صبغۃ اللہ
صدر شعبۂ اردو
گورنمنٹ آرٹس کالج بنگلور

ایک پریس کانفرنس کا انعقاد ہوا جس میں اس کنونشن کے کنوینر پروفیسر کے جی منشی گجرات اور پروفیسر زیڈ ایم خان دہلی نے پریس کانفرنس کو مخاطب کرتے ہوئے بتایا کہ اس کانفرنس میں موجودہ ہندوستانی ماحول میں مسلمانوں کے تمام مسائل پر غور و خوض اور ان کے اسباب و حل کے لئے نئی سبیل نکالنے کے لئے اس انجمن کا دو روزہ کنونشن یہاں منعقد ہو رہا ہے جس میں تقریباً ۲۰۰ سے زیادہ مسلم سماجی سائنس داں حصہ لے رہے ہیں جن کا تعلق زبان، ذرائع ابلاغ، قانون، انتظامیہ، معاشیات، تاریخ، عرانیات، نفسیات، امور سیاست اور سائنس و ٹکنالوجی سے ہے۔ ان تمام شعبہ جات پر بحث کے دوران اس بات کا خاص خیال رکھا جائے گا کہ مسلم طبقہ کے مسائل اور ان کے حل کے لئے تدابیر پیش ہوں اور ان مسائل کے وجوہات پر بھی تحقیق کا موقع فراہم کیا جائے گا۔

ا رجون اسلامی سال ۱۴۱۵ھ کا پہلا مبارک دن تھا اور اس کا آغاز بھی ایک اچھے کام سے ہوا تھا جو آئندہ کے لئے بہت ہی نیک فال ثابت ہوگا۔ کنونشن کے نظام العمل کے مطابق صبح کے ۸ بجے سے مندوبین و شرکاء کا رجسٹریشن شروع ہوا۔ صبح ۱۰ بجے کنونشن کا افتتاحی اجلاس تلاوت قرآن پاک سے شروع ہوا۔ کنونشن کے ریسپشن کمیٹی کے کنوینر پروفیسر ممتاز علی خان صاحب نے مندوبین و شرکائے کنونشن کا استقبال کیا۔ جناب کے جی منشی صاحب نے اس انجمن کے اغراض و مقاصد پیش کئے اور بتایا کہ یہ موقر ادارہ ملک و ملت اور فلاح انسانیت کے لئے کار ہائے نمایاں انجام دینے کے لئے میدان عمل میں آیا ہے۔ یہ سماجی سائنس داں تعلیم و ترقی اور تعمیر و ترقی میں اپنا تجربہ رکھتے ہیں اور آج اجتماعی طور پر مسلم سماج کے لئے جس کے سامنے بے شمار مسائل ہیں اپنے تجربات و مشاہدات کی بنیاد پر اس کے حل کے لئے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے ہیں یہی اس انجمن کا بنیادی مقصد ہے۔ ملک کے گوشہ گوشہ سے تشریف لائے ہوئے تمام مسلم سماجی سائنس دانوں کا مقصد یہ ہے کہ باہمی اتحاد و تعاون سے نہ صرف مسلم سماج کی بہتری کے لئے بلکہ عالم انسانیت کی بہتری کے لئے بھی جلیل القدر خدمات انجام دیں گے۔ اس پہلے کنونشن کے بعد علاقائی اور ریاستی سطح پر سیمینار، کانفرنس، کنونشن، ورکشاپ، سمپوزیم کے ذریعہ سماجی سائنس دانوں کے عزائم کو بلند کرنا بھی اس انجمن کا مقصد ہے اور ان کے کارناموں کی حوصلہ افزائی کر کے ان کی انفرادی لائق شخصیت کو ملک گیر پیمانے پر اجاگر کرنا ان کی صلاحیتوں اور لیاقتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے قوم و ملت کے مسائل کے ساتھ ساتھ انسانی مسائل کو حل کرنا بھی ایک اہم مقصد ہے۔ انجمن کے ان اغراض و مقاصد کو سن کر میں کافی متاثر ہوا اور دل سے یہ دعا بھی نکلی کہ خدا کرے کہ جتنے لوگ یہاں جمع ہیں (تعداد تقریباً ایک ہزار تھی) ہر ایک کے دل میں یہی جذبہ کارفرما ہو اور وہ اس مقصد کو بروئے کار لائیں۔

افتتاحی تقریر کے دوران کرناٹک اسٹیٹ پلاننگ بورڈ کے ڈپٹی چیئرمین بنگلور اور کرناٹک یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر ڈی ایم ننجنڈپا جو بڑی پرکشش اور شاندار شخصیت کے مالک ہیں اور بہت اچھے مقرر بھی ہیں تقریر کی۔ آدھا گھنٹہ تک بہت اچھی تقریر کرتے رہے۔ (بقیہ صفحہ ۴)

فرمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب نماز کی اقامت کہی جائے تو تم دوڑ کر نماز کی طرف نہ آؤ بلکہ اطمینان کے ساتھ چل کر آؤ۔
(بخاری و مسلم)

پائنیر انامل انڈسٹریز
ناگوارہ ٹیانری روڈ
قریب کالج روڈ بنگلور ۔ 45

بقیہ شہر گلستان بنگلور…

(صفحہ ۳۳ کا سلسلہ)

دوران تقریر انہوں نے اس کنونشن کے انعقاد پر ستائش پیش کرتے ہوئے بتایا کہ آج کے اس دور میں جہاں سیاسی معاشی اور ثقافتی بحران سے ملک دوچار ہے ایسے میں مذہب کو سمجھنا ضروری ہے اس کنونشن کے تحت جو شعبہ جات یہاں موجود ہیں یہ انفرادی ترقی کی ستائش ہے اور اس میں ایک ڈسپلن پیدا کرنا ضروری ہے۔ انسان کی ترقی و ارتقاء کے لئے بہترین رہنما اصول موجود ہیں۔ مذہب انسان کو ہر مسئلہ اور بحران سے نمٹنے کی ذہنی قوت عطا کرتا ہے۔ ایک ماہر اقتصادیات ہونے کے ناطے انہوں نے سماجی سائنس دانوں کو اس وقت تین مسائل کی طرف توجہ دلائی۔

(۱) آمدنی کی تقسیم کیسے ہو۔ امیر غریب کے درمیان پائے جانے والے فرق کو کیسے کم کیا جائے۔ اس سلسلے میں انہوں نے بہت سی مثالیں دیں جن میں سے ایک مثال یہ تھی کہ جاپان ایک چھوٹا سا ملک ہے دوسری جنگ عظیم میں یہ ملک بری طرح سے تباہ و برباد ہوا تھا لیکن آج اس ملک کے باشندوں کی انتھک محنت کی وجہ سے دنیا میں فی کس آمدنی سب سے زیادہ اسی ملک کی ہے اور اس کی بہ نسبت بنگلہ دیش کی فی کس آمدنی سب سے کم ہے۔

(۲) شرح خواندگی۔ ڈاکٹر صاحب نے شرح خواندگی پر بھی زور دیا اور خصوصیت کے ساتھ خواتین کی شرح خواندگی کے اضافے پر کافی زور دیا۔ اور اس سلسلے میں انہوں نے بتایا کہ عورت کے تعلیم یافتہ ہونے پر اس کا استحصال ختم ہو سکتا ہے۔ اس تعلق سے انہوں نے اشتہاروں اور پوسٹروں میں عورت کی نمائش سے استحصال کی سخت مذمت بھی کی۔

(۳) مزدوری۔ تیسرا اسلوب ملک میں مزدوروں کے ساتھ ہونے والا سلوک ہے۔ انہوں نے بیان دیا کہ جب تک مزدور اور مالک ایک پارٹنر کی طرح مل کر کام نہیں کریں گے ہمارے ملک میں کامیابی اور اعلیٰ معیار حاصل نہیں ہو سکتا۔ منافع بخش کارکردگی کے لئے عموماً اسٹاف کو وظیفہ پر سبکدوش کر دیا جاتا ہے جس کی ڈاکٹر صاحب نے سخت مذمت کی۔ اور رشوت کے فروغ کا اسے بھی ایک عنصر قرار دیا۔ اپنی تقریر کو ختم کرتے ہوئے انہوں نے یہ امید ظاہر کی کہ انہوں نے جن نکات کی طرف اشارہ کیا ہے امید کہ مسلم سماجی سائنس دان ان پر غور کریں گے اور ان مسائل کا حل تلاش کر کے انسانیت کی بہت بڑی خدمت انجام دیں گے۔

افتتاحی تقریر کے بعد بانی الامین ایجوکیشن سوسائٹی عالی جناب ڈاکٹر ممتاز احمد خان صاحب نے اس کنونشن کے یادگار مجلہ کے اجراء سے قبل اپنے تاثرات پیش کئے اور منتظمین کنونشن کو اس کے انعقاد پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے مجلہ کا اجراء کیا۔ اس مجلہ میں نو مضامین شامل ہیں جو مختلف شعبوں سے متعلق ہیں۔ ان میں اہم شخصیتوں کے پیغامات بھی شامل ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجلہ کی تیاری عجلت میں ہوئی ہے اس لئے کہ بہت سے پیغامات اور مضامین الگ طور پر جلسہ گاہ میں مندوبین کو عطا کئے گئے جو اس مجلہ کا ایک حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ مجلہ کافی دیدہ زیب چیز ہے۔

اس کنونشن کا کلیدی خطبہ ڈاکٹر اے آر فریدی صاحب نے پڑھا جس کو مجلہ میں شائع کیا گیا ہے اور یہ چھ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس انجمن کے قیام کا مقصد مسلمانوں کی سماجی اور ثقافتی صورت حال کا جائزہ لے کر ان کے مسائل کے حل کے لئے سفارش کریں۔ آج مسلم سماجی سائنس دانوں کا کردار انفرادی طور پر انسانی اور اخلاقی پہلو رکھتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے مطابق انصاف اور مساوات پر مبنی معاشرہ قائم ہو جس میں انسان کی مکمل اور متوازن ترقی ممکن ہو سکے۔ انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی نظروں میں انسان کی مادی خوشحالی بھی ایک روحانی جدوجہد کا لازمی حصہ ہے۔ آپ نے بتایا کہ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم دوسرے مذاہب کے ماننے والوں سے بہت پیچھے ہیں۔ سماجی سائنس دانوں کو مشورہ دیتے ہوئے آپ نے کہا کہ وہ قرآنی علوم میں اچھی مہارت حاصل کریں جو آٹھویں صدی میں مسلمانوں کو حاصل تھی، اور عمرانی علوم کی روشنی میں مسلمانوں کی فلاح و بہبودی کا کام انجام دیں۔ اپنے تجربات اور ریسرچ سے اپنے علم میں اضافہ کریں۔

جلسے کے آخری حصے میں صدارتی خطبہ میں پروفیسر ڈاکٹر پی شیخ علی صاحب نے جو بہت مہذب شخصیت کے مالک ہیں قوم اور ملت کے ہمدرد اور مخلص بھی آپ کا شمار ملک کے نامور مؤرخوں میں ہوتا ہے اپنے صدارتی خطبہ میں سماجی سائنس دانوں کو مشورہ دیا کہ حق و صداقت کی پیروی کریں۔ آج ملک فرقہ پرستی ذات پات کی نفرت، فساد اور استحصال کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے۔ ایک طرف فرقہ وارانہ جنون کے تحت تباہی کا خطرہ لاحق ہے، تو دوسری طرف مسلمانوں میں مولانا آزاد جیسا کوئی مسلم رہنما موجود نہیں، ہمارے لیڈر یا سیاست دانوں کو عوام کی بنیادی ضروریات روٹی کپڑا مکان تعلیم روزگار اور صحت جیسے مسائل کی فکر نہیں۔ انہوں نے مسلم سماجی سائنس دانوں کو یہ مشورہ دیا کہ ایسے ماحول میں وہ اپنی آواز بلند کریں۔ اس طرح ہم لیڈر شپ کو بیدار کر سکتے ہیں۔ آپ نے مسلم طبقہ کی پس ماندگی اور معاشی پستی کو دور کرنے کے لئے مسلم سماجی سائنس دانوں کو اصلاحی اقدامات کی سفارش کرنے کا مشورہ دیا۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ آج حکومت کی جانب سے اقلیتوں کی بہبودی کے لئے کئی منصوبے تیار کرائے گئے ہیں ان سے مسلمانوں کو آگاہ کرائیں اور فائدہ اٹھانے کے لئے ان کی رہنمائی کریں اور آپ نے مسلمانوں کو یہ بھی مشورہ دیا کہ وہ سرکاری ملازمتوں اور مقابلے کے امتحانوں میں شریک ہونے کے لئے ان میں جو جھجک پائی جاتی ہے اس کو دور کریں۔

دانیال اے قاضی صاحب صدر مجلس استقبالیہ نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور مولانا ابو السعود احمد صاحب کی دعا پر یہ اجلاس ختم ہوا۔ اس اجلاس کی نظامت جناب سید ضمیر پاشاہ آئی اے ایس ڈپٹی سکریٹری محکمہ تعلیم حکومت کرناٹک نے کی۔

اس اجلاس کے فوری بعد مندوبین کا ایک عام اجلاس منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر محمد منظور عالم صاحب نے مسلم سماجی سائنس دانوں سے خطاب کرتے ہوئے موجودہ سماجی سائنس دانوں کی واقفیت کراتے ہوئے اس کی متبادل رسائی (اسلامی نقطہ نظر) کی ضرورت پر زور دیا۔ یہ تقریر آٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس تقریر میں آپ نے کہا کہ [illegible] ملک کی امن ترقی اور کامیابی کا ایک نشان ہے جب کہ دنیا اپنے ہی بیشتر مسائل سے دوچار ہے جیسے آبادی کا مسئلہ، [illegible] مسلح افواج، طاقت کا توازن، ملکی سالمیت، ماحولیاتی مسائل وغیرہ اور ہم اکیسویں صدی میں ان تمام اور اس کے علاوہ بیشتر مسائل کے ساتھ داخل ہو رہے ہیں۔ ان چیلنجوں اور ذمہ داریوں کا بوجھ سماجی سائنس دانوں پر عام طور اور خاص طور پر مسلمان سماجی سائنس دانوں کے کندھوں پر آن پڑا ہے۔ ان حالات کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ہم ان کو تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلے حصہ میں تاریخی تناظر میں تناسب کی روشنی میں ارتقاء کا جائزہ لیں گے۔ دوسرے حصے میں مستقبل میں ہونے والی تبدیلی کا جائزہ لیا جائے گا اور آخر میں ہم اس کے متبادل کو پیش کرنے کی سعی کریں گے۔ پھر آپ نے اگلے مرحلہ میں ہونے والے پینل ڈسکشن کے لئے قرآن و حدیث کی روشنی میں ہدایات فراہم کیں جس سے مسلم سماجی سائنس دانوں کو ان کی روشنی میں ڈسکشن میں مباحثہ کی دعوت دی۔ چائے کے وقفہ کے بعد الگ الگ کمروں میں مختلف مسلم سماجی سائنس دانوں کے صدارتی اجلاس میں مباحثے شروع ہوئے جو اتوار ۱۲ جون دوپہر تک جاری رہے۔ پینل ڈسکشن کا یہ طریقہ کار مغربی ممالک میں رائج ہے اور جب بھی یہ تجربہ کامیاب رہا۔ زبان کے پینل میں اردو عربی فارسی اور پالی زبانوں کا جائزہ لیا گیا۔ اور اردو کے مسائل میں مختلف زاویہ نگاہ سے مندوبین نے بحث مباحثہ کیا۔ اور عربی زبان میں تعلیم کو رائج کرانے میں جو دقت پیش آتی ہے۔ اس کے علاوہ اردو یونیورسٹی کے بارے میں روشنی ڈالی گئی۔

اس کے بعد اس کا چوتھا اجلاس منعقد ہوا جس میں پینل داروں نے اپنے مباحثہ کے نتائج اور منظور شدہ تجاویز سب کے سامنے پیش کئے اور ہر ایک کو اظہار خیال کا موقع بھی دیا گیا چائے کے وقفہ کے بعد تجاویز پر عمل درآمد کے لئے ایک منصوبے کی تیاری کا اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر [illegible] نے کی۔ بحث و مباحثہ کے بعد یہ طے پایا کہ فی الوقت ایک کوآرڈی نیٹنگ بورڈ کا قیام عمل میں لایا جائے جس میں ملک کی ہر ریاست سے ایک ایک نمائندہ کا انتخاب ہو اس طرح سے ۱۹ رکنی بورڈ کا قیام عمل میں آیا جس میں ریاست کرناٹک سے ڈاکٹر پی شیخ علی صاحب کو نامزد کیا گیا۔

اختتامی اجلاس کی ابتداء میں شرکاء جلسہ کے سامنے دو دن کی سرگرمیوں کا جائزہ پیش کیا گیا۔ اس کارروائی پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے سید ضمیر پاشاہ صاحب نے کہا کہ قرآنی احکام پر عمل درآمد ہو اور غیر مسلموں سے رابطہ رکھا جائے۔ [illegible] سمیع الدین نے بھی یہ پیغام محبت سے جہاں تک پہنچے۔

اس اجلاس کی صدارت جناب ڈاکٹر منظور عالم صاحب نے کی پروفیسر ایم حسن صاحب اس اجلاس میں شریک نہ ہو سکے البتہ ان کا پیغام سید تنویر احمد صاحب نے پڑھا جو اس اجلاس کی نظامت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ پڑھ کر سنایا۔ جناب اے [illegible] خطیب صاحب سابق ڈپٹی گورنر ریزرو بینک آف انڈیا نے اختتامی تقریر کی جس میں انہوں نے اس اسوسی ایشن کے قیام کو ایک معیاری قرار دیا۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ قرآن کی روشنی میں مسائل کا حل فراہم کرتا ہے اس لئے مسلم سماجی سائنس دانوں کا یہ بھی فرض بنتا ہے کہ وہ اس روشنی میں کام کریں۔ آپ نے مسلم سماجی سائنس دانوں کی ذمہ داریوں کو واضح کیا اور بتایا کہ دینی اور دنیاوی علوم کے ماہرین کے درمیان موجود خلیج کا خاتمہ کیا جائے۔ آپ نے [illegible] اسلام کی [illegible] و سلامتی پر زور دیتے ہوئے کہا کہ [illegible] کی کوشش کریں۔ آپ نے ایک معاشی ماہر کی حیثیت سے [illegible] پیش کیں اور [illegible] سرکاری [illegible] آپ نے مسلم سماجی سائنس دانوں سے اپیل کی کہ قرآن کی روشنی میں بلا سودی بنکنگ [illegible] تیار کریں۔

آخر میں پروفیسر کے جی مشتاق صاحب نے حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا جس میں خصوصیت کے ساتھ شاہ قادری سید مصطفیٰ رفاعی جیلانی صاحب اور ان کی ٹیم کی مسلسل خدمات کو سراہا جنہوں نے اس کنونشن کے انعقاد اور اس کی کامیابی کے لئے شب و روز محنتیں کی تھیں۔

اس اجلاس کے اختتام کے فوراً ہی نماز مغرب کا اعلان ہوا [illegible] نماز کی ادائیگی کے لئے مسجد کی طرف جا رہے تھے۔ اور جن لوگوں کا ریزرویشن ہو چکا تھا وہ سب اپنے اپنے مقامات پر پہنچنے کی تیاری کر رہے تھے۔ تمام ہی نے ڈاکٹر منظور عالم صاحب کو اور سید مصطفیٰ رفاعی صاحب کو کنونشن کے انعقاد اور اس کی کامیابی پر دلی مبارکباد پیش کرتے رہے۔ ہر ایک کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دو دن کی انتھک محنت کے بعد انہوں نے بہت کچھ حاصل کیا ہے اور وہ اپنے ساتھ بہت کچھ لے جا رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ کام بہت پہلے ہونا چاہئے تھا۔ لیکن دیر آید درست آید۔ ہر کام اپنے وقت مقررہ پر ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی محنت کامیاب ہو۔ مسلم طبقے کے لئے بہتری کے راستے فراہم ہوں۔ اور یہ قوم ماضی کی طرح دوبارہ عزت اور شان کے ساتھ اپنی بلندیوں پر پہنچے۔

نظام العمل کے تحت شرکاء و مندوبین کو مختلف ہوٹلوں میں آرام دہ قیام کے ساتھ کنونشن گاہ پر عمدہ و لذیذ کھانوں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس سارے انتظام میں مولانا سید مصطفیٰ رفاعی صاحب کے ساتھ شہر بنگلور کے اہل دل و مال حضرات شب و روز مصروف کار تھے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے یہ بھی دیکھا کہ بنگلور کے مسلم طلباء کی تنظیم مسلم اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (جس کے مولانا سید مصطفیٰ رفاعی ندوی صاحب سرپرست ہیں) کے ارکان کافی مستعدی کے ساتھ اپنے اپنے کاموں کو انجام دیتے رہے جس سے مندوبین و شرکاء کو کسی بھی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ملت کے یہ ہونہار نوجوان واقعی آئندہ چل کے لئے بہترین سرمایہ ثابت ہوں گے اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا کرے اور ان کا مستقبل تابناک شاندار اور درخشاں بنا کر ترقی کی راہیں ان پر کھول دے۔ انگریزی میں ایک مثل ہے [illegible]۔ خدا کرے کہ شہر گلستان بنگلور میں منعقد ہونے والا یہ پہلا کنونشن [illegible] ثابت ہو۔

حدیث شریف

"مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے لوگ محفوظ رہیں۔"

• میں نے تمہارے درمیان ایک ایسی چیز چھوڑی ہے جس کو اگر تم مضبوط پکڑو گے تو میرے بعد کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ یاد رکھو وہ قرآن ہے۔ (فرمان نبوی)

زینتھ ٹائل اینڈ سرامک انڈسٹریز

وینکٹیشورم بنگلور۔ 560045

فون 576145

The Daily Pasban. Bangalore.

3-10-1994

تجلیاں ..... ادب کے لئے تحفۂ درویشانہ

نام کتاب :	" تجلیات "
شاعر :	ڈاکٹر کے مدنا منظر تاپوری
صفحات :	224
قیمت :	60/-
سال اشاعت :	1993
ناشر :	شری پربھو پرکاشن 656، I اسٹیج ، اندرا نگر بنگلور - 038 560
تبصرہ نگار :	ڈاکٹر محمد صبغۃ اللہ پروفیسر شعبۂ اردو ، گورنمنٹ آرٹس کالج بنگلور - 001 560

ڈاکٹر کے مدنا منظر تاپوری کی ہستی کسی تعارف کی محتاج نہیں - پیشے کے اعتبار سے وہ سرجن ہیں - اور شری پربھو راؤ جو اردو و فارسی کے جید عالم تھے - ان کے خاندان کے چشم و چراغ ہیں - وہ اردو ہی کے نہیں دیگر زبانوں کے بھی شاعر ہیں - اور دیگر زبانوں میں بھی ان کے کلام کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں - جیسے انگریزی میں بلو آئس (Blue Eyes) ہندی کے دو مجموعے رس گنگا اور تیل کمل اور کنڑ میں چھ مجموعہ کلام پر بھوورشن ، مدھو رویہ ، لے (سیٹائم) ترشول ، ہنی کمل (قطرے) ، کرن ہنیے ، اردو گیت اس کے علاوہ ایک ڈرامہ " میرا " اور کنڑ نثر کی تین کتابیں میگو متر کے ساتھ ایڈٹ کی ہیں - شردھی بجلی ، سنتان ، سنکولے اور کاویہ شری کاویہ نندا -

ان امور سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کو نہ صرف اردو بلکہ ہندوستان کی دیگر زبانوں پر بھی عبور حاصل ہے جیسے قومی زبان ہندی ، بین الاقوامی زبان اردو اور انگریزی ، ایک کنڑیگا ہونے کے ناطے علاقی زبان کنڑ پر بھی مہارت حاصل ہے - ایک مترجم کے لئے اپنی زبان کے علاوہ وہ جس زبان میں ترجمہ کرتا ہے ان زبانوں پر بھی عبور حاصل کرنا ضروری ہے اور یہ خوبی ہم ڈاکٹر صاحب کے پاس دیکھ سکتے ہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ نے اردو کا منتخب ادب جس میں اقبال اور غالب کے کلام کے ساتھ ساتھ کرناٹک کے شعرا میں حمید الماس اور ادیب صاحب کے کلام سے کنڑ والوں کو متعارف کرایا تو اردو والوں کو کنڑ کے گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ ادیب و شاعر گوویپو کی شاعری سے متعارف کرایا جس کی مثال ہے خدا قیدی اور بچے کا خواب - اردو زبان سے تو ان کو عشق ہے - ان کے کلام کے مجموعے عرفان صدق ، آئینۂ عرفان ، منظر عرفان ، حسن عرفان اور منظر پہ منظر " تجلیات " سے پہلے منظر عام پر آچکے ہیں -

میرے پیش نظر تازہ ترین تخلیق تجلیات موجود ہے - اس کتاب کو ڈاکٹر صاحب نے مرحوم محمد علی مہتاب علی کے نام سے انتساب کیا ہے جن کو آپ مجاہد اردو کے نام سے یاد کرتے ہیں - مرحوم شری اس کی کیبنٹ میں نمبر ۲ وزیر کی حیثیت سے ریاست کرناٹک کی اور خاص کر اردو کی بہترین خدمات انجام دیں جس میں کرناٹکا اردو اکادمی کی پہلی تشکیل کا سہرا انہیں کے سر بندھا - اس کے علاوہ آپ انجمن ترقی اردو ریاست کرناٹک کے صدر بھی رہے - ساتھ ہی آپ نے ڈاکٹر صاحب کو اکاڈمی کا نائب صدر بنایا اور انجمن ترقی اردو میں بھی ساتھ رکھا -

اس کتاب پر ان کے دیرینہ رفیق محمد عبدالقادر ادیب ایڈوکیٹ بنگلور نے مقدمہ تحریر فرمایا ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہئے کہ شاعر مدنا منظر صاحب کی ایک مبسوط سوانح تحریر فرمائی ہے - ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے " میری نظر میں " کے عنوان سے تجلیات کے بارے میں مختصر مگر جامع خیالات کا اظہار کیا ہے - ڈاکٹر صاحب نے اپنے مجموعہ کلام تجلیات کی شروعات روایتی انداز حمد ، نعت اور منقبت سے کی ہے - غزلیات کی ابتدا بھی نعتیہ غزل سے ہوئی ہے - اس میں تقریباً 12 نعتیں 75 غزلیات اور 24 منظومات اور 221 تا 224 قطعات ہیں قطعات درمیان میں بھی موجود ہیں -

کتاب کی اصل جان ان کا نعتیہ کلام ہے - اللہ تعالی نے ہر زمانے میں ہر قوم کے لئے وقتاً فوقتاً اپنے نبی اور رسولؐ روانہ کئے اور آخر میں ساری کائنات کے لئے آپ سرور کونین حضور اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا نبی اور پیغمبر بنا کر روانہ کیا آپ سرچشمۂ ہدایت تھے - آپ کی تعلیمات اور آپ کے قول و فعل کو جاننے والا آپ کا پروانہ ہوئے بغیر نہ رہ سکا - اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ آج بھی دنیا میں جس کسی نے بھی آپ کی تعلیمات سے فیض حاصل کیا دل و جان سے آپ کا قائل ہوگیا یہ بات الگ ہے کہ وہ آپ پر ایمان نہیں لائے آج بھی غیر مسلم چاہے سکھ ہو یا عیسائی ہندو ہو یا کوئی اور آپ کی تعلیمات سے فیض یاب ہوتے ہیں اور آپ کی تعریف میں نعتیہ کلام لکھتے آرہے ہیں جس کی مثال ہمارے سامنے مدنا منظر کی ہے - ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے صحیح لکھا ہے کہ " جب وہ نعت کہتے ہیں تو اہل ایمان کے سر احترام سے جھک جاتے ہیں - وہ تصوف میں ڈوب کر شعر کہتے ہیں تو ذات یزداں ہی پرکشید ڈالتے معلوم ہوتے ہیں - چند اشعار ملاحظہ کیجئے -

در حقیقت ہے کہاں موت ذرا سوچو تو

تیری فرقت کی دور بن کے قضا آتی ہے

تمہارے عشق میں جینا تمہارے عشق میں مرنا

اسے ہم دین کہتے ہیں اسے ایمان سمجھتے ہیں

خدا کو کس نے جانا کس نے دیکھا کس نے پایا ہے

تمہیں کو دیکھ کر ہم ہستی یزداں سمجھتے ہیں

پابند مقدر ہوکر بھی ہر چیز پہ قادر ہے انساں

مجبور کا جب یہ عالم ہے مختار کا عالم کیا ہوگا

جب ہم منظر کی غزل گوئی پر آتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے صرف روایتی غزل نہیں کہی ہے بلکہ اس کو سجانے سنوارنے میں اپنا خون جگر صرف کیا ہے اور غزل کی فکری فضا کو سنجیدہ بنانے کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کا حسن بھی کافی دلکش ہے -

یہ عشق کیا ہے جنوں کیا ہے بے خودی کیا ہے

وہ زیست کیا ہے جو تفسیر غم نہ جان سکے

وحدت بھی تمہاری ہے کثرت بھی تمہاری ہے

اب تم ہی بتاؤ ہم ہوتے تو کہاں ہوتے

تجھے سارا زمانہ چھان مارا

مگر تو ہے کہ مجھ میں ہی نہاں ہے

چاہوں کہ نہ چاہوں مجھے جو چاہے بنادے

لیکن مجھے محتاج زمانہ نہ بنادے

جہاں انسانیت کے خون سے کھیلی گئی ہولی

اٹھا کر اس زمیں سے یاد کا پتھر نہ لانا

منظر کی شاعری میں تصوف کا رنگ بھی ملتا ہے - چند اشعار دیکھئے نظم

ذرا مجھ کو دیکھو میں کس کی ادا ہوں

میں شیخ حرم دیر کا برہمن بھی

وہ صدائے انا الحق بھی دار و رسن بھی

میں توفیق توبہ بھی توبہ شکن بھی

میں جان حقیقت بھی بے جان تن بھی

میں مجموعہ خیر و شر بن گیا ہوں

ذرا دیکھو منظر میں کس کی ادا ہوں

پھر

خوب معلوم ہے ایماں کی حقیقت کیا ہے

ہم تیرے عشق میں کیوں عشق بتاں تک پہنچے

اور یہ مصرع بھی قابل غور ہے

میں تدبیر انساں میں تقدیر انساں

انسان کی تدبیر کو یزداں کی تقدیر سے جوڑنا انوکھی بات ہے اور یہ کام وہی کرسکتا ہے جو صوفی ہو -

نظموں کے ان اشعار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ منظر نے خود کو ایک کامیاب نظم نگار کی حیثیت سے پیش کیا - ان کی بہتری نظموں میں چند نظمیں قابل توجہ ہیں - جے پی (جے پرکاش نرائن) آزادی ، زندگی ، بہر و پیہ ، محمد علی مہتاب علی کی یاد میں ہیاد مجاز ماتھوری پنچ وغیرہ -

آخر میں ڈاکٹر صاحب کی شاعری کے بارے میں ادیب صاحب کے یہ جملے " منظر صاحب کی نعتیں ہوں کہ غزلیں ، نظمیں ہوں کہ گیت انداز صوفیانہ تو نظر شاعرانہ فکر فلسفیانہ ہے تو رفتار قلندرانہ ، گفتار ہوشمندانہ ہے تو دل مقدس آستانوں کا پروانہ ، غرض " تجلیات " کا ہر ورق الہی گوشوں کا ہے تحفۂ درویشانہ ، خدا کرے کہ ہر مکتب فکر " تجلیات " کا بنے پروانہ -

ادیب صاحب اپنے رفیق ڈاکٹر کے مدنا منظر کے اس مجموعہ کلام کی جس صحیح و منقفی نثر میں تعریف کی ہے اس میں مجھے مبالغہ نظر نہیں آتا بلکہ اس کا ہر ایک حرف حقیقت سے معمور ہے -

ہر شعر حسیں منظر ہر حرف گل تر ہے

تری دید سے زندگانی جواں ہے

میں منظر ہوں حسن نظر چاہتا ہوں

P.L.C کو فعال بنا کر علم کی روشنی کو گھر گھر کو پہنچاؤ

میرے دوست جناب نجم الحسن صاحب سے ایک ملاقات کے دوران خزینۂ حروف کی مختلف کاپیاں دیکھنے کو ملیں۔ مکمل خواندگی مہم کا آپ نے بہترین آغاز کیا ہے۔ پوسٹ لٹرسی کورس (P.L.C) کو بھی آپ فعال بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اردو زبان میں ان کورسوں کا آغاز اردو والوں کے لئے نیک فال ہے۔ یہ ہماری مادری زبان ہے۔ اسی زبان سے ہم نے اپنے آپ کو اپنی ملی جلی تہذیب کو پہچانا ہے۔ اور اس کے لئے علم کی روشنی ضروری ہے۔ قرآن اور حدیث بھی اس پر زور دیتے ہیں۔ اقرا سے قرآن کریم کی تعلیم شروع ہوتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت حضور اکرم کی عمر 40 سے تجاوز کر چکی تھی اور یہ تعلیم ایک دو دن نہیں بلکہ مکمل 23 سال تک جاری رہی۔ آپ نے فرمایا علم جیسی چیز کو حاصل کرو چاہے وہ چین جیسے ملک میں ہی کیوں نہ ملے۔ عرب سے چین کا فاصلہ دور دراز کا ہے اسی لئے یہ ہدایت کی گئی کہ علم کے حاصل کرنے میں دور اور نزدیک کا کوئی معاملہ نہیں ہے طالب علم میں اگر طلب علم کی سچی لگن موجود ہے تو اس کے لئے دور اور نزدیک کا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

لیکن آج علم کی ترقی کے لئے ہمارے پاس بے شمار میڈیاس ہیں۔ جب حکومت نے یہ بیڑہ اٹھایا ہے کہ علم کی روشنی کو گھر پہنچایا جائے تو اب اردو والوں کا یہ فریضہ ہے اس سے خوب فائدہ اٹھالیں۔ اس کا ایک بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہر فارغ ہونے والا طالب علم اپنے پڑوس اپنے محلہ والوں کو اپنی سیکھی ہوئی تعلیم سے آگاہ کرائیں چاہے پری لٹرسی کورس ہو یا پوسٹ لٹرسی کورس اگر یہ عمل جاری رہا تو وہ دن دور نہیں کہ ہمارا پورا ملک خواندہ ہوجائے گا۔ اس مہم میں طالبات کو زیادہ سے زیادہ Involve کرنا چاہئے کیونکہ ایک مقولہ کے مطابق مرد کی تعلیم ایک فرد کی تعلیم ہے اور ایک عورت کی تعلیم ایک خاندان کی تعلیم ہے۔ محترمی ایڈیٹر صاحب نے مکمل خواندگی مہم کے لئے جو مختلف طریقہ کار اپنائے ہیں وہ فعال ہیں۔ خدا آپ کو ہر قدم پر کامیابی عطا کرے۔

بخدمت ایڈیٹر صاحب
خزینۂ حروف

مخلص
ڈاکٹر محمد صبغۃ اللہ
پروفیسر و صدر شعبۂ اردو
گورنمنٹ آرٹس کالج بنگلور - ۱

مکمل خواندگی مہم - خزینۂ حروف 15-4-95

The daily Pasban Bangalore - 29-1-96.

برما میں صالح روایات کی پاسداری کرنے والا شاعر

ڈاکٹر محمد صبغت اللہ، پروفیسر شعبہ اردو، گورنمنٹ آرٹس کالج، بنگلور

سائنسی ترقی کی بدولت آج دنیا اتنی مختصر ہو چلی ہے کہ انسان آج دنیا کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے میں بہ آسانی چند گھنٹوں میں پہنچ جاتا ہے - ایک زمانہ تھا کہ دور دراز علاقے میں پہنچنا جوئے شیر لانے کے برابر تھا - آج ایک ملک کے باشندے جب دوسرے ملک میں جاتے ہیں اور انہیں وہاں کی آب و ہوا راس آگئی تو اسی ملک کو اپنے کاروبار، ملازمت یا دیگر ضروریات کے لئے منتخب کر لیتے ہیں وہیں اپنے اہل و عیال کے ساتھ بود و باش اختیار کر لیتے ہیں - یا اسی ملک کی کوئی ہستی جو اپنی طرز طور طریقہ یا مزاج سے مل گئی تو اسی کے ساتھ زندگی کا سفر گذار دیتے ہیں - ہندوستان کے لئے کوئی بھی ملک نیا نہیں ہے - اور نہ ہی اس کے تعلقات کسی سے کشیدہ ہیں - جس کے باعث ہندوستانی باشندے آپکو دنیا کے ہر گوشے میں مل جائیں گے مثلاً خلیجی ممالک، امریکہ، کنیڈا جنوب مشرقی ممالک وغیرہ وغیرہ ظاہر ہے کہ انسان جس ماحول میں پرورش پاتا ہے پروان چڑھتا ہے اس کی تہذیب تمدن کے دیرپا اثرات بھی اس پر ضرور قابض رہتے ہیں - دنیا کے کسی بھی ملک میں وہ اپنی بود و باش اختیار کرے لیکن اپنی مادری زبان، اپنی تہذیب، ثقافت وغیرہ کو وہ نہیں چھوڑ پاتا - اردو اخبارات میں جب ہم غیر مقیم ہندوستانیوں خصوصاً اردو والوں کی تخلیقات کو دیکھتے ہیں تو تعجب کی انتہا کہ وہ اس اجنبی ماحول میں بھی اردو میں اتنی اچھی تخلیقات کیسے کر سکتے ہیں؟ خلیجی ممالک میں تو اس کا ماحول مل جاتا ہے لیکن دیگر ممالک میں یہ بات اتنی آسان نہیں -

ایسا ہی اردو کا ایک پروانہ قمر مرچنٹ برما میں مقیم ہے - کاروبار حیات کے سلسلے میں وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ منتقل ہو گئے تقریباً تین دہوں سے مقیم ہیں - برما اردو والوں کے لئے کوئی نئی جگہ نہیں ہے - تاریخ بتاتی ہے کہ مغلیہ سلطنت کا آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر نے اپنی زندگی کے آخری لمحات یہاں بتائے اور وہیں پیوند خاک ہوئے - جس کے بارے میں ظفر نے کہا تھا

کتنا ہے بد نصیب ظفر دفن کے لئے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

شاید اسی کا اثر ہے کہ قمر کے دل میں شاعری کا شوق امنڈ آیا کہتے ہیں

جو بھی لکھنا ہے شوق سے لکھئے
اب تو آئے ہیں شعر کثرت سے

کہنے کو ابھی کوئی اچھی سی غزل کہہ دوں
یارو نہ مگر کہنا میں بھی کوئی شاعر ہوں

اور شوق اور لگن میں انہوں نے ان گنت غزلیں کہی ہیں -

تشنگی علم کی اتنی ہے قمر
ایک صحرا ہے جسکی پیمائی

قمر کی زندگی بھی ہر انسان کے دکھوں کی طرح بھرپور ہے اور اس غم کی ترجمانی وہ اپنے کلام میں جا بجا کرتے ہیں -

غم ہر اک زندگی میں شامل ہے
غم ہی ہر زندگی کا حاصل ہے
زندگی کے بھی [illegible] مسائل ہیں

کس سے کہتے کہ ہم کو اپنا لو
سب ہی اپنے بھلائے رہتے ہیں
میں نے مانا کہ تم حسین ہو بہت
بس کے ڈرتا قمر ہوں عبرت سے
کس سے کہیے کہ آرزو کیا ہے
کون کب میری بات سنتے ہیں

خدائے تعالےٰ کے بارے میں ان کا عقیدہ دیکھئے

کوئی ہے جس سے ہے سارا جہاں
میں نہیں جانتا خدا کیا ہے

پھر بھی اس ان دیکھے خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ

اے خدا جس طرح رکھا ہم رہے
ہم کیا جانیں کیا شان و شوکت ہے
اے خدا تو ہی اک سہارا ہے
التجائے کرم کریں کس سے

اسی ان دیکھے سے ملتجی ہیں

اے خدا تیرا ہی کرم چاہئے
کون چاہے گا جینا ذلت سے

ان کے دل میں دنیا کی کوئی خواہش نہیں ہے - فقر و قناعت ان کا شیوہ ہے

اے قمر اب نہیں کوئی خواہش
ہم کو کیا لینا دنیا دولت سے

ہر شاعر کی طرح قمر کے پاس محبوب کے وفا و جفا کا بھی تذکرہ ملے گا

اے قمر ان سے تو وفا نہ ہوئی
ہوئی
اور ہم سے کبھی جفا نہ ہوئی
نہ وہ جیتے ہیں جینے دیتے ہیں
ہمیں ان پہ ہی رحم آتا ہے
ظلم اتنا مچلتے رہتے ہیں
زخم دل لہلہاتے رہتے ہیں
ظلم اتنا قمر پہ نہ کرنا
ایک نازک سا اسکا بھی دل ہے
[illegible]

ورنہ جینے کو کون جیتا ہے

زندگی ایسے موڑ پہ ہے قمر
راہ منزل کوئی نظر میں نہیں

گر چکا ہوں اس قدر قمر ہوں میں
پھر بھی اپنے گرتے رہتے ہیں
ایک منزل کی آس رکھتے ہیں
گام درگام ہم بھٹکتے ہیں

غیر ملکی ماحول، وہاں کی تہذیب اور زبان انسان کو اپنی تہذیب و تمدن کے برخلاف
ت اچھی لگتی ہے - اور بہت جلد وہ اپنے آپ کو اس میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے -
ن چند لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس ملک کے ماحول میں رہ کر بھی اپنی زبان اپنی
ذیب اور ثقافت وضع داری کا خاص خیال رکھتے ہیں -

جس نے طوفان کبھی نہ دیکھے ہوں
وہ کیا سمجھے کہ ناخدا کیا ہے

قمر کا شمار بھی انہیں میں ہوتا ہے - برما کے ماحول میں رہ کر بھی انہوں نے اپنی
ی زبان کا خاص لحاظ رکھا اس کو بھلا نہیں پائے -

تمہیں کچھ پتہ ہو یا نہ ہو قمر پر
تیری یاد میں عمر گذری ہے ساری

اور انہیں وہاں کوئی ایسا آدمی نہیں مل سکا جو ان کے اندر کے ادیب و شاعر کو
ان سکے - جب کوئی تحقیق کار فن کار اپنی تحقیق یا فن کو جنم دیتا ہے تو ہمیشہ اس کی یہ
وہوتی ہے کہ کوئی اس کے فن کو پہچانے اس کی تحقیق کو دیکھے سنے اور اس کی داد دے -
کہ وہ اس اجنبی ماحول میں رہ کر بھی اردو زبان جو ان کی اپنی مادری زبان
اس پر جان نچھاور کرتے رہے اپنے جذبات کو شعر کا جامہ پہنانے کی کامیاب کوشش میں
روف ہیں - اس زبان سے انہیں والہانہ عشق ہے - اور عشق پر انہوں نے جو شعر کہے
ں قابل داد ہیں -

عشق تو نام ہے قمر جل جانے کا
مثل پروانہ ہی جلنا ہے مجھے
عشق کا کیا ہو ہی جاتا ہے
دل کسی نہ کسی پہ آتا ہے

اپنے دل کی حالت یا دلی جذبات کی کتنی اچھی عکاسی ان اشعار میں کی ہے - چند مثالیں ملا
ہوں -

کتنا کمزور و ناتواں دل ہے
دل مگر زندگی کا حاصل ہے
دل پہ کیا زور اے قمر ہم کو
جس پہ آیا اسی پہ مرتے ہیں
جان ہے تو جہان ہے اے قمر
اک سہارے کی بس ضرورت ہے
آپ ہمارے قمر جو ہو جائیں
نہ جائیں گے اس مسرت میں

آرزوئے وفا پہ جیتے ہیں

تذکرہ جام کے بغیر شاید اردو شاعری ادھوری سی لگے - اور قمر اس کا تذکرہ کئے بغیر
نہیں رہ سکتے - چند اشعار ملاحظہ ہوں -

ان سے کہنا بڑا ہی مشکل ہے
ہوش کس کو تھی اور کچھ کرتے

اور شیخ سے چھیڑ چھاڑ بھی ہے

شیخ اور مے کدہ کی طرف
کچھ تو بدلا ہے لوگ کہتے ہیں
گر گنہگار وہ ہوتے قمر
شیخ جی کس طرح یہاں ملتے

زندگی کے بارے میں یوں تو اردو شاعری میں بے حساب اشعار مل جاتے ہیں - قمر
بھی زندگی کے بارے میں اپنا ایک نظریہ رکھتے ہیں

ایک منزل کی آس رکھتے ہیں
گام در گام ہم بھٹکتے رہے

پھر بھی انہوں نے اپنا بھرم بنائے رکھا ہے کہتے ہیں

اے قمر بس بھرم سنبھالے رکھو
کوئی منزل نہ تھی کہ آجاتی
جس نے طوفان کبھی نہ دیکھے ہوں
وہ کیا سمجھے کہ نا خدا کیا ہے
کوئی ہے جس سے ہے سارا جہاں
میں نہیں جانتا خدا کیا ہے
زندگی ایک پل میں کیا گذری
یہ پتا کیا چلے کیا کیا ہے
ایک مطلب پہ ہے جہاں قائم
دوست دشمن قمر نیا کیا ہے

قمر مرچنٹ واقعی قابل داد ہیں - کہ انہوں نے ایک اجنبی ماحول میں رہ کر اپنے دلی جذبات کو شاعری کا جامہ پہنایا - ہمارے ہاں بہت سی قابل ہستیاں موجود ہیں - لیکن اپنی کاہلی کے باعث وہ کوئی ایسا قابل کارنامہ انجام نہیں دے پاتے - اگر وہ چاہیں اور مستعدی کے ساتھ کام کریں تو بہت ہی بہترین کارنامے انجام دے سکتے ہیں - قمر مرچنٹ کی سعی سے ان لوگوں کو سبق لینا چاہئے اس کی مثال ایسی ہے کہ شہد کی مکھیوں کا جتھہ ہمیشہ گروہ میں یا اپنے مجمع میں رہتا ہے - اور شہد اکٹھا کرتا ہے - لیکن کبھی کبھی پھولوں کا رس حاصل کرنے کے لئے کوئی مکھی دور نکل جاتی ہے راستہ بھٹک جاتی ہے پھر اپنے مجمع کو حاصل نہیں کر پاتی - پھر بھی وہ اپنی فطرت سے مجبور ہے - ایک اکیلی جان جہاں رس ملا حاصل کیا اور اپنے مقدور بھر شہد اکٹھا کیا - قمر کی مثال بھی اس شہد کی اکیلی مکھی جیسی ہے جس نے شہد اکٹھا کیا - اپنے جذبات کو مردہ نہیں ہونے دیا -

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

✤★✤★✤★✤★✤★✤★✤★✤★✤★✤★✤★✤★✤★✤★

The Daily Pasban Bangalore.

26-2-96

کامیاب افسانہ وہی ہے جو معنوی تہہ داری اور آفاقیت کا حامل ہو

از ---------- ڈاکٹر محمد صبغت اللہ پروفیسر شعبۂ اردو گورنمنٹ آرٹس کالج بنگلور

نام کتاب :- ----------	سونے کا ہرن
افسانہ نگار :- ----------	فرحت کمال
قیمت :- ----------	50 روپیے
صفحات :- ----------	128
سال اشاعت :- ----------	1994-95
ناشر :- ----------	فرحت کمال

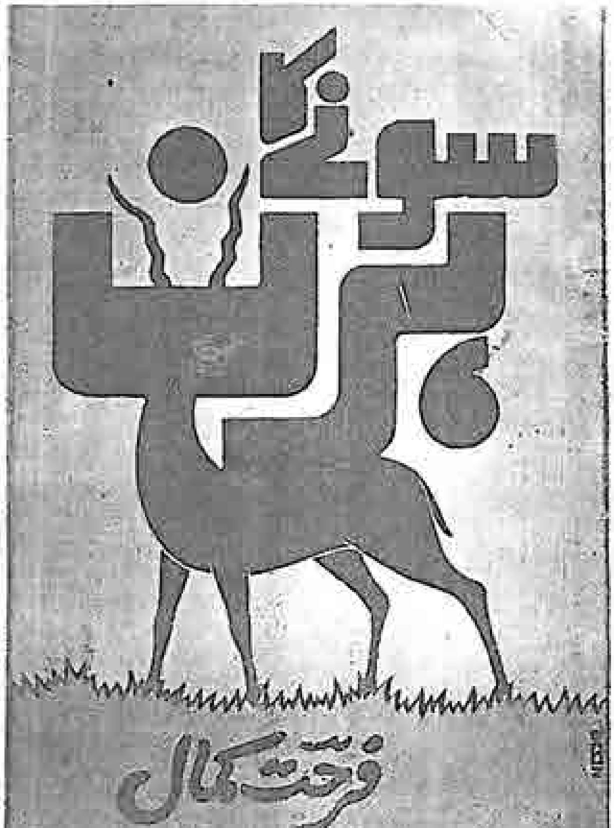

فرحت کمال ریاست کرناٹک کے ان افسانہ نگاروں میں سے ہیں جن کے تعارف کی شاید ہی کوئی ضرورت پیش آئے 1988ء میں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ " پتھر کا شگاف " شائع ہوا اور بہت جلد دوسرا ایڈیشن بھی جو مصنف کے مقبولیت کی دلیل ہے - اس مجموعہ کی کہانیوں میں " سر راہ چلتے چلتے " اونچے لوگ " ڈونیشن " وغیرہ قارئین میں کافی مقبولیت حاصل کرچکی ہیں - مستقبل قریب میں ان ایک اور افسانوی مجموعہ " چاندی سا بدن " بقول مصنف حیرت انگیز کہانیوں کا غیر معمولی مجموعہ زیر ترتیب ہے - ناول " شیشے کا پاؤں " اور ریت کے محل " بھی بہت جلد قارئین کے ہاتھوں میں ہوگا - اس کے علاوہ ابن صفی کرشن چندر، راجندر بیدی، بھارتی، راہی معصوم رضا کے علاوہ کرناٹک کے مشہور فنکاروں کی کہانیاں " پر اسرار آدمی " بھی ترتیب دے رہے ہیں - یہ ادبی خدمات اس بات کا ثبوت ہیں کہ مصنف اپنی پہلی اشاعت کی بے پناہ مقبولیت پر مکتفی ہوکر نہیں بیٹھ چکا ہے بلکہ وہ اپنے ادبی سفر کو جاری رکھے ہوئے ہے - اور اپنی حد پرواز سے آگے بڑھنا چاہتا ہے - اللہ کرے زور قلم اور زیادہ میرے سامنے ان کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ " سونے کا ہرن " ہے اس کا سرورق کافی دیدہ زیب اور بامعنی ہے - نام کی مناسبت سے سنہرے رنگ کا انتخاب اور اس کا پس منظر دلکش ہے اور قاری کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کئے بغیر نہیں رہ سکتا - اس مجموعہ میں 24 افسانے ہیں اس مختصر سے مضمون میں تمام افسانوں کا انفرادی طور پر جائزہ لینا مشکل ہے - بیشتر افسانے مختصر ہیں - البتہ آخری افسانہ جو مجموعہ کا نام بھی ہے - ان افسانوں کی بہ نسبت طویل ہے آج کے اس مصروف ترین دور میں آدمی کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ ادب کی طرف متوجہ ہوسکے - اپنے کاروبار حیات میں وہ اتنا مصروف ہے کہ اسے اپنے جمالیاتی قدروں کے پامال ہونے کا احساس تک نہیں - دنیا کا مشہور سائنس داں ڈارون جب اپنی تھیوری مکمل کرلیتا ہے اور ادب لطیف کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کو محسوس ہوتا ہے کہ ادب لطیف سے اس کا ناطہ ٹوٹ چکا ہے - اس لئے کہ اب اس کے دماغ کا وہ حصہ ماؤف ہوچکا ہے جو قریباً ربع صدی قبل ادب سے محظوظ ہونے میں اس کا ساتھ دیا کرتا تھا - آج کی اس مصروف دنیا میں دوچار صفحات کا افسانہ، چند ابیات کی شاعری اور دیگر ادبی صفحات پر طائرانہ نظر ڈالنے تک کی اس کے پاس فرصت نہیں ہے - اسی کا نتیجہ ہے کہ آج سماج میں انسانیت نام کی چیز ناپید ہوتی جارہی ہے - اور آدمی مشینوں کے ساتھ مشین بن گیا ہے اپنے غم غلط کرنے کے لئے مختلف سہاروں کا سہارا لیتا ہے جس میں منشیات اور جنسی آزادی جیسے بے راہ روی کو نمایاں دخل ہے - اس کی اس بے راہ روی کی اگر کوئی اصلاح کرنا چاہے تو اس کو مذہب کے نام پر بنیاد پرست (FUNDAMENTALIST) اور انسانیت کا وہ عرف عام میں قدامت پرستی کہتا ہے - لیکن اصلاحی مقصد کا کام کرنے والوں کی کوئی کمی نہیں - ہر مصلح اپنے اپنے دائرہ میں چاہے وہ مذہب ہو یا ادب یا کوئی اور اپنی لگاتار کوششیں جاری رکھے ہوئے ہے جس کے باعث آج اس بے راہ روی پر کچھ نہ کچھ ضرور اثر ہورہا ہے - سائنسی ترقیات نے انسان کی تفریح طبع کے لئے بہت کچھ سامان فراہم کردیا ہے - جس کے باعث کتاب بے معنی سی ہوکر رہ گئی ہے - افسانہ، ناول، شاعری، موسیقی وغیرہ کے لئے اپنے گھر کتاب کی ضرورت نہیں - الیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ یہ ساری ذہنی بنائی چیزیں اسے تھوڑے سے وقت میں وہ سب کچھ فراہم کردیتی ہیں - جو گھنٹوں کتابوں کے مطالعہ کے بعد حاصل ہوتی ہیں - اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میڈیا کے ذریعہ انار کی پھیل رہی ہے - پھر بھی کہانیوں اور موسیقی و شاعری کے ذریعہ دوچار اصلاحی باتیں ان مصروف ترین ذاتوں کے کانوں میں پڑجاتے ہیں یا سننے کو ملتی ہیں بقول مصنف " سونے کے ہرن " شائع ہونے والے اکثر افسانے آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوچکے ہیں انہوں نے اس میڈیا کے ذریعہ اپنا اصلاحی پیغام پہنچایا جو یقیناً رائیگاں نہیں گیا ہے - بحیثیت طالب علم جب ہم ان افسانوں کے عناصر ترکیبی کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کے موضوع، سرخیاں، تحریک، پلاٹ، کردار، کشمکش، منتہا، مکالمہ، منظر، زبان اسلوب، زماں ومکاں وغیرہ کے لحاظ سے یہ افسانے اپنی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں جو ایک افسانہ نگار کی کامیابی کی دلیل ہے - فنکار نے اپنی تخلیقات میں فن کے نکھار کے لئے جذبات، تجربات، مشاہدات اور کیفیات کا نچوڑ پیش کیا ہے جو قاری کو اجنبیت کا احساس نہیں ہونے دیتی - وہ اپنے افسانوں میں طنز کا کارگر حربہ استعمال کرتا ہے جس کی صفائی، تیزی اور تلخی قاری کو دیر تک محو کردیتا ہے - اور حقیقت کو بڑی عالی ظرفی کے ساتھ پیش کرتا ہے " درد کے سوداگر " اور اس کی بہترین مثال ہے - زندگی کی دو رنگیاں دیکھنی ہوں تو " پرانا مکان " میں دیکھی جاسکتی ہیں - " آخری اہرام " میں اردو والوں کے دیرینہ مطالبات پر طنز ہے " ٹوٹے کھلونے " میں جب بڑھیا انسپکٹر کو تحفہ پیش کرتی ہے تو قاری کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں -

طنز اور تضاد یہ دونوں ایسے حربے ہیں جس سے افسانے میں اشتیاق تجسس اور دل چسپی بڑھ جاتی ہے اور قاری کو پورا افسانہ پڑھے بغیر چین نہیں آتا - فرحت کمال کا اسلوب نہایت سبک رو اور انجام چونکا دینے والا ہے ان چیزوں کو دیکھنا ہو تو " ایک پنچھی پیاری سی " آنکھیں " وہ لڑکی " بے نام رشتے کو پڑھ کر دیکھئے ان میں ہر لمحہ آپ کا اشتیاق بڑھے گا - " الجھا ہوا فیصلہ " پل صراط " دلدل " خشک ہونے " وغیرہ مقصدی افسانے ہیں لیکن یہ ناصح کی طرح اپنا نقطۂ نظر مسلط نہیں کرتے بلکہ بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ بین السطور (IN BETWEENTHE LINES) میں پیش کرتے ہیں -

جب ان افسانوں کے مواد اور موضوع کا جائزہ لیں تو ان میں انسانی زندگی کے ابتدائی مسائل ملیں گے اور سچائیوں سے آنکھیں چار کرنے کی کوشش اور ہمت لے کی فرار نہیں -

تاریخ ادب اردو — مختصر جائزہ

نام کتاب :: تاریخ ادب اردو کرناٹک
مرتب و ناشر :: کرناٹک اردو اکاڈمی ، بنگلور
قیمت :: (سو) =/100 روپئے
تقسیم کار :: نصرت پبلیشرز امین آباد لکھنؤ - ۱۸
اشاعت :: ۱۹۹۴
تبصرہ نگار :: ڈاکٹر محمد صبغتہ اللہ، پروفیسر، شعبہ اردو۔
گورنمنٹ آرٹس کالج بنگلور ۱

❀ تاریخ نویسی ایک فن ہے - تاریخ ایک ایسا لفظ ہے جس کے سنتے ہی یا پڑھتے ہی سامع یا قاری کا ذہن منتا ہے اور لپنے کورے دماغ میں اس کتاب کا ہر لفظ نقش کر لیتا ہے - اسی لئے مورخ کو چاہیے کہ وہ حقیقت یا سچائی پر ہی پوری توجہ دے - متنازعہ فیہہ مسائل بھی ہیں تو ان کے دونوں رخ کو پیش کر کے اپنی رائے پیش کر دے - رہی ادبی تاریخ ، اردو ادب میں اس کے بیشتر نمونے ہمارے سامنے موجود ہیں - کرناٹک اردو اکادمی بنگلور کی مندرجہ بالا کتاب اعلیٰ پیمانے پر شائع کی گئی ہے - اس کے مقالہ نگار بھی جانے مانے محققین ہیں - اس کتاب میں ۵ مقالے شامل ہیں جن کی ترتیب اس طرح ہے -

۱ - بہمنی دور میں دکنی ادب کی نشو و نما
۲ - کرناٹک میں اردو ، آغاز و ارتقا
۳ - اردو شاعری عادل شاہی دور میں
۴ - کرناٹک کا سیاسی اور تاریخی پس منظر
۵ - پرانے میسور میں اردو آزادی سے پہلے

اس کے بجائے اس کی ترتیب اس طرح ہوتی تو بہتر ہوتا -

۱ - کرناٹک کا سیاسی اور تاریخی پس منظر
۲ - کرناٹک میں اردو ، آغاز و ارتقا
۳ - بہمنی دور میں دکنی ادب کی نشو و نما
۴ - عادل شاہی دور میں اردو شاعری
۵ - پرانے میسور میں اردو آزادی سے پہلے

اس کتاب کا پہلا باب " بہمنی دور میں دکنی ادب کی نشو و نما " ہے ایک دکنی زبان کا طالب علم ہونے کے ناطے اس کا بغور مطالعہ کرنے پر ص ۴۴ پر ایک بات کھٹکی جو حضرت خواجہ بندہ نواز کی خلافت سے متعلق ہے - سطر نمبر ۵ اور ۶ پر تحریر ہے کہ " بروز چہار شنبہ ۷ھ کو شیخ طریقت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے خرقۂ خلافت سے سرفراز فرمایا - " پھر اگلے پیراگراف میں یعنی سطر ۹ اور ۱۰ میں یوں تحریر ہے " آب کوثر " میں محمد اکرام قم طراز ہیں کہ چراغ دہلی نے وفات سے تین دن قبل گیسو دراز کو خلافت عطا کی تھی - ۱۸ رمضان ۷۵۷ھ کو شیخ نے سفر آخرت اختیار کیا

جب حضرت بندہ نواز کی خلافت کا تاریخ میں تذکرہ آگیا ہے تو برسبیل تذکرہ یہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ آب کوثر ص ۴۲۰ تا ص ۴۲۲ میں حضرت شاہ نصیر الدین چراغ دہلوی کی وفات کا تذکرہ ہے -

" وفات کے وقت آپ کے خادم زین الدین علی نے عرض کیا کہ آپ کے کتنے بلند پایہ مرید ہیں ان میں سے کسی کو جانشین نامزد کر دیں تاکہ سلسلے کا کام جاری رہ سکے - لیکن آپ نے زمانے کی بدلی ہوئی ہوا دیکھی تھی اور سمجھے تھے کہ دہلی میں چشتیہ مشائخ کبار کا سلسلہ ختم ہو چکا - خادم نے مریدوں کی فہرست پیش کی تو آپ نے اسے دیکھ کر کہا کہ مولانا زین الدین ان لوگوں کو اپنے ایمان کا غم کھانا چاہیئے اس کی کہاں گنجائش ہے کہ یہ لوگ دوسروں کا بوجھ اٹھائیں گے -

مرتے وقت آپ نے وصیت کی کہ بزرگان چشت میں پشت در پشت منتقل ہوتے آئے تبرکات جیسے سلطان المشائخ کا خرقہ ، عصا ، تسبیح نعلین ، کاسہ چوبیں میرے ساتھ دفن کی جائیں - وصیت کے مطابق یہ تبرکات حضرت چراغ دہلی کے ساتھ دفن ہو گئے - لیکن حضرت سید گیسو دراز نے اس کھاٹ کی رسیاں اتار لیں - جس پر انہوں نے حضرت کو غسل دیا تھا اور انہیں اپنے گلے کا ہار بنا کر کہا کہ میرے لئے اپنے پیر کا یہی خرقہ کافی ہے ۔ ۳

آب کوثر کے ص ۴۲۰ پر حضرت بندہ نواز کا تذکرہ کرتے ہوئے سیر محمدی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ آپ کی وفات سے تین دن قبل حضرت گیسو دراز کو خلافت عطا کی گئی ہے - نیچے فٹ نوٹ کے حاشیہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ سیر العارفین سے خیال ہوتا ہے کہ حضرت چراغ دہلی نے کسی کو اپنا جانشین نامزد نہیں کیا - آب کوثر ص ۴۳۱ حضرت نصیر الدین چراغ کی تاریخ وفات کے بارے میں لکھا ہے کہ " ان کی وفات اس واقعہ سے تین سال بعد (ابو تراب کے حملہ کے تین سال بعد) ۷۵۷ھ (۱۳۵۶ء) رمضان کی ۱۸ ویں تاریخ بروز جمعہ ہوئی -

ان سارے امور کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ص ۴۴ پر درج تاریخ وفات غلط ہے " آب کوثر " میں دی ہوئی تاریخ اور تاریخ ادب اردو میں دی ہوئی تاریخ میں ۳۰ سال کا فرق آجاتا ہے جو ناممکن ہے اور دوسری بات یہ بھی واضح ہوتی ہے کہ حضرت نصیر الدین چراغ نے حضرت بندہ نواز کو خلافت عطا نہیں کی تھی بلکہ پیر کی کھاٹ کے جھلنگے کو گلے میں ڈال کر خرقہ بنایا اور خود ساختہ خلیفہ بن گئے - ایسے اختلاف رائے سے مورخ کو بچنا چاہیئے - یا جب اس کا تذکرہ ناگزیر ہو جاتا ہے تو پوری دیانت داری سے دونوں رائے پیش کر دینا چاہیئے - کیونکہ سند اور واقعات ہی تاریخ ادب کی جان ہوتی ہیں -

اس کتاب کا تیسرا مقالہ " اردو شاعری عادل شاہی دور میں " (۱۴۹۰ تا ۱۶۶۹ء) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقالہ نگار نے اپنی کتابوں کا چربہ اتار دیا ہے - اور اس میں اضافہ صرف ابراہیم عادل شاہ ثانی ، عبدل ، حسن شوقی ، مقیمی اور صنعتی کو شامل کر کے مقالہ کو ختم کر دیا گیا ہے - جبکہ اس دور میں ان شعرا کے علاوہ بیسیوں اور شعرا موجود تھے ان کے کلام موجود ہیں - ان کے ان علمی و ادبی کاوشوں کو مختلف محققوں نے جمع کیا ہے - مختلف اداروں نے زیور طبع سے آراستہ کر کے منظر عام پر لایا ہے - اس دور کے چند اہم شعرا کا تذکرہ کیا جا رہا ہے جو اس دور میں موجود تھے - شاہ امین الدین اعلیٰ ، عاشق دکنی ، شاہ ابوالحسن بن شاہ حبیب اللہ ، ملک خوشنود شاہی ، نصرتی ، ہاشمی ، بحری ، دولت شاہ ملک ، ریاضی ، قدرتی ، مختار ، تغلی ، مرتضیٰ ، معظم ، موجد امین کریم ، بحری ذوقی ، حسینی غوثی بیجاپوری ، عبد الحمد ترین ، فقیر شریف محمد دکنی وغیرہ وغیرہ ، جب کرناٹک کی ادبی تاریخ مرتب کی جا رہی ہے تو ان شعرا نے کیا گناہ کیا تھا کہ ان کا تذکرہ چھوٹ گیا - ضروری تو یہ تھا کہ ان کا تفصیلی جائزہ مع نمونہ کلام کے پیش کیا جاتا - جیسا کہ جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو میں کیا ہے - کچھ بھی ہو یہ باب ادھورا ہے - ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کو پھر سے لکھوایا جائے -

۲- محمد اکرام آب کوثر ۳۴۷ (۱) سیر العارفین ص ۹۷ ، ص ۳ ایضاً ص ۹۶ - ص ۹۷

کتاب کا آخری باب سب سے مختصر ہے یعنی ۱۶ صفحات میں آزادی سے پہلے کی تاریخ سمیٹی گئی ہے - یہ باب بالکل تشنہ ہے اس میں جن ادبا و شعرا کا تذکرہ کیا گیا ہے ان کا مفصل جائزہ ضروری ہے - فاضل مقالہ نگار نے کافی تحقیق سے مواد جمع کیا ہے لیکن مطالعہ کے بعد تشنہ کامی باقی رہ جاتی ہے - جو ایک تاریخ ادب کے لئے ناکافی ہے -

ان سارے امور کے پیش نظر کرناٹک اردو اکادمی سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ ان کوتاہیوں کو دور کرنے کی کوشش کرے تو یہ تاریخ اور عمدہ ہوگی اور اس کی اشاعت میں چار چاند لگ جائیں گے - چونکہ یہ پہلی کوشش ہے اس میں کوتاہی ضرور ہوئی ہے اور اس کو دور کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے -

Daily Pasban Bangalore
15-7-1996

THE DAILY SALAR

آل انڈیا ملی کونسل اور کاروان آزادی۔ ہر جگہ استقبال بہت ضروری

از: پروفیسر محمد صبغت اللہ (بنگلور)

سرزمین ہندوستان پر جب انگریزوں نے رفتہ رفتہ اپنے ناپاک قدم مضبوط کرنے شروع کئے اور مختلف حکومتوں پر سازشوں کے تحت اپنا شکنجہ کس لیا تو دور اندیش حاکم حیدر علی خان بہادر اور ان کے فرزند حضرت ٹیپو سلطان شہید نے ان کے ناپاک عزائم کو بھانپ لیا اور انہیں ہندوستان سے باہر نکالنے میں اپنی جانیں قربان کردیں۔ لیکن ہندوستان کی قسمت میں غلامی کا طوق لکھا ہوا تھا۔ اس کو چند غداران وطن اور وطن دشمن عناصر کی مدد سے انگریزوں نے اس کی گردن میں غلامی کا طوق پہنادیا۔ تقریباً دو صدیوں تک ہندوستان کو یہ طوق غلامی سہنا پڑا۔ لیکن اس سرزمین نے کچھ ایسی ہستیاں بھی پیدا کیں جن کی ارواح کو اللہ تعالیٰ نے آزاد پیدا کیا تھا وہ آزاد رہنا پسند کرتی تھیں اور اس جدوجہد میں انہوں نے کامیابی حاصل کی۔ سب سے پہلے آزادی کی جنگ میں حضرت ٹیپو سلطان شہید کے ساتھ ہزاروں مسلمانوں نے وطن کی آزادی کے لئے اپنی جانیں قربان کیں تو دوسری طرف جلیان والا باغ میں چھ سو سے زائد علمائے کرام نے اپنی جانیں قربان کیں۔ سراج الدولہ کو کتنے سپاہیوں کو قربان کرنا پڑا اور بہادر شاہ ظفر کے ساتھ کتنی جانیں قربان کیں۔ ہندوستان کے دیگر ریاستوں کے راجے مہاراجاؤں کی فوج میں کتنے مسلمانوں نے آزادی وطن کے لئے جانیں قربان کیں ان کا نام لیوا آج کوئی نہیں ہے اور نہ ہی ان کی قربانیوں کو خراج عقیدہ پیش کرنے والا ہے۔ اپنے وطن کی آزادی کے لئے اس عظیم قربانی دینے میں مسلمان کبھی نہ پیچھے رہے اور نہ آج حقیقی آزادی حاصل کرنے کے لئے کسی سے پیچھے رہیں گے۔ لیکن آج ہندوستان کا اکثریتی فرقہ اس کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں۔ اسی سرزمین پر آج اس کی زبان کی ترقی میں رکاوٹیں حائل کی جارہی ہیں۔ اس کا معاشرتی نظام منتشر ہے۔ اکثریتی فرقہ فرقہ واریت کے جنون میں ننگا ناچ ناچ رہا ہے اور اقلیتی فرقہ کو اپنے مظالم کا نشانہ بنارہا ہے۔ اس کی اقتصادی حالت کو کمزور کر رہا ہے اس کی ثقافت، اس کی اقدار حیات اور عقائد کا مذاق اڑایا جارہا ہے۔ پچاس سال گذرنے کے باوجود ہندوستان کے عام شہری کو آزادی کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ رشوت ستانی کا بازار گرم ہے اور ملک کا نظام اس کے باعث درہم برہم ہورہا ہے۔ ملک کے ایسے بیشتر مسائل کے مدنظر ہندوستان کے ہر شہری پر یہ لازم ہوتا ہے کہ وہ ایک نئی جنگ آزادی شروع کرے ان مسائل کو حل کرکے ہندوستان کو اگلے سالوں میں حقیقی آزادی دلائے۔ انہیں مقاصد کو عام کرنے اس آزادی کے پچاسویں سالگرہ کے موقع پر سارے ہندوستان میں سال بھر جشن منایا جائے گا۔ ملک کی آزادی کے لئے جن لوگوں نے قربانیاں دیں۔ پھانسی پر جھول گئے جیلوں میں اپنی زندگی کے اہم دن گذارے انہیں خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے آل انڈیا ملی کونسل نے جس کاروان آزادی کو ترتیب دیا ہے وہ نہایت ہی مبارک اقدام ہے۔ کرناٹک کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ آزادی کی شروعات میں اس نے پہل کیا۔ اس لئے 21 ستمبر 1997ء کو آل انڈیا ملی کونسل کا یہ کاروان آزادی (ساؤتھ زون میں کرناٹک، کیرالا، پانڈیچری، تمل ناڈو اور آندھرا پردیش) مجاہد اعظم حضرت فتح علی ٹیپو سلطان شہید کی آرام گاہ گنبد شاہی سری رنگا پٹنم سے اپنے مشن سے عوام الناس کو روشناس کراتا ہوا ڈیڑھ ماہ بعد دہلی پہنچے گا۔ حضرت نظام الدین اولیاء نئی دہلی کے ایک اہم اجلاس پر یہ مہم اختتام پذیر ہوگی۔ آل انڈیا ملی کونسل کا یہ کاروان آزادی جہاں جہاں پہنچے عوام کو چاہئے کہ اس کا دل و جان سے استقبال کریں اس کے اجلاس میں زیادہ سے زیادہ کی تعداد میں حصہ لے کر اس کے مشن کو کامیاب بنائیں۔ حقیقی آزادی کو پہچانیں اور ایک نئے ملک کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں

ہندوستان کی آزادی میں مسلمانوں کا کردار

روزنامہ سالار مورخہ ۱۹ ستمبر کے صفحہ ۶ پر پروفیسر محمد صبغت اللہ بنگلور کا ایک مضمون بعنوان "آل انڈیا ملی کونسل اور کاروان آزادی" نظر نواز ہوا۔ مضمون کے مطالعہ سے ایک نئی بات یہ معلوم ہوئی کہ "جلیان والا باغ" والے حادثے کے وقت چھ سو سے زائد علماء کرام نے بھی اپنی جانیں قربان کیں۔ میں اب تک یہی سمجھا تھا کہ وہاں قربان اور شہید ہونے والے عام ہندوستانی ہی تھے (ہندو مسلم اور سکھ وغیرہ)۔ دہلی سے "شبستان اردو ڈائجسٹ" شائع ہوتا تھا۔ اس میں آنجہانی محترمہ وجیہ لکشمی پنڈت (نہرو جی کی بہن، لندن میں آزادی ہندوستان کی پہلی ہائی کمشنر اور سابق صوبہ ممبئی کی گورنر صاحبہ) بھی اس "باغ" والے حادثے میں موجود ہونے کی اطلاع دی تھی۔ اور انگریزی فوجیوں وغیرہ کو للکارا تھا کہ آؤ مجھ پر بھی گولیاں برساؤ جبکہ وہ آگے بڑھ کر ایک زخمی کو گود میں لے لیا تھا۔ اور انگریز ٹھٹک گئے تھے۔ آزاد بھارت میں مسلمانوں کی قربانیوں کو نظرانداز کردئے جانے کی بات بار بار آتی ہے اور یہ کہ سراج الدولہ کو نظرانداز کیاگیا، حیدرعلی خان بہادر کو اور سب سے بڑھ کر حضرت ٹیپو سلطان شہید کو۔ ٹھیک ہے یہ چیز کھٹکتی ہے۔ اب گاندھی جی کے ساتھ کیا ہورہا ہے؟۔ ہمارے ملک کے لیڈرز خود ان کو بھلا بیٹھے ہیں جبکہ ان کو گذرے ہوئے پچاس سال بھی نہیں گذرے۔ یہ ایک انسانی فطرت ہے کہ وہ ماضی کو بھولتا چلاجاتا ہے۔ الا یہ کہ مسلمان اپنے آخری نبی یا رسولؐ اور ان کے خلفائے راشدین اور صحابہ کرام اور ان پر نازل کتاب "قرآن" کو نہیں بھولا بلکہ سینے سے لگالیا ہے۔

سننے میں آیا ہے کہ "گھر کا پیر مسخرہ ہوتا ہے" یہی انسانی فطرت ہے۔ لہذا مسلمانوں کو چاہئے کہ گلہ شکوہ کرنے کے بجائے اپنے اسلاف کے کارناموں کو تمام کے سامنے آشکار کریں اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ جہاں تک حضرت ٹیپو سلطان شہید کی یاد کا معاملہ ہے تو عرض ہے کہ ان کے پیدائشی مقام "دیون ہلی" (پہلے یہ دیون دوڈی تھا) میں ان کا قلعہ تقریباً محفوظ ہے۔ ان کی پیدائشی یادگار ہے۔ پھر حال ہی میں ریاستی سرکار نے ان کا ایک مجسمہ بھی نصب کیا ہے۔ اب یہاں سے قریب بین الاقوامی طیران گاہ تعمیر ہورہا ہے ہوسکتا ہے کہ اسے ٹیپو کا نام ہی دیا جائے۔ اس نام کی یادگار کے لئے خود مسلمانوں نے کیا کیا؟ کیا حکومت کو متوجہ کیا؟ یا یادداشت دی۔ اس کے لئے آئینی، دستوری و جمہوری قدم کیا اٹھایا۔ (اے محمد صالح، وجیہ پور)

جنگ

پہلی قسط

کنڑ افسانہ نگار: سارہ ابوبکر
مترجم: ڈاکٹر محمد صبغۃ اللہ

ڈاکٹر ریڈیو کام نہیں کر رہا ہے۔ زمین سے ناطہ جوڑنے کی ساری کوششیں بے کار ہو چکی ہیں۔ کہیں اترنا بھی چاہیں تو اس گھپ اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آرہا۔ ہوائی جہاز [illegible] نے بات سے کہا۔

یہ علاقہ ہمارا ہے یا دشمنوں کا؟ یہ بھی پتہ نہیں چل رہا ہے۔ کسی بھی طرح زمین پر اتر جائیں تو اچھا ہے۔ یہ کہتے ہوئے راحل نے اپنے ہاتھ میں دوائیوں اور ہنگامی حالات میں درکار آپریشن کے سازو سامان کے صندوق کو مضبوطی سے تھام لیا۔ ایسے میں ہوائی جہاز ایک زوردار آواز کے ساتھ سینکڑوں ٹکڑوں میں بکھر گیا۔

پانی کی گہرائی میں ہوش آنے کے بعد بڑی مشکل سے وہ سطح آب پر آ گیا۔ اس کا ایک پیر ٹوٹ گیا تھا اور وہ حرکت کرنے سے قاصر تھا۔ بڑی مشکل سے وہ تیرنے لگا۔ تیرتے ہوئے اسے بھی معلوم نہ تھا کہ آیا وہ ساحل کی طرف جا رہا ہے یا سمندر کی گہرائی کی طرف۔ چاروں طرف گھپ اندھیرے میں تیرنا کافی مشکل تھا۔ تیرتے تیرتے اس کے ہاتھ شل ہو گئے۔ اسے یقین ہو گیا کہ تھوڑی دیر میں وہ ڈوب جائے گا۔ ناامیدی سے بچنے کے لئے آخری بار سطح آب سے سر اٹھایا تو انہیں دور چمکنے والی بجلی کی روشنی میں اسے پتہ چلا کہ وہ ساحل کے قریب ہے۔

تھوڑی دیر بعد دل دہلانے والی اور آسمان کو پھاڑنے والی بجلی کی کڑک سنائی دی۔ ساحل کے قریب آتے ہی راحل کا حوصلہ بڑھا۔ اس نے اپنی ساری طاقت جمع کی اور اس کے ساتھ ہی اپنے دونوں ہاتھ تیزی سے چلائے۔ ساحل تک پہنچ کر اس نے ایک گہری سانس لی۔ [illegible] یقین نہیں آرہا تھا [illegible] سوال یہ ہے کہ [illegible] مجھے قید کر کے قتل کر [illegible] وہاں کے لوگ زندگی عطا کرنے والوں کی؟ اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ [illegible] شدت سے [illegible] گر گیا۔ ایسی حالت میں [illegible] تک پہنچا ہی تھا کہ [illegible] بجلی چمکی۔ اس روشنی میں اسے ایک معمولی سا گھر نظر آیا۔ پہلے مجھے اس بارش سے بچنا ہے۔ پھر [illegible] پاؤں کا علاج۔

اس نے اندھیری رات میں آہستہ آہستہ رینگنا شروع کیا۔ ابھی وہ تھوڑی ہی دور گیا ہوگا کہ اسے ایک عورت کی چیخ سنائی دی۔ شاید کوئی عورت خطرہ میں ہے۔ جنگ سے نہیں [illegible] اس بات میں کیا ہوگا؟ ایسے میں اگر میں نے دروازے پر دستک دی تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔

اس گھر سے روشنی کی ایک معمولی سی کرن بھی باہر نظر نہیں آرہی تھی۔ سرحدی علاقہ تھا۔ حفاظتی اقدامات کی وجہ سے بلیک آؤٹ کر دیا گیا تھا۔ اس وقت اس گھر میں کیا ہو رہا ہے۔

یا اللہ..... عورت کے کرب کی آواز اب صاف سنائی دینے لگی۔

راحل کے چہرے سے خوف کی پرچھائیاں غائب ہو گئیں اور اس کی جگہ تسلی کے آثار نمایاں ہونے لگے اور اب وہ پھرتی سے اس گھر کی طرف رینگنے لگا۔ دوائیوں کا صندوق اس کے ہاتھوں سے کبھی کا چھوٹ چکا تھا۔ بجلی کی چمک میں اس کو پتہ چلا کہ اب وہ گھر کے قریب ہے۔

پھر اس گھر سے کسی عورت کے درد و کرب سے کراہنے کی آواز صاف صاف سنائی دے رہی تھی۔ ساتھ ہی کسی معمر عورت کے تسلی دینے کی آواز بھی۔ کیا کروں بیٹا! میں مجبور ہوں باہر گھپ اندھیرا ہے اور ساتھ ہی موسلا دھار بارش ہو رہی ہے ایسے میں..... میں کس کو بلاؤں..... جتنی جلدی سویرا ہو اتنا ہی اچھا ہے۔

راحل بڑی مشکل سے رینگتا ہوا سیڑھیاں چڑھ کر دروازے کے قریب آیا اور دروازے پر دستک دی۔

مائی دروازہ کھولئے۔

ہاں..... تم کون ہو؟ اس موسلا دھار بارش اور اس اندھیرے میں..... کون؟ کسی عورت نے زور دار آواز میں اندر سے سوال کیا۔

مہربانی سے دروازہ کھولئے۔ میں زخمی ہو چکا ہوں۔ پلیز..... راحل نے بڑی کسمپرسی کی حالت میں عاجزی سے کہا۔

رحم..... پھر کسی کے بدن اور دل و دماغ کو زخمی کرنا ہی تو جنگ کا کام ہے۔ بڑھیا نے بڑبڑاتے ہوئے دروازہ کھولا۔

راحل رینگتا ہوا جلدی سے گھر میں داخل ہوا اور دروازہ بند کرنے کے بعد گھر والی بڑھیا کو راحل غور سے دیکھنے لگا۔ بڑھیا کے سر کے بال برف کی طرح سفید ہو چکے تھے اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا چراغ تھا۔ چراغ کی روشنی کو باہر جانے سے روکنے کے لئے ایک طرف کاغذ چپکا دیا گیا تھا۔ راحل نے چراغ کی روشنی میں دیکھا کہ بڑھیا کا چہرہ جھریوں سے پر ہے۔ اس نے راحل کے قریب چراغ لا کر چہرہ کو غور سے دیکھا اور سوال کیا تو کون ہے؟ تم ہمارے ہی آدمی ہو نا؟ بڑھیا کی باتوں میں خوف اور وہم نمایاں تھا۔

اس نے بڑھیا کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے چراغ پر نظر ڈالی۔ "میں جنگ کرنے والے ہیں وہ توقوں کا آدمی نہیں۔ آفت میں پھنسے لوگوں کی مدد کرنے والوں کا آدمی ہوں۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

یا اللہ..... لا..... مجھے بچائیے.....

اب میں اس عذاب کو سہہ نہیں سکتی اندر سے کراہنے کی آواز سنائی دی۔

کون ہے مائی؟ اس کو کیا ہوا؟ راحل نے اپنا درد بھلا کر پوچھا۔

میں کیا بتاؤں؟ میری بہو درد زہ میں مبتلا ہے۔ شام سے کراہ رہی ہے۔ ڈاکٹر یا دائی کسی کو بلا کر لا بھی نہیں سکتی۔ یہ بلیک آؤٹ یہ بمباری..... کس کو چاہئے یہ جنگ؟ میری لڑکی کی زچگی ہو جاتی تو کافی تھا۔

اماں..... میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟

آں.....! کیا.....؟ بڑھیا کے چہرہ سے خوف اور وہم کے خدشات اچانک غائب ہو گئے۔ شاید خدا نے تم کو ہمارے پاس رحمت کا فرشتہ بنا کر بھیجا ہے۔ لیکن..... تو تو کافی تھکا ہوا ہے..... پانی میں بھیگا ہوا ہے۔ ٹھہر میں تجھے اپنے بیٹے کے کپڑے لا کر دوں گی۔ یہ کہتے ہوئے بڑھیا اندر گئی اور بیٹے کے کپڑے اٹھا لائی۔ اس کو بیٹھے بیٹھے کپڑے تبدیل کرتے دیکھ کر۔

کیوں.....؟ کیا تم کھڑے نہیں ہو سکتے؟ بڑھیا نے پوچھا۔

پاؤں زخمی ہو چکا ہے۔ اس کو بعد میں دیکھا جائے گا۔ پہلے مجھے تم اپنی بہو کے پاس لے چلو۔ اس نے کہا

بڑھیا چراغ لے اس کی خوابگاہ کی طرف چلی اور وہ رینگتا اپنا پاؤں گھسیٹتا بڑھیا کے پیچھے پیچھے چلا۔ اس مدھم روشنی میں درد سے کراہتی عورت کو اس نے غور سے دیکھا۔

"میں اس کا معائنہ کروں گا تم گرم پانی تیار کرو۔"

یہ کہہ کر اس نے معائنہ شروع کیا۔ معائنہ کے دوران درد کی ایک لہر اٹھی اور اس کو چیخنے پر مجبور کر دیا۔ باہر دور سے ہوائی جہاز کی آواز کے ساتھ ساتھ بمباری کی آوازیں بھی سنائی دیں۔

ایک اور زندگی کو دنیا میں لانے کے لئے اس لڑکی نے اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیا ہے اور باہر جنگ کے نام پر آدمی زندوں کا قتل عام کر رہا ہے۔

راحل نے اپنا پورا زور لگایا۔ اس کو یقین ہو گیا تھا کہ اس کی زچگی آسانی سے ہونے والی نہیں ہے۔ اگر اسے فوراً اسپتال میں داخل نہیں کیا گیا تو یہ ماں اور اس کا بچہ دونوں کا بچنا مشکل ہے۔ کیا یہ بات اس وقت ممکن ہے۔ بہت ساری کوشش کے بعد اس نے بچے کو تو باہر نکال لیا لیکن وہ مر چکا تھا۔

بڑھیا اور اس کی بہو کے رونے کی آواز گھر کے ہر کونے میں گونجنے لگی۔ اتنے سالوں بعد پیدا ہونے والی اولاد بھی آخر نہیں بچ سکی۔ یا خدا..... اگر یہ جنگ نہ ہوتی تو میں کسی بھی طرح اپنے بچے کو بچا سکتی تھی۔ ان لوگوں کو تو نے کیسی قسم عطا کی ہے۔ بڑھیا نے [illegible] کرتے ہوئے بہو کو آرام کروا کے ایک طرف سلا دیا۔ مردہ بچے کو نہلا دھلا کر اس پر کپڑا لپیٹ دیا۔

راحل کمرے سے باہر آ کر اپنے پاؤں کا علاج شروع کیا۔ بڑھیا نے لکڑی کے دو ٹکڑے لئے۔ پاؤں کے دونوں طرف ایک کپڑے کے ساتھ مضبوطی سے باندھ دیا۔ شاید ہڈی نہیں ٹوٹی ہوگی۔ پھر "مائی اگر میرے آنے میں اگر تھوڑی دیر اور ہو جاتی تو تمہاری بہو بھی شاید بچ نہیں پاتی تھی۔ کسی بھی طرح میں نے بہو کو بچا لیا ہے۔ اب میں بہت تھک چکا ہوں۔ مجھے سونے کے لئے تھوڑی جگہ چاہئے۔" اس نے کہا۔ بڑھیا نے اسے اب بھی شک کی نگاہوں سے گھور کر دیکھتے ہوئے سوچا۔ یہ کون ہے؟ کیا ہمارا آدمی ہے یا دشمن کے ملک کا؟

ٹک..... ٹک..... دروازہ پر پھر دستک ہوئی۔ "اندر کوئی ہے..... دروازہ کھولو"

خاکی آواز بڑھیا کا شک یقین میں بدل گیا۔ آنے والا ہمارا آدمی نہیں ہے۔ ہمارا اور وطن کا غدار۔ ایک لمحہ کے لئے اس کی آنکھیں غصہ سے چمکیں۔ دروازے کے قریب آ کر اس نے پھر اس کا چہرہ دیکھا۔

وہ..... اس کی یہ آنکھیں جنگ پر گئے اپنے بیٹے کی ان آنکھوں جیسی ہی ہیں؟ مجبوری کی تصویر بنے۔ "دروازہ مت کھولو" اس نے اشارہ سے کہا۔

"دروازہ کھولو" اس مرتبہ باہر سے گرجدار آواز سنائی دی۔

اس نے مجھے کو تنہا چھوڑ دیا ہے؟ یہ سوچ کر بڑھیا نے کوئی آواز کئے بغیر اسے بہو کے کمرے میں پہنچا کر پلنگ کے نیچے چھپا دیا۔ کپڑے میں لپٹے بچے کی لاش کو لا کر دروازے کے قریب رکھ دیا اور باہر کا دروازہ کھولا۔

سپاہیوں کی وردی میں چار آدمی۔

"کیا کوئی زخمی سپاہی یہاں آیا ہے؟" وہ سوال کرتے ہوئے اندر گھس آئے

"نہیں تو....." بڑھیا نے کہا۔

"ہمارے یا ادھر والے" اس نے سوال کیا۔

ادھر والے ہم پر حملہ کرنے آئے تھے۔ ہم نے ان ہوائی جہاز کو مار گرایا۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

"مگر اس جہاز کے لوگ شاید زندہ نہیں بچے ہوں گے۔"

"اس گھپ اندھیرے میں تلاش کی کوشش بے کار ہے۔" ساتھ ہی دوسرے سپاہی نے کہا۔

"پھر بھی اس گھر کی تلاشی لے لو" اس نے حکم دیا۔ باقی لوگ تلاشی لینے اندر چلے گئے۔

بڑھیا نے رونا شروع کیا۔ ہوں..... دیکھو..... دیکھو میرے پوتے کی لاش یہاں پڑی ہے اس کو بھی دیکھو اس جنگ نے میرے پوتے کو بھی نہیں چھوڑا۔ یہ تو بتاؤ کہ یہ جنگ کس کے لئے اور کیوں ہو رہی ہے؟ یہ کہتے ہوئے اس نے لاش کے قریب بیٹھ کر پھر ایک بار سینہ کوبی کرتی ہوئی روتی بلکتی رہی۔

سپاہیوں نے اس بچے کی لاش کو غور سے دیکھا۔ اور پھر اس کمرہ میں پہلی زچگی کی بدبو کا ایک جھونکا ان کی ناکوں میں گھس آیا۔ آتے ہوئے سپاہی بغیر کسی آواز کے باہر چلے گئے۔

پھر راحل کو باہر بلایا اور کھانا کھلاتے ہوئے کہا کہ آج کی رات یہاں گذارو کل کوئی اور انتظام کریں گے۔

چند دن ایک ہی چھت کے نیچے زندگی گذارنے سے ایک دوسرے پر اعتماد آیا۔ دونوں نے آپس میں اپنے سکھ دکھ بانٹے۔ بڑھیا نے پہلے اپنی آپ بیتی سنائی۔

دیکھو بیٹا! مجھے اس گاؤں میں آئے شاید پچاس سال بیت گئے ہوں گے۔ شادی کے بعد نئی نویلی دلہن نے اس گاؤں میں قدم رکھا۔ چند دن آرام سے گذرے۔ ہماری کافی زمین جائیداد بھی کچھ تھا اور آج بھی ہے۔ لیکن چین اور آرام کے ساتھ یہ لوگ جینے کہاں دیتے ہیں۔ ان لوگوں کو جنگ چاہئے جنگ۔ بڑھیا نے حقارت سے کہا۔

کیا اس وقت بھی جنگ چھڑ گئی تھی؟ راحل نے بڑھیا سے پوچھا۔

ہاں..... اس وقت یہ گاؤں اس ملک والوں کے ہاتھ میں تھا۔ ان کا مذہب الگ تھا زبان الگ۔ اسی سبب سے جنگ ہوئی تھی۔ ہزاروں جانوں کی قربانی کے بعد جنگ کے بعد گاؤں اس دیس والوں کے ہاتھ آیا۔ گاؤں تو ہاتھ بدل گیا۔ لیکن کیا ہوا؟ کیا ہماری زندگی میں کوئی تبدیلی آئی۔ اس حکومت نے استحصال کیا اور یہ حکومت بھی استحصال کر رہی ہے۔ ہم لوگ تو ان پیٹ ایک کر کے مزدوری کر کے جو کچھ بھی کماتے ہیں یہ لوگ مختلف بہانے بنا کر مختلف ناموں سے لوٹ کر جاتے ہیں۔ کالا ہو کے جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ پھر بھی سہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ گھر کے جوان بچوں کو جنگ کے لئے کھینچ کر لے جاتے ہیں تو ان کا کیا ہوگا..... بڑھیا نے زمین پر ہاتھ مار کر کہا۔

کیا..... مائی..... اب تمہارا بیٹا کہاں؟ راحل نے سوال کیا۔

جنگ پر گیا ہوا ہے۔ جب وہ زبردستی کھینچ کر لے جانے لگے تو مجھ سے بغیر رہا نہیں جا سکا۔ انہوں نے کہا کہ مادر وطن کی حفاظت کے لئے یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ مادر وطن کون ہے۔ مادر وطن کون ہے۔ ابھی یہ چھوٹی عمر کا تھا۔ اس کا باپ جنگ کے لئے گیا واپس لوٹ کر نہیں آیا۔ سارا سیندور دھل گیا۔ [illegible] بیٹے کا یہ واقعہ آج بھی ہرا ہے۔ میں نے سارا غم پی لیا۔ اپنے بیٹے کو پالا۔ جوان ہونے پر اس کی شادی بھی کی۔ پانچ سال عرصہ کے بعد بہو امید سے تھی۔ اس اپنے بچے کی رونے بلکنے اور اس کی کلکاری کی آوازیں سننے کے لئے وہ منتظر اور بے تاب ہے۔ اتنے میں یہ جنگ شروع ہوئی۔ کہاں سے آ جائے تو بہتر ہے۔ [illegible] خبر تو بھی ہوگا..... آخری جملہ کہتے کہتے بڑھیا کا گلا رندھ گیا۔ آگے بات کو بڑھا نہ سکی۔

(باقی آئندہ)

جنگ

دوسری اور آخری قسط

کنڑ افسانہ نگار: سارہ ابوبکر
مترجم: ڈاکٹر محمد صبغت اللہ

کمرہ میں بیٹھے بیٹھے ٹی وی پر جنگ کے حالات کا جائزہ لینا ہی راحل کا معمول تھا۔ گذشتہ دو دن سے وہ غمگین تھا۔ جنگ کی خبریں ٹیوی کے پردے پر دکھائی جاتیں تو وہ بے چین ہو جاتا۔ کس کے لئے اور کس لئے یہ جنگ؟ مذہب کے نام پر یہ جنگ کی جا رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے کی جنگ تو ایک غیر مذہب والوں سے نجات پانے کے لئے کی گئی تھی۔ اب جو جنگ ہو رہی ہے وہ ایک ہی مذہب والوں کے درمیان ہو رہی ہے۔ غیر مذہب والوں سے نجات پانے پر بھی یہ لوگ آپس میں کیوں لڑ رہے ہیں؟ کیا ان دونوں ممالک کے قائدین کو بے وقوف سمجھنا چاہئے یا ان لوگوں کی ہٹ دھرمی؟

چند دن اور گذر گئے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ راحل رفتہ رفتہ بدل ہو تا جا رہا ہے۔ بڑھیا اور اس کی بہو بھی شاید اس کو بھلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ رات دن جنگی جہازوں کی پرواز جاری ہے۔ بمباری کی آوازوں سے کان کے پردے پھٹے جا رہے ہیں۔ راتوں کا بلاک آؤٹ جاری ہے۔

ایک دن اچانک ایک پیادے نے ٹیلی گرام لا کر بڑھیا کے ہاتھ میں تھما کر چل دیا۔ بڑھیا نے لے کر اندر آئی اور راحل کو دیا۔ راحل نے اسے پڑھ کر "او مائی گاڈ" کہتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

"اس ٹیلی گرام میں ایسا کیا ہے؟" بڑھیا نے حیرت کی صورت بنی بے چینی سے سوال کیا۔

راحل نے حساب لگتے ہوئے — وہ — وہ — وہ تمہیں مرتبہ کہنے کی کوشش کی۔ "اماں تمہارا — بیٹا —" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور سر جھکا لیا۔

بڑھیا اس خبر کے سنتے ہی ہوش و حواس کھو بیٹھی۔ چہرہ سفید ہو گیا — تو — تو — بڑھیا کی آواز گلے میں پھنس رہی تھی۔ راحل نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہائے — فاطمہ — بیٹی —"

بڑھیا دلخراش آواز سے چیخ پڑی۔ ساس اور بہو دونوں سینہ کوبی کرتے زار و قطار رونے لگے۔ ان کی یہ آواز گھر کے ہر کونے میں گونج رہی تھی۔ کافی دیر کی اس ہنگامہ آرائی کے بعد اوہر بڑھیا اچانک اٹھ کھڑی ہوئی اور راحل کی طرف دوڑتے ہوئے۔

"میں تجھے ابھی قتل کروں گی۔"

بڑھیا کی آنکھوں سے بدلے کی چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ "تیرے لوگوں نے آخر میرے بیٹے کو مار ڈالا؟ میں نے تجھ پر احسان کیا اور اس کا یہ بدلہ؟ کیا تیرے لوگوں کو قتل کرنے کے لئے میرا ہی بیٹا چاہئے تھا؟"

یہ کہتے ہوئے وہ دوڑ کر باورچی خانہ میں گئی اور ایک بڑا چاقو ہاتھ میں لئے باہر آئی۔

بڑھیا کے بھیانک روپ کو دیکھ کر راحل خوف سے کانپ اٹھا۔ ایسے میں بہو دوڑ کر آئی اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"امی جان! کیا تم یہ بھی بھول گئیں کہ انہوں نے میری جان بچائی ہے؟" اس نے روتے روتے پوچھا۔ "کسی اور کی غلطی پر کسی اور کو سزا دی جائے یہ کہاں کا انصاف ہے؟"

"ہاں — " راحل مطمئن انداز میں بڑھیا سے مخاطب ہوا۔ "تم نے اپنی آپ بیتی تو سنا دی لیکن میری آپ بیتی تو آپ نے نہیں سنی۔"

"جنگ کر کے ہمیں برباد کرنے والے تم لوگوں کی آپ بیتی سننا کون چاہتا ہے؟ اس سے پہلے کہ میں تم کو قتل کر دوں بہتر یہی ہے کہ تو میری آنکھوں سے دور ہو جا۔" بڑھیا غرائی۔

"جیسے آپ کی مرضی امی۔ ابھی یہاں سے چلا جاتا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ میری کہانی سنانے بغیر میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔"

"تیری کہانی — ؟ میرے دشمنوں کے قتل کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے؟"

"نہیں — دشمنوں نے میرا جو حال کیا ہے وہ — تو سن لیجئے۔ یہ اس کی کہانی ہے۔"

"ہاں —" بڑھیا نے ہاتھوں سے چاقو چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

"— بڑھ گئی۔ میری بہو بھی پیٹ پیٹ کر رونے لگی۔ اندر بہو بھی سینہ کوبی کرتے ہوئے رو رہی تھی۔" راحل بڑھیا کے قریب آیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر — "ماں — میں جنگ کرنے نہیں آیا۔ جنگ میں جو لوگ زخمی ہو جاتے ہیں ان کے علاج کے لئے آیا تھا۔ ایک بار تم نے پوچھا تھا کہ کیا تمہارے بیوی بچے بھی ہیں؟ لیکن میں نے اس وقت اس سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔ تمہارے بیٹے کی طرح اپنی اولاد حاصل کرنے اور بیوی کی خاطر — آخر تھک گیا۔ خدا نے ہمیں مایوس نہیں ہونے دیا۔ اس وقت میری بیوی امید سے تھی تو ہم دونوں خوشی کی انتہا پر پہنچ گئے تھے۔ بچہ آنے سے پہلے اس کے لئے سارا ضروری سامان فراہم کیا۔ بیوی کو اسپتال میں داخل کر دیا۔ اس نے بچے کو جنم دیا۔ آپریشن ہونے کے باعث اس کو کچھ دنوں کے لئے اسپتال میں رہنا پڑا۔ ادھر مجھے اپنا فرض پکار رہا تھا۔ مجبوراً مجھے اپنے فرض کو نبھانے کے لئے ان سے دور ہو جانا پڑا اور میں یہاں اس طرف سرحدی علاقہ میں چلا آیا۔ لیکن لوگ کبھی کبھی کتنے بے وقوف اور سنگدل ہو جاتے ہیں؟"

"کیوں — کیا ہوا —؟" اس کے سوال کرنے پر ایسا معلوم ہوا کہ بڑھیا اپنا غم بھلا کر اس کی آپ بیتی کو سن کر سن رہی ہے۔

"ہو گیا کیا تھا؟ ہمارے دشمن نے — آپ کے لوگوں نے اس اسپتال پر بمباری کی۔"

"کس —؟" بڑھیا نے تعجب سے پوچھا۔ "کیا اسپتال پر بمباری کی —؟"

"گھنٹہ میں تبدیل ہونے والے اس اسپتال کا نظارہ میں نے یہاں آپ کے گھر بیٹھے ٹی وی کے پردے پر دیکھا۔ میری ماں، بیوی اور بچے بھی بمباری کے باعث عمارت کے ملبے میں دب کر اپنی جان کھو بیٹھے۔ مرنے والوں کے نام بھی ٹی وی پر نشر کئے گئے۔ میرا خوش حال کنبہ ہی میرے لئے سب کچھ تھا۔ لیکن جنگ کے شکنجے میں پھنس کر پاش پاش ہو گیا۔ اب میں کہاں جاؤں بھی تو کس کے لئے؟ اور اگر جانا بھی چاہوں تو کہاں جاؤں؟" یہ کہتے کہتے اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا لیا۔ پھر آہستہ سے اس نے اپنا سر اٹھایا۔ بڑھیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"اماں اس اسپتال پر بمباری کرنے والا شاید تمہارا ہی بیٹا ہو گا؟"

اس واقعہ کے گذر جانے کے بعد بھی جنگ کا سلسلہ ایک دو ہفتوں تک جاری رہا۔ راحل بڑھیا کے گھر میں ہی موجود تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بڑھیا بیٹے کے غم سے ماتم ہی ہوتی جا رہی ہے۔

دونوں ممالک نے جنگ میں کافی نقصان اٹھائے۔ جنگی اسلحہ کی خریدی پر دونوں ممالک کے خزانے خالی ہو گئے۔ لہٰذا چیزوں کی کمی کے باعث ان چیزوں کی قیمتیں آسمان کو چھونے لگیں۔ بربادی کے بعد دونوں ممالک کے قائدین نے جنگ بندی کا اعلان کیا۔

راحل اپنے پاؤں پر بندھی پٹی کو کھولا۔ ہڈی کے ٹوٹنے سے پاؤں کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا تھا۔ اس وقت ٹی وی پر خبریں نشر ہو رہی تھیں۔ ان خبروں میں دونوں ممالک کی مصالحت کی خبر اہم تھی۔

دونوں ممالک کے قائدین نے دل کی گہرائیوں سے جنہا اور ساتھ ہی دونوں آپس میں ہاتھ ملا رہے تھے۔ اس منظر کو جب ٹی وی پر دکھایا گیا تو بڑھیا، اس کی بہو اور راحل بیہ سب بت کی طرح اس منظر کو دیکھتے رہے۔

اچانک بڑھیا کا چہرہ سفید ہو گیا۔ غم کی ایسی تصویر جو اس کی آنکھوں میں نظر آ رہی تھی بیان سے باہر ہے۔ پھر ان آنکھوں میں غصہ ابھر آیا۔ آنکھیں انگارہ بن گئیں۔ بڑھیا کے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا۔ اس نے اسے نشانہ بنا کر ٹی وی کے اسکرین پر دے مارا۔

راحل واپس جانے کے لئے تیار ہوتے لگا۔ اس کا دل غم سے بوجھل تھا۔ اپنے وطن کے لئے اس نے بہت بڑی قربانی دی تھی اور اسے کافی نقصان بھی اٹھانا پڑا تھا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اس کا دوست، دشمن کون ہے؟ ماں ہے تو یار دشمن۔ اب یہ میرا دوست دشمن کیوں نہیں ہو سکتا۔

"راحل — !" بڑھیا کی غم سے بھری آواز کو سن کر اس نے اپنا سامان باندھتے پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا۔

"دیکھو تم نے کہا تھا کہ گاؤں میں تمہارا کوئی بھی نہیں ہے۔ میں بڑی بد قسمت ہوں۔ اس جنگ میں میں نے اپنے بیٹے اور پوتے دونوں کھو دیے۔ اب تو ہی میرا بیٹا کیوں نہیں بن جاتا؟"

راحل نے تعجب سے پوچھا: "یہ کیسے ممکن ہے؟"

"ممکن کیسے نہیں؟ کیا اپنی کوکھ سے پیدا ہونے والی ہی اپنی اولاد ہوتی ہے؟ اگر میری بہو نے یہ بات مان لی تو تو اس سے شادی کر لے۔ بہو بیٹے کا پتہ مجھے لے گا۔ ماں اور بیوی کا پتہ تجھے۔ بتا تمہاری کیا مرضی ہے؟"

"اماں — تم اپنے آپ کو بد قسمت کیسے کہہ سکتی ہو؟ سینہ کے اس پنجرے میں اتنا بڑا دل رکھنے والی بد قسمت کیسے ہو سکتی ہے؟"

بڑھیا نے اب کی بار دل کھول کر ہنسا۔ پھر ان دونوں قائدین نے تو راضی ہو کر آپس میں ہاتھ تو ملایا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان ماؤں اور بیویوں کے دلوں — بیٹے والی ان خون کی ندیوں پر بند باندھے — کے کس طرح الجھنیں کو بلا کر لائیں گے؟

"یہ تو بے وقوف ہیں۔ ان کے خلاف بغاوت کا ہی راستہ ہمارے سامنے ہے۔" بڑھیا نے کہا۔

شورش

کنڑ افسانہ نگار ..... پریما بھٹ

مترجم ..... ڈاکٹر محمد صبغت اللہ

26-4-1999

"تمل ناڈو میں اردو"

کتاب کا نام : تمل ناڈو میں اردو
مصنف : علیم صبا نویدی
قیمت مجلد : 250/- روپے
ناشر : مصنف
پتہ : 26، امیر النساء بیگم اسٹریٹ، ماونٹ روڈ، مدراس 2
سن اشاعت : جنوری 1998، دوسرا ایڈیشن
صفحات : 434
مبصر و نگار : پروفیسر محمد [illegible]

ریاست مدراس (تمل ناڈو) تاریخ میں ایک انفرادی حیثیت کی حامل ہے۔ رقبے کے اعتبار سے ایک زمانہ میں یہ وسیع علاقہ تھا اس کی حدیں وسیع تر تھیں۔ آزادی کے بعد اس کی جغرافیائی حدود میں تخفیف ہوئی اس کے مختلف علاقے پاس پڑوس کی ریاستوں میں بٹ گئے۔ اس ریاست میں اردو شعر و ادب کا ارتقا ہوا اور اس کے ارتقاء کے بارے میں ابتدائی کاوشیں پیش کی ہیں جیسے بنگال میں اردو، بہار میں اردو، راجستھان میں اردو وغیرہ۔ ایک اردو کے طالب علم کو ان سب پر نظر رکھ کر اس کے ارتقاء کو سمجھنا چاہئے۔ مسلمانوں کا اور اردو ہندوستان چاہے وہ شمال کی جانب ہے [illegible] حیثیت فاتح ہو یا جنوب میں بحیثیت [illegible] اسلام اور اردو زبان کو [illegible] ایک ترقی یافتہ شکل میں ادب کو بھی پیش کرتا ہے۔ اس [illegible] اردو داں خوش نصیب ہیں کہ ان کے پاس اس زبان و ادب کا بہت بڑا سرمایہ ہے [illegible] تاریخ ہے، خوش قسمتی سے ملک کے مختلف ریاستوں میں ایسے محققین بھی پائے جاتے ہیں جنہوں نے اپنے اپنے علاقوں میں اس زبان کے ادب اور ارتقاء پر روشنی ڈالی اور انہیں کتابی شکل میں شائع کیا جس سے ان علاقوں میں اس زبان کی ترقی کی رفتار اور وہاں کا اردو ادبی سرمایہ منظر عام پر آیا۔ اردو کا کوئی ادیب ان سارے علاقائی تاریخوں کو جمع کر کے اردو کی ادبی تاریخ کو مرتب کرے تو شاید ہندوستان کی ایک مکمل تاریخ ادب اردو مل جائے گی۔ ظاہر ہے یہ کام کسی ایک انفرادی کوشش کا نتیجہ نہیں ہو سکتی اس کو قومی سطح پر ہی کیا جانا چاہئے۔

مندرجہ بالا تصنیف کا مصنف کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اردو دنیا انہیں اچھی طرح جانتی ہے ان کی 27 کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور دو کتابیں زیر طبع ہیں۔ تمل ناڈو میں اردو (1824-1986) تقریباً 162 سال کا احاطہ کرتی ہے جس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ "زیر نظر تذکرہ اردو ادب میں میرا تیسرا قدم ہے۔۔۔۔ میرا تیسرا قدم حقیقتاً پہلا قدم ہے جس کو اپنی منزل تک رسائی حاصل کرنے میں تقریباً 22 سال کا طویل سفر طے کرنا پڑا۔ 1980 میں اس تذکرے کی ترتیب "یاد رفتگاں" اور "نشان ہم عصراں" کے عنوانات سے "آغاز" مدراس کے [illegible] ایڈیشن میں بالالتزام شائع ہوتی رہی۔"

یہ کتاب 1998 میں شائع ہوئی۔ 1986 تا 1998، تقریباً بارہ سال بعد یہ منظر عام پر آئی۔ اگر مصنف نے کوشش کی ہوتی اس عرصے کو بھی اپنے دائرہ میں لے آتے۔ ایک مکمل تاریخ بن جاتی۔ اس تذکرہ میں شامل 212 ادباء، شعراء کی کاوشوں کو پیش کرنے سے قبل 13 ذیلی سرخیوں کے تحت 86 صفحات میں تمل ناڈو میں اردو کا جو پس منظر پیش کیا گیا ہے وہ کافی اہم ہے۔ جس میں نثر، غزل، نظم، جدید شاعری اور نئے تجربے، مثنوی کا فن، تنقیدی شعور کا سلسلہ، سوانحی خدمات، تصنیفات اور تالیفات کا سلسلہ، عربی مدارس میں اردو کی خدمات، افسانے کا فن شامل ہیں۔ مصنف کتاب نے [illegible] کو اپنے احاطہ میں لانے کی شعوری کوشش کی ہے۔ [illegible] ناول نگار، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار اور ان کی تخلیقات کو ایک منظم [illegible] کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ اختصار کے مد نظر انہیں چیزوں اور کارناموں کو پیش کیا جاتا ہے جو ان میں سب سے بہتر خیال کئے جاتے ہیں۔ لیکن مصنف کتاب نے ان [illegible] سے ہٹ کر [illegible] کی طرف توجہ کی ہے۔ وہ کافی اہم ہے [illegible] ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں اور [illegible] ادبی خدمات [illegible] باعث [illegible] میں شہرت یافتہ ہیں ان کا جائزہ لینا بھی اہم کارنامہ ہے۔ [illegible] کا مطلب یہ ہوا کہ اردو [illegible] ترقی کیلئے جو حصہ حاصل کرنا چاہا مصنف نے [illegible] تعلیمی، سندی وغیرہ [illegible] اپنے احاطہ میں لانے کی کوشش کی ہے۔ مصنف علیم صبا نویدی لائق صد تحسین ہیں کہ انہوں نے اس کام کا [illegible] ریاست تمل ناڈو نے کوئی [illegible] اور وہ خود بھی ایک ادیب و شاعر ہیں [illegible] صفحہ 17 پر مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ "اس کتاب کا نام "تذکرہ شعراء تمل ناڈو" ہے اور یہ سچ ہے کہ شعراء کا یہ تذکرہ اس کتاب کا جزو اعظم ہے لیکن یہ اردو نثر کی تاریخ سے خالی نہیں ہے"۔ لیکن سرورق پر آپ اس کتاب کا نام "تمل ناڈو میں اردو" دیکھیں گے۔ اندرون صفحات 88 تا 426 اس بات کے شاہد ہیں کہ واقعی یہ تذکرہ ہی ہے لیکن روایتی تذکرہ نگاری سے ہٹ کر کچھ اور قدم آگے بڑھا کر یہ تاریخ میں شامل ہونا چاہتا ہے۔ چونکہ مصنف بنیادی طور پر تخلیقی فن کار ہے شاعر ہے لہٰذا فطری طور پر شاعری پر زیادہ توجہ دی ہے۔ یہ کوشش انفرادی ہے اس کو جتنا بھی سراہا جائے کم ہے۔ صفحہ 28 پر رقم طراز ہیں کہ بیسویں صدی میں پرتو مدراسی، شاعر مدراسی، منور حسین خان گوہر مدراسی کے علاوہ شاگرد علی، مولانا محوی صدیقی، مولانا یوسف کوکن، مولانا سروش [illegible] ناطق [illegible] اردو ادب کی جو نمونی خدمات انجام دیں ان کو [illegible] مدراسی [illegible] اردو ادب کی بقا و ترقی کیلئے جان توڑ [illegible] کوشش کے تعلق سے زندہ رہیں گے۔ اس کتاب کی ترتیب میں انہوں نے 86 کتب اور 35 جرائد و رسائل کی مدد لی ہے۔ 212 شعراء کے حالات اور نمونہ کلام تو دیا گیا ہے لیکن ان میں تنقیدی شعور کی کمی بڑی طرح محسوس ہوتی ہے۔ وہ ادباء و شعراء کے بارے میں اپنی ذاتی اور انفرادی رائے پیش کرتے ہیں جس سے قاری کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

پروفیسر محمد صبغۃ اللہ

کرناٹک۔ سیاحوں کی جنت

قدرتی اور انسانی وسائل کے ملے جلے اقدامات اور کارناموں نے ریاست کرناٹک کو سیاحوں کی جنت بنادیا ہے۔ یہ ریاست طویل طلائی سمندری ساحلی کنارے کی حامل ہے۔ مشرقی اور مغربی گھاٹ کا بلند و بالا پہاڑی سلسلہ ہرے بھرے جنگلات سے پر مختلف النوع درندوں چرندوں پرندوں کا حامل ہے، تو ساتھ ہی ہری بھری گھاس، قیمتی درخت اور مختلف اقسام کے پیڑ پودوں اور پھولوں کا منبع بھی ہے۔ مشرق اور مغرب میں رواں طول طویل ندیاں انہیں گھاٹوں میں جنم لیکر اپنے ساتھ زرخیز مٹی بھی لے آتی ہیں اور ریاست کی زرعی پیداوار میں مدد کرتی ہیں۔ یہی ندیاں کئی جگہ خوبصورت آبشار بناکر گرتی ہیں اور سیاحوں کا من موہ لیتی ہیں۔ میدانی علاقوں میں بہنے والی ندیاں اپنے ساحلوں پر خوبصورت سنگین پہاڑوں کے حامل ہیں جو دیکھنے میں سنگین پارک معلوم ہوتے ہیں دراصل یہ قدرتی پارک ہیں جن کے دیدے سیاح لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کرناٹک پر حکومت کرنے والے راجے مہاراجے جیسے گنگا، کدمبا، چالوکیا، ہویسلا، راشٹر کوٹا، وجیانگر کے راجے مہاراجے، گلبرگہ و بیدر کے بہمنی سلاطین، بیجاپور کے عادل شاہی حکمران، میسور کے وڈیار اور کیلادی کے حکمرانوں نے اپنے اپنے دور حکومت میں خوب صورت قلعے، مینار، ہند اسلامی طرز کے شاندار مساجد اور مقابر تعمیر کئے جو خوبصورت نقش و نگاری سے مزین ہیں۔ پورچگیز اور انگریزوں نے یوروپین نشاۃ الثانیہ کے دور فن تعمیر کا استعمال کر کے بلند و بالا شاندار عمارات اور گرجا گھروں کی تعمیر کی۔ جنگلی جانوروں اور پرندوں کی سیانچوریوں میں جنگلی جانور جیسے ہاتھی، شیر، جنگلی بھینسے، ہرن، مور اور لاتعداد جنگلی جانوروں کو اپنے فطری ماحول میں دیکھا جا سکتا ہے۔ نیشنل پارکوں میں لمبے اونچے پیڑ پودے، جھاڑیاں اور دیگر ہری بھری چیزیں سیاحوں کو اپنی طرف راغب کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کرناٹک صندل، پیپل اور برگد کے طول طویل درختوں کے لئے مشہور ہے۔ صندل جہاں اپنی خوشبو سے مسرت بخشتا ہے تو یہ لمبے اونچے پیپل اور برگد کے پیڑ سیاحوں کو اپنی چھاؤں میں آرام بہم پہنچاتے ہیں۔ اگر کوئی سیاح روحانی فیض حاصل کرنا چاہتا ہے تو کرناٹک میں ہندو، مسلمان عیسائی جین یا ویرشیوا کے مذہبی پیشواؤں کے نامور مراکز ہیں، جس مذہب کا پیرو ہے وہاں سے روحانی فیض حاصل کر سکتا ہے۔

ریاست کرناٹک اندازاً ۱۱.۵ ڈگری شمال اور ۱۸.۵ ڈگری طول بلد اور ۷۴ ڈگری مشرق اور ۷۸.۵ ڈگری مشرق عرض بلد پر واقع ہے۔ جبکہ مشرق و مغرب کے دونوں گھاٹ نیلگری میں آکر ملتے ہیں۔ یہ ریاست بھارت کے مغربی حصہ میں دکن کے سطح مرتفع میں واقع ہے۔ اس کی سرحدیں شمال میں مہاراشٹر، شمال مغرب میں گوا، مغرب میں بحیرہ عرب، جنوب میں کیرالا اور تمل ناڈو کی ریاستوں سے اور مشرق میں آندھرا پردیش سے جڑتی ہیں شمال جنوب اس کی لمبائی ۷۵۰ کیلو میٹر اور مشرق مغرب اس کی چوڑائی ۴۰۰ کیلو میٹر ہے اس درمیان ۱۹۱،۷۹۱ مربع کیلو میٹر کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ ملک میں پائے جانے والے سطحی پانی کے ذرائع میں تقریباً ۶ فیصد یعنی ۷الاکھ ملین کیوبک میٹرس کرناٹک میں پایا جاتا ہے۔ اس میں ۴۰ فیصد مشرق سے بہنے والی اور بقیہ مغرب سے بہنے والی ندیوں سے حاصل ہوتا ہے۔ **کرشنا ندی**: اس ندی کے بڑے معاون ندیوں میں بھیما، کوینا، پنچ گنگا، دودھ گنگا، تنگبھدرا، ہرنا کیشی، گھٹ پربھا اور ملپربھا ہیں۔ **کاویری ندی**: اس کی اہم معاون ندیاں ہیماوتی، لکشمن تیرتھا، ہرنگی، کبنی، سورناوتی، لوک پاونی شمشا اور ارکاوتی ہیں۔ **گوداوری ندی** کی اہم معاون ندی منجرا ہے۔ مغرب سے بہنے والی لاتعداد ندیوں میں شراوتی، کالی، گنگاوتی اگھاشنی اور نیتراوتی اہم ہیں۔

اکتوبر تا مارچ کا موسم جو مانسون کے بعد کا موسم اور سرما کا موسم ہے، عام طور پر ساری ریاست میں بہت خوش گوار موسم ہوتا ہے۔ اکتوبر تا دسمبر تھوڑی برسات کے ساتھ شمال مشرقی مانسون کے ساتھ مل کر جنوب مشرقی حصہ پر اثر پذیر ہوتا ہے۔ اپریل اور مئی کے مہینے گرم سوکھے اور عام طور پر تکلیف دہ ہوتے ہیں، جون کے مہینے میں خنکی اور درجۂ حرارت کے بڑھ جانے سے گرمی میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ بعد کے تین مہینے جولائی اگست اور ستمبر عام طور پر آرام دہ ہوتے

ہیں۔ دن میں درجہ حرارت میں کمی اور خنکی کے اضافہ کے باوجود یہ موسم آرام دہ ہوتا ہے۔

ریاست کا تہذیبی ورثہ بہت زیادہ گوناگوں اور مالدار ہے۔ کنڑ ادب نے اپنا ادبی کام یہاں نویں صدی سے شروع کیا۔ موجودہ دور میں اس نے سات گیان پیٹھ ایوارڈ یافتگان پیدا کئے۔ یہاں پر پڑوسی ریاستوں کی ادبی کارروائیوں کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ صحافتی میدان میں اس کی تاریخ ۱۸۴۳ء سے شروع ہوتی ہے۔ بھارت کے موسیقی کے نقشے میں ریاست نے بہت ہی نمایاں جگہ حاصل کی ہے۔ ہندوستانی موسیقی ہو یا کرناٹک موسیقی، کرناٹک موسیقی تو یہاں کی پیداوار ہے۔ رقص اور فنون لطیفہ بھی ریاست میں ترقی پذیر ہے۔ شیورام کارانت، کومپو، ملکارجنا منصور، ٹی۔ چوڑیا، کے۔ کے ہیبار، گنگوبائی ہانگل، بی وی کارنت، گریش کرناڈ وغیرہ یہ چند ایسے چہرے ہیں جو تمدن کے پردے پر چمکتے دکھائی دیتے ہیں۔

ریاست میں اردو زبان وادب کا فروغ ۔ اردو زبان ریاست میں نو فیصد آبادی کی زبان ہے۔ یہ ریاست کے اکثر مسلمانوں کی مادری زبان ہے۔ دکن کے مسلم دور حکومت میں ایک نئی بولی کی شدت سے کمی محسوس کی جانے لگی جو حاکم اور محکوم کے درمیان رابطہ کا کام دے سکے۔ نئی بولی دکھنی نے یہ کام انجام دیا اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکجہتی قائم کی۔ بہمنی سلاطین کی سرپرستی نے اسے شاہی مرتبہ عطا کیا اور اس میں ادبی کارنامے انجام پائے جانے لگے۔ حیدر علی خان بہادر اور ٹیپو سلطان کے دور میں اس زبان نے کافی ترقی کی۔ میسور کے مہاراجاؤں کے دور میں بھی اس کو شاہی سرپرستی حاصل رہی۔ ریاست کرناٹک میں ۱۹ ویں صدی کا دور اس زبان کا سنہری دور تھا۔ تعلیم نسواں نے ادیبہ اور شاعرہ پیدا کئے۔ بیسویں صدی میں اردو اخبارات اور رسائل شائع ہونے لگے ۱۸۶۰ء میں پہلا اردو اخبار "قاسم الاخبار" بنگلور سے شائع ہوا۔ ۱۸۴۸ء میں پہلا اردو لیتھو پریس 'متاع فردوس' بنگلور میں شروع ہوا۔ آج تقریباً دو سو لیتھو پریس اور ۳۰ کے قریب پاور پریس ساری ریاست میں اردو کی ترویج واشاعت میں منہمک ہیں۔ تقریباً ۴۳۸ عربی الفاظ اور ۶۱۴ فارسی الفاظ اردو کے ذریعہ کنڑا میں داخل ہو چکے ہیں جن کو عام طور سے ریونیو کے دستاویزات میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً زمینداری، مزرائی، مسیدی (مسجد)، کماشتہ، کچہری، کھرچو (خرچ) دیوان، کارکھانے (کارخانہ) وغیرہ۔ ریاست کرناٹک نے تہذیب وثقافت کے فروغ کے لئے ریاست میں کنڑا و کلچر کا شعبہ قائم کیا جس کے ماتحت آج دس مختلف اکادمیاں کام کر رہی ہیں ان میں اردو کے فروغ کے لئے ۱۹۷۵ء میں کرناٹک اردو اکادمی کا قیام بھی عمل میں آیا۔ اس دن سے آج تک یہ اکادمی ریاست میں اردو کے فروغ کے ساتھ ساتھ کنڑا ادب سے بھی رابطہ قائم کئے ہوئے ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔

آیئے اب ذرا ریاست کے مختلف اضلاع کی سیر وسیاحت کا لطف اٹھائیں۔ سب سے پہلے ہم آپ کو ریاست کے صدر مقام کی سیر کرالیں پھر دیگر اضلاع کی۔

بنگلور:۔

یہ شہر ریاست کا صدر مقام ہے۔ سمندری سطح سے ۳۰۰۰ فٹ بلندی پر واقع ہے یہاں کی آب وہوا پکنک کے ماحول جیسی خوشگوار ہوتی ہے۔ ۱۵۳۷ء میں اس شہر کی بنیاد کیمپے گوڈا نے رکھی تھی۔ ریاست کا صدر مقام ہونے کے ناطے اس کا صدر دفتر ودھان سودھا (۱۹۵۶) شہر کے بالکل قلب میں واقع ہے۔ یہ خوبصورت سنگین عمارت سات سو فٹ طویل، تین سو فٹ عریض اور ڈیڑھ سو فٹ بلند ہے۔ اس خوبصورت عمارت کی دید کے لئے سیاح بڑے دور دراز سے آتے ہیں۔ اس کے علاوہ شہر بنگلور میں اٹھارہ کچہری (۱۸۶۴، موجودہ ہائی کورٹ بلڈنگ) میوزیم، بنگلور پیالیس (۱۸۸۷) ٹیپو پیالیس، ٹیپو سلطان کا قلعہ، لال باغ جس کی تاسیس نواب حیدر علی خان بہادر نے ۱۷۶۰ء میں رکھی تھی جو ۲۴۰ ایکڑ احاطہ پر محیط ہے۔ گلاس ہاؤز، جنرل پوسٹ آفس، انڈین انسٹیٹیوٹ آف سائنس، کمار کرپا، میو ہال، بورنگ انسٹیٹیوٹ، منٹو ہاسپٹل، اورینٹل بلڈنگ، ٹاؤن ہال، راج بھون، شیشادری میموریل ہال، رویندر اکلا کشیترا، کبن پارک (۱۸۶۴) کرپا میموریل پارک، پلانیٹوریم چترا کلا پریشد، وسویشوریا انڈسٹریل میوزیم، دیکھنے لائق مقامات ہیں۔ بیرون شہر بنگلور کے جنوب کی جانب بنرگھٹہ نیشنل پارک ۲۲ کیلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ ہرے بھرے ماحول سے گھرا ہے۔ یہاں مناظر کے علاوہ لائن سفاری اور مگرمچھ فارم دیکھنے کی چیزیں ہیں۔ مغربی جانب ۲۸ کیلو میٹر کے فاصلے پر راموہلی میں ایک برگد کا پیڑ ہے جو تین ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے۔ ۶۰ کیلو میٹر کے فاصلہ پر بنگلور کے شمالی جانب نندی ہلز، ہل سٹیشن ہے۔ شیر میسور کی یہ پسندیدہ جگہ تھی۔ انگریزوں کی

بھی یہ جگہ کافی پسند تھی۔ یہاں پر ۲۰۰ میٹر اونچا ٹیپو ڈراپ لائق دید منظر ہے۔ ۹۸ کیلو میٹر کے فاصلے پر میکے داٹو ایک خوبصورت پکنک سپاٹ ہے۔

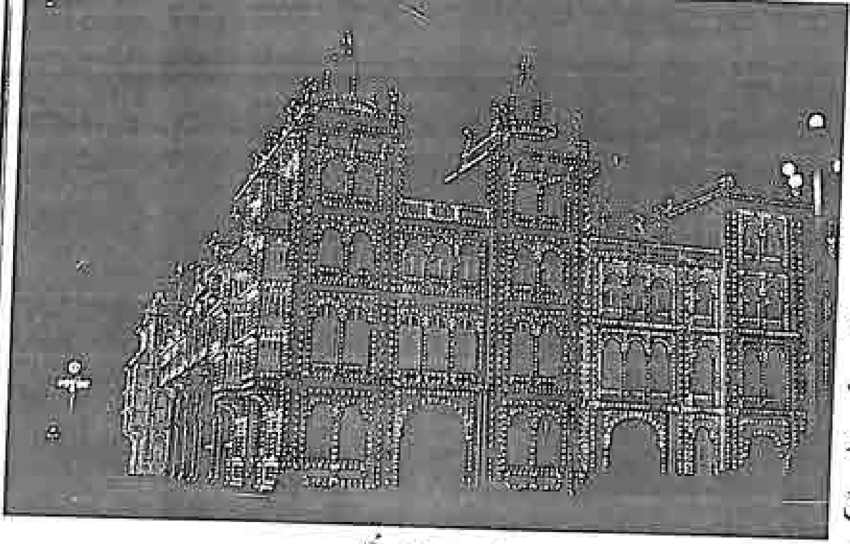

میسور کا شاہی محل

میسور:۔

بنگلور سے ۱۴۰ کیلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ وڈیر خاندان کے حکمرانوں کا صدر مقام تھا۔ آج بھی اس دور کے راجے مہاراجاؤں کی شان و شوکت کو اجاگر کرنے والی عمارات، محلات، خوبصورت باغات، وسیع و عریض سایہ دار راستے، مساجد و منادر گرجا گھر شہر کی زیب و زینت میں اضافہ کئے ہوئے ہیں اور ان کی بڑی اچھی دیکھ بھال بھی ہو رہی ہے۔ وڈیروں کے دور حکومت میں شہر میسور کی شان و شوکت انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ شہر میسور کی سیر و سیاحت ماہ اکتوبر میں انتہائی دیدہ زیب ہوتی ہے، جبکہ یہاں پر دس دن تک دسہرہ کا مشہور تہوار منایا جاتا ہے۔ اس موقع پر میسور کے محل کو برقی قمقموں سے بقعۂ نور بنا دیا جاتا ہے۔ شہر کے اہم راستوں کو کمانوں سے سجا کر ان میں بھی بجلی کے قمقمے لگائے جاتے ہیں۔ رنگین کپڑوں میں سجے سنورے لوگ ثقافتی پروگراموں میں حصہ لیتے ہیں۔ جن میں قدیم موسیقی، عوامی رقص، بھرت ناٹیم، یکشاگانہ، ہتھری، ٹارچ لائٹ پریڈ، تیپو تسوا مشہور ہیں۔ اس موقع پر دسہرہ کے آخری یعنی دسویں دن سب سے زیادہ موثر اور من موہک دسہرہ جلوس ہوتا ہے۔ جس میں سجے سجائے ہاتھی سونے کا ہودہ لئے نکلتے ہیں۔ اس جلوس میں سجے سجائے گھوڑے شاندار گاڑیاں، جلوس کے لئے مخصوص یونیفارم پہنے پولیس، عوامی رقص کرتے پرے کے پرے، اور رنگارنگ مختلف نمونوں کی جھانکیاں دیکھنے کو ملیں گی۔ میسور کا موجودہ محل (۱۹۱۲) بڑا خوبصورت محل ہے۔ یہ محل ہند اسلامی طرز تعمیر کا ہے۔ یہ گنبدوں، کمانوں، میناروں اور برجوں سے سجا ہے۔ یہ محل نفیس نقاشی اور فن کا خزانہ ہے۔ اس محل کی تعمیر میں دنیا بھر کے کاریگروں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس محل کے منقش دروازے پر تکلف کمروں میں کھلتے ہیں۔ شاہی دربار ہال مزین چھت اور منقش ستونوں سے سجا ہے۔ دسہرہ تہوار کے موقع پر یہاں آپ وڈیر خاندان کی شان و شوکت کا مظہر اور فرماں روائی کی نشانی، شاندار جڑاؤ سونے کا شاہی تخت دیکھ سکتے ہیں۔ دیگر عام دنوں میں اتوار اور عام تعطیلوں کے مواقع پر محل کی لائٹنگ تھوڑے وقت کے لئے کی جاتی ہے تاکہ سیاح اس منظر سے لطف اندوز ہو سکیں۔

دسہرہ کا منظر

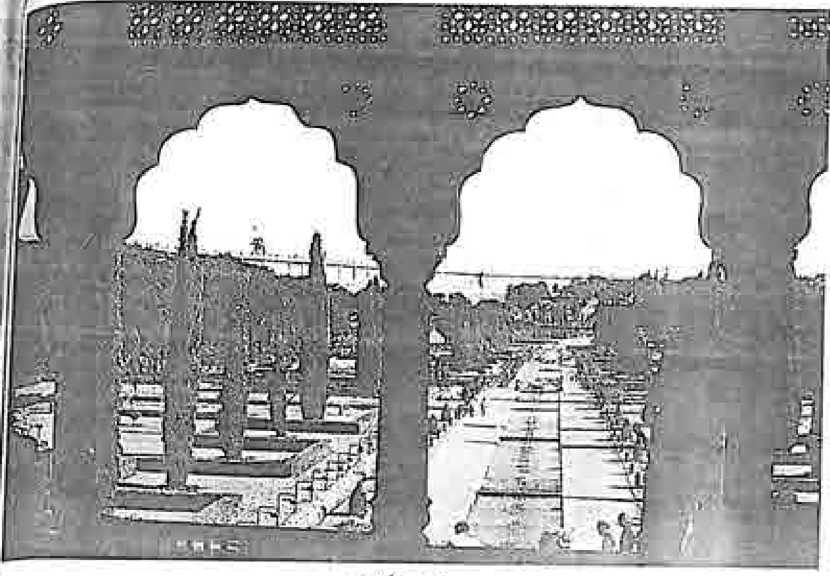

برنداون گارڈن

میسور زو، شاہی سرپرستی میں اس کی تاسیس ۱۹ ویں صدی میں ہوئی۔ یہاں درندوں، چرندوں اور پرندوں کے نایاب نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔ نایاب جانوروں کی افزائش نسل کے لئے یہ جگہ مشہور ہے۔ کے۔ آر ساگر:۔ میسور سے ۱۹ کیلو میٹر کے فاصلے پر شمال مغرب میں واقع ہے۔ بند کے نیچے خوبصورت برنداون باغ ہے۔ ہلکی موسیقی کے ساتھ رقص کرنے والے فوارے اور زیر آب رنگین بجلی کے لائٹ لائق دید خوبصورت نظارہ پیش کرتے ہیں۔ روزانہ ہزاروں کی تعداد میں لوگ یہاں تفریح کے لئے آتے ہیں۔

شری رنگاپٹن:۔

بنگلور میسور شاہراہ پر واقع یہ تاریخی شہر ہے۔ بنگلور سے ۱۲۶ کیلو میٹر اور میسور سے ۱۶ کیلو میٹر کے فاصلے پر میسور کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ کاویری ندی کی دو شاخوں کے درمیان یہ ایک جزیرہ ہے۔ یہ شہر نواب حیدر علی خان بہادر اور ان کے صاحب زادے شیر میسور حضرت ٹیپو سلطان شہید کا پایہ تخت رہا۔ موسم گرما کا محل دریا دولت باغ ۱۷۸۴ء میں تعمیر کیا گیا۔ یہ ان کی پسندیدہ رہائش گاہ تھی۔ اب اس کو میوزیم بنا دیا گیا ہے۔ اس محل میں نفیس کاریگری اور نقاشی کے نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہاں پر اندرون حصار شہر بسا ہے۔ جس میں مسجد اعلیٰ اور رنگناتھ کا مندر موجود ہے۔ بیرون حصار گنبد شاہی جو حضرت ٹیپو سلطان شہید، نواب حیدر علی خان بہادر اور ٹیپو کے والدہ فاطمہ بی کی آرام گاہ ہے۔ اس کے آبنوسی دروازے ہاتھی دانت کے نقش و نگار سے آراستہ ہیں۔ شری رنگاپٹن سے ۳؍کیلو میٹر کی دوری پر کاویری ندی کی یہ دونوں شاخیں پھر سے مل کر سنگم بناتی ہیں۔ شری رنگاپٹن سے ۳؍کیلو میٹر اور میسور سے ۱۸؍کیلو میٹر کی دوری پر رنگن تھٹو برڈ سینکچری ہے۔ یہاں پر سائبیریا کے پرندے چند دنوں کے لئے مہمان بن کر آتے ہیں اور افزائش نسل کے بعد اپنے وطن لوٹ جاتے ہیں۔ ان پرندوں کو بڑے قریب سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ کاویری ندی کے بڑے بڑے مگرمچھوں کو جو دھوپ میں پڑے رہتے ہیں قریب سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مٹی کے ڈھیر ہیں۔ بڑا پر سکون اور پر فضا منظر دیکھنے لائق ہوتا ہے۔ بہترین موسم جون تا فروری ہے۔ میسور سے ۳۵؍کیلو میٹر کے فاصلہ پر مشرق جانب سومناتھ کا مندر ہے۔ ستارہ نما تیرھویں صدی کا بنا ہوئیسلا کے دور کا مندر ہے۔ تلکاڈ مشرق جانب ۴۵؍کیلو میٹر کے فاصلہ پر کاویری ندی کے کنارے ساحل پر ریت کے ڈھیروں میں یہاں کے مندر دبے ہوئے ہیں ۱۲؍سال میں ایک مرتبہ ان مندروں کو خاص پوجا کے لئے کھولا جاتا

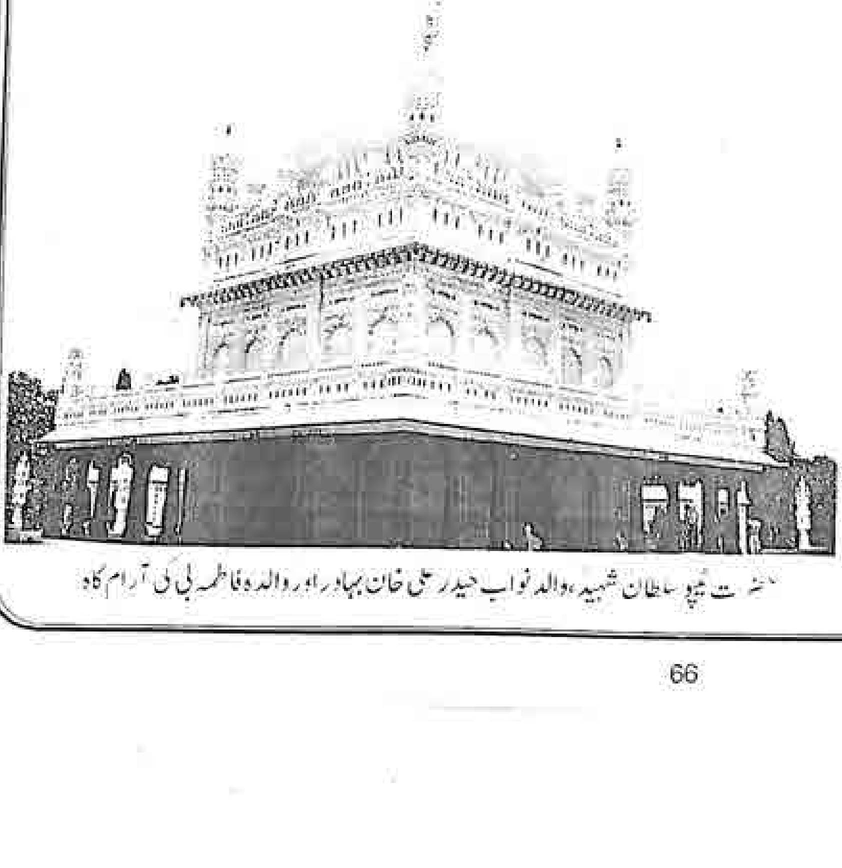

حضرت ٹیپو سلطان شہید، والد نواب حیدر علی خان بہادر اور والدہ فاطمہ بی کی آرام گاہ

ہے۔ میسور سے ۸۵ ر کیلو میٹر کے فاصلہ پر مشرقی جانب شیو سمندر واقع ہے۔ جہاں کاویری ندی دو آبشار بنا کر ۷۵ ر میٹر کی بلندی سے چٹانوں میں گرتی ہے۔ موسم باراں میں یہ آبشار دیکھنے لائق ہوتے ہیں۔ یہاں سے ۱.۵ ر کیلو میٹر کی دوری پر ایشیا کا پہلا ہائیڈرو الیکٹرک پاور پراجکٹ ۱۹۰۵ء میں بنایا گیا۔ بندی پور نیشنل پارک اور ٹائگر ریزرو ملک کے پندرہ ٹائگر پراجکٹوں میں سے ایک ۱۹۷۳ء میں ورلڈ وائلڈ لائف فنڈ سے قائم کیا گیا تاکہ شیروں کو بچایا جاسکے۔ ۹۲ ر کیلو میٹر کے فاصلے پر ناگر ہو لے نیشنل پارک اور کبنی ندی لاؤنج جنوب مشرق میں واقع ہے۔ یہاں پر جنگلی جانوروں کو قریب سے دیکھنے کے مواقع فراہم ہیں۔ میسور سے ۱۱۴ کیلو میٹر کے فاصلہ پر جنوب مشرق میں ایک خوشگوار بلگری رنگا ہل نیشنل اور وائلڈ لائف کیمپ ہے یہ جگہ سمندری سطح سے ۵۰۹۱ فٹ بلند ہے۔ یہاں پر اسی نام کا ایک مندر بھی ہے۔

برڈ سینکچوری کا ایک منظر

ہیرا اگر کیچڑ میں بھی گر جائے تو قیمتی ہے۔ گرد یعنی دھول آسمان پر بھی پہنچ جائے تو اس کی کوئی قیمت نہیں۔ بے حقیقت ہے اس کی قدر نہیں ہوتی۔

بڑے لیڈر اور بڑی حکومت کی پہچان ہی اس اعتبار سے کی جاتی ہے کہ اس کی تعریف میں کتنے احمق ہیں (پروفیسر رشید احمد صدیقی)

جن میں ہو جاتے ہیں انداز خدائی پیدا
ہم نے دیکھا ہے وہ بت توڑ دیے جاتے ہیں

کسی کا یہ شعر خورشید عالم خان سابق گورنر کرناٹک نے پروفیسر عبدالغفار شکیل، مقصود علی خان صاحب اور حمید صفی صاحب کو

شیموگہ میں جوگ فالس کا ایک حسین منظر

شیموگہ:۔

بنگلور سے ۲۷۴ر کیلو میٹر کی دوری پر جنوب مغرب میں واقع ہے۔ کیلدی کے سرداروں کا ایک زمانے میں یہ زبردست مرکز رہا۔ یہاں لائق دید قلعہ، چرچ، اور سرکاری میوزیم ہے۔ شیموگہ کے جنوب مغرب میں ۱۰ر کیلو میٹر کے فاصلہ پر گاجنور ڈیام پکنک کا مرکز ہے۔ یہاں ہاتھیوں کو سدھانے کا ایک مرکز بھی ہے۔ جنوب میں تاورے کوپہ لائن اور ٹائگر سفاری، ۷۰ کیلو میٹر کے فاصلے پر مغربی جنوب میں آگمبے ہے یہاں کا غروب آفتاب کا منظر بھلایا نہیں جا سکتا۔ ۱۰۵ر کیلو میٹر کے فاصلہ پر شاندار جوگ فالس، بھارت کا سب سے بلند آبشار ہے۔ شراوتی ندی یہاں ۲۹۲ میٹر کی بلندی سے چار حصوں میں بٹ کر گرتی ہے۔ راجا، رانی، روورر، اور راکٹ۔ یہ منظر سیاحوں کو اپنی اولین فرصت میں تفریح عطا کرتا ہے۔

چکمگلور:۔

بنگلور سے ۲۵۱ر کیلو میٹر کی دوری پر واقع چکمگلور شہر ہے۔ جہاں سے بابا بڈن گری دکھائی دیتا ہے۔ سارا ضلع خوبصورت دیدہ زیب مناظر سے پر، پہاڑ، وادیاں، چشمے ندی نالے اور برف کی سی سفیدی لئے کافی کے پھولوں کی شگفتگی دیکھنے لائق مناظر ہیں۔ کوہ پیماؤں کی یہ بڑی پسندیدہ جگہ ہے۔ یہاں ۳۸ر کیلو میٹر کی دوری پر بھدرا وائلڈ لائف، ۵۵ر کیلو میٹر کی دوری پر کیمن گنڈی کے پہاڑ ہیں۔ ۹۰ر کیلو میٹر کے فاصلہ پر مغرب کی جانب شرنگیری کی مقدس تیرتھ گاہ ہے جہاں ودیا شنکر مندر ہے۔

> دانشور خود کو نفرت اور حسد سے جتنا دور رکھے اس کی فکر و نظر میں کشادگی اور روشنی پیدا ہوگی۔

> بڑے لیڈر اور بڑی حکومت کی پہچان ہی اس اعتبار سے کی جاتی ہے کہ اس کی تعریف میں کتنے احمق ہیں (پروفیسر رشید احمد صدیقی)

بیجاپور:۔

بنگلور سے شمال مغربی جانب ۵۳۰/ کیلو میٹر کے فاصلے پر قدیم شہر بیجاپور واقع ہے۔ عادل شاہی سلاطین کا پایہ تخت۔ بلگام سے بہت قریب، گوا سے کرناٹک میں داخل ہونے کا صدر دروازہ ہے۔ گول گنبد محمد عادل شاہ کا مقبرہ ہے ۱۶۲۶۔۱۶۵۶ تک یعنی ۳۰ سال میں اس کی تعمیر مکمل ہوئی اس کی اونچائی ۱۷۷ فٹ ہے، چبوترہ ۱۸۳۳۷ فٹ ہے اندرونی گنبد کا قطر ۱۴۴ فٹ اندرونی گیلری ۵. ۱۴۴ فٹ۔ دنیا کے چار بڑے گنبدوں میں سے ایک ہے۔ یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ اتنا بڑا گنبد بغیر کسی سہارے کے کھڑا ہے۔ اندر کوئی ستون نہیں۔ یہاں کانا پھوسی کا برآمدہ ہے، جس میں سے آنے والی بہت ہی آہستہ سی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ مثلاً اگر آپ ایک سرے پر اپنی کلائی گھڑی رکھ دیں تو دوسری طرف بیٹھا آدمی اس کی آواز سن سکتا ہے جبکہ خود کو اس کی آواز سننا ہو تو کان کے بہت قریب لیجانا پڑتا ہے۔ اگر آواز ذرا اونچی ہوئی تو یہ سات مرتبہ گونجے گی۔ اسی لئے اس کو بولی گنبد بھی کہا جاتا ہے یہ دنیا کے عجائبات میں سے ایک ہے۔ اسی نمونے پر محمد عادل شاہ دوم نے اس سے بڑے گنبد کی تعمیر ۱۶۵۷ء سے ۱۶۷۲ء تک کیا، لیکن افسوس کہ وہ مکمل نہ ہو سکا اور آج یہ ادھورا گنبد بارہ کمان کے نام سے جانا جاتا ہے جو علی روضہ بھی کہلاتا ہے۔ جامع مسجد، علی عادل شاہ اول نے اس کی تعمیر کروائی ۔۱۶۵۶ء میں یہ مکمل ہوئی ۔اس کے اندرونی محراب کو عادل شاہ ہفتم نے سونے کا ملمع کروایا۔ آج بھی یہاں نماز باجماعت ادا کی جاتی

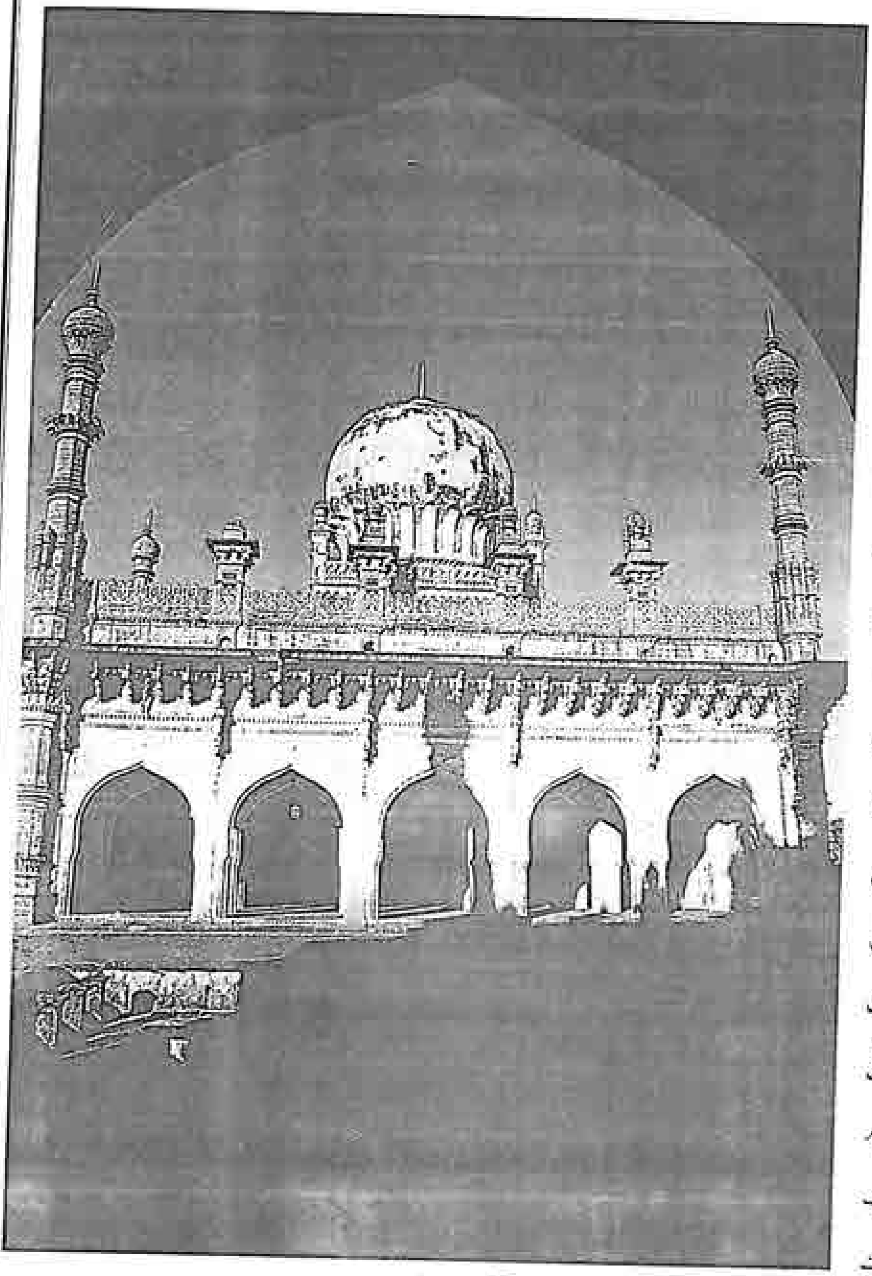

قدیم جامعہ مسجد، بیجاپور

دیر سے نور چلا باب حرم تک پہنچا
سلسلہ میرے گناہوں کا کرم تک پہنچا
اُن کی معراج کہ وہ عرش بریں تک پہنچے
میری معراج کہ میں اُن کے قدم تک پہنچا

(کرشن بہاری نور)

ہے۔ایک زمانہ تک یہ بھارت کی پہلی مسجد کہلاتی تھی۔ یہاں انتہائی نفیس سنہری حروف کا قرآن مجید کا نسخہ موجود ہے۔ابراہیم روضہ ،ابراہیم عادل شاہ،اور اس کے خاندان کا مقبرہ ہے۔۱۶۳۶ء میں بنوالیا۔اس کے انجینئر ایران کے ملک صندل ہیں۔یہ روضہ بادشاہ نے اپنی بیوی کی یادگار کے لئے بنوایا۔لیکن اس کے مکمل ہوتے ہی بادشاہ کا انتقال ہوگیا۔بیوی نے اس کا نام ابراہیم روضہ ہی رکھا۔دروازہ مسجد کی طرف ہے۔نہایت دلکش اور دیدہ زیب،اس کو اگر جنوب کا تاج محل کہا جائے تو بیجانہ ہوگا۔اسی کو دیکھ کر شاید مغل بادشاہ کو آگرہ میں تاج محل بنانے کا خیال پیدا ہوا ہوگا جو سنگ مرمر میں بنایا گیا ہے۔ملک میدان توپ یہ بہت بڑی توپ ہے،جو احمد نگر میں ۱۵۴۱ء میں پنچ دھاتوں سے تیار ہوئی۔اس کے انجینئر محمد بن حسن رومی ہیں۔چودہ فٹ لمبی اور پچپن ٹن وزنی ہے۔اور ایک برج پر نصب کی گئی ہے۔اس کے علاوہ جوڑ گنبد، تاج باؤلی اوپری برج، بھی دیکھنے لائق عمارتیں ہیں۔بیجاپور سے ۱۱۰، ۱۲۰اور ۱۳۴ کیلومیٹر کے فاصلہ پتھر میں کھدے مناور آئی ہولے ،بادامی اور پٹد کل میں بہت ہی قریب میں واقع ہیں (۱۴ کیلومیٹر کے رقبہ کے اندر) یہاں چالوکیہ طرز تعمیر دیکھا جا سکتا ہے۔ بیجاپور اور اس کے اطراف واکناف کے علاقوں کی سیر وسیاحت کے لئے بہترین موسم ستمبر تا فروری ہے۔

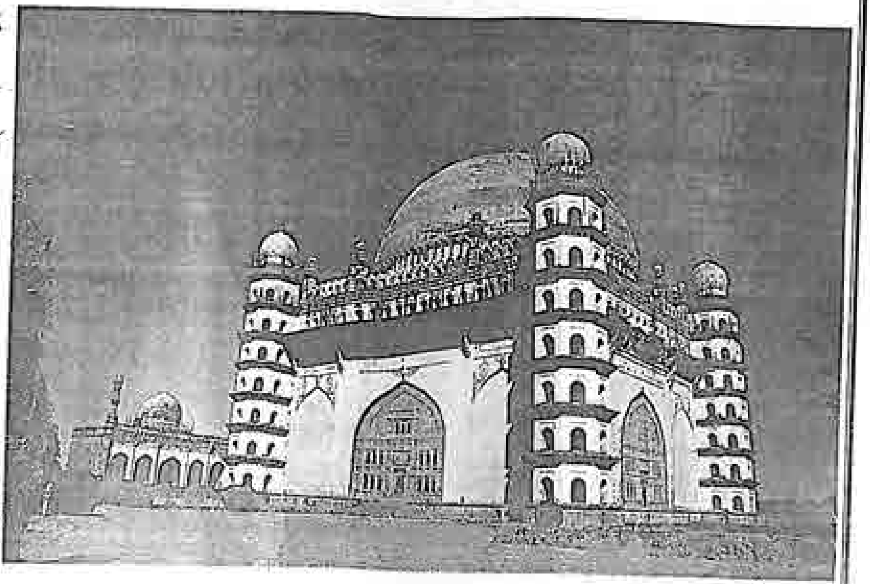

گول گنبد، بیجاپور

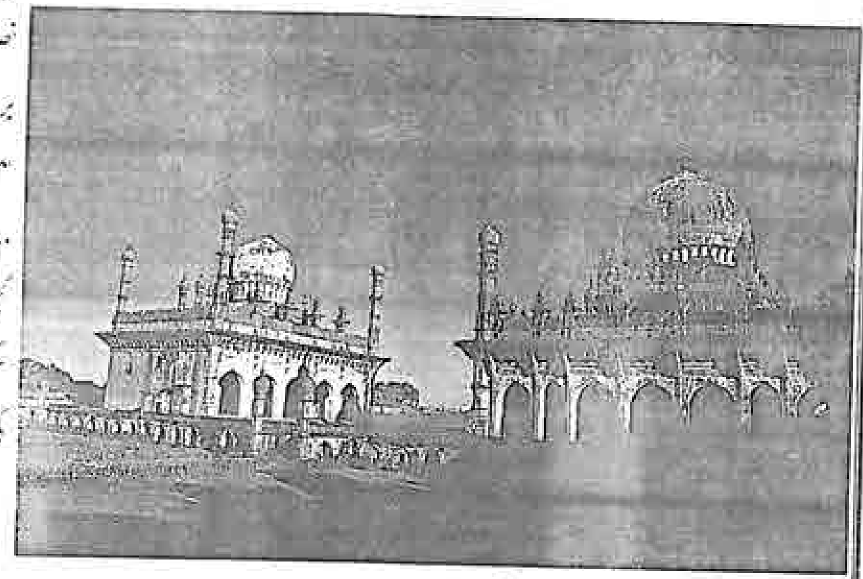

ابراہیم روضہ، بیجاپور

وار کر سکتا ہوں میں بھی اپنے دشمن پر
سوچتا ہوں درمیاں پھر فرق کیا رہ جائے گا

بے عقل شخص سے اگر کوئی رنج اٹھائے تو ہرگز اپنا دل نہ دکھائے کیونکہ اس سے اس کے علم وہنر میں کوئی کمی نہ ہوگی۔

بیدر:۔

بنگلور سے شمال مشرق میں ۶۶۹ر کیلو میٹر کے فاصلہ پر شہر بیدر واقع ہے۔ پہلے یہ بہمنی سلاطین کا پایہ تخت تھا بعد میں برید شاہی سلاطین کا مرکز رہا یہاں پندرھویں صدی کا بنا قلع موجود ہے جہاں محلات مقابر اور توپیں موجود ہیں۔ اس قلعہ کے پانچ دروازے ہیں جن سے گذر کر شہر میں داخل ہو سکتے ہیں۔ گنبد دروازہ سے رنگین محل کو جاسکتے ہیں، یہ شاہی محل تھا۔ اس میں منقش چوبی ستون ہیں جن پر فارسی اشعار کندہ ہیں۔ دیوان عام ہے جہاں شاہی تخت رکھا جاتا اور دربار ہوا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ شاہی حمام اور باورچی خانے بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ محمود گاواں کا مدرسہ یہ یونیورسٹی کی عمارت تھی جہاں اساتذہ اور طلباء کے لئے رہائش کا انتظام بھی تھا دور دراز سے طلبہ یہاں علوم و فنون حاصل کرنے آیا کرتے تھے۔ یہاں سے ۸۰ر کیلو میٹر کے فاصلے پر بسواکلیان واقع ہے یہ دسویں صدی میں چالوکیاؤں کا پایۂ تخت تھا۔ علوم و فنون کا مرکز بھی تھا۔ بسویشور اور اکا مہادیوی نامی سنتوں نے اس مقام کو اپنایا اس لئے آج انہیں ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ بیدر اپنے بیدری کام کے لئے مشہور ہے اس کی صنعتیں جگہ جگہ پائی جاتی ہیں اور یہاں سے نفیس کارگیری کے نمونے باہر بھیجے جاتے ہیں۔

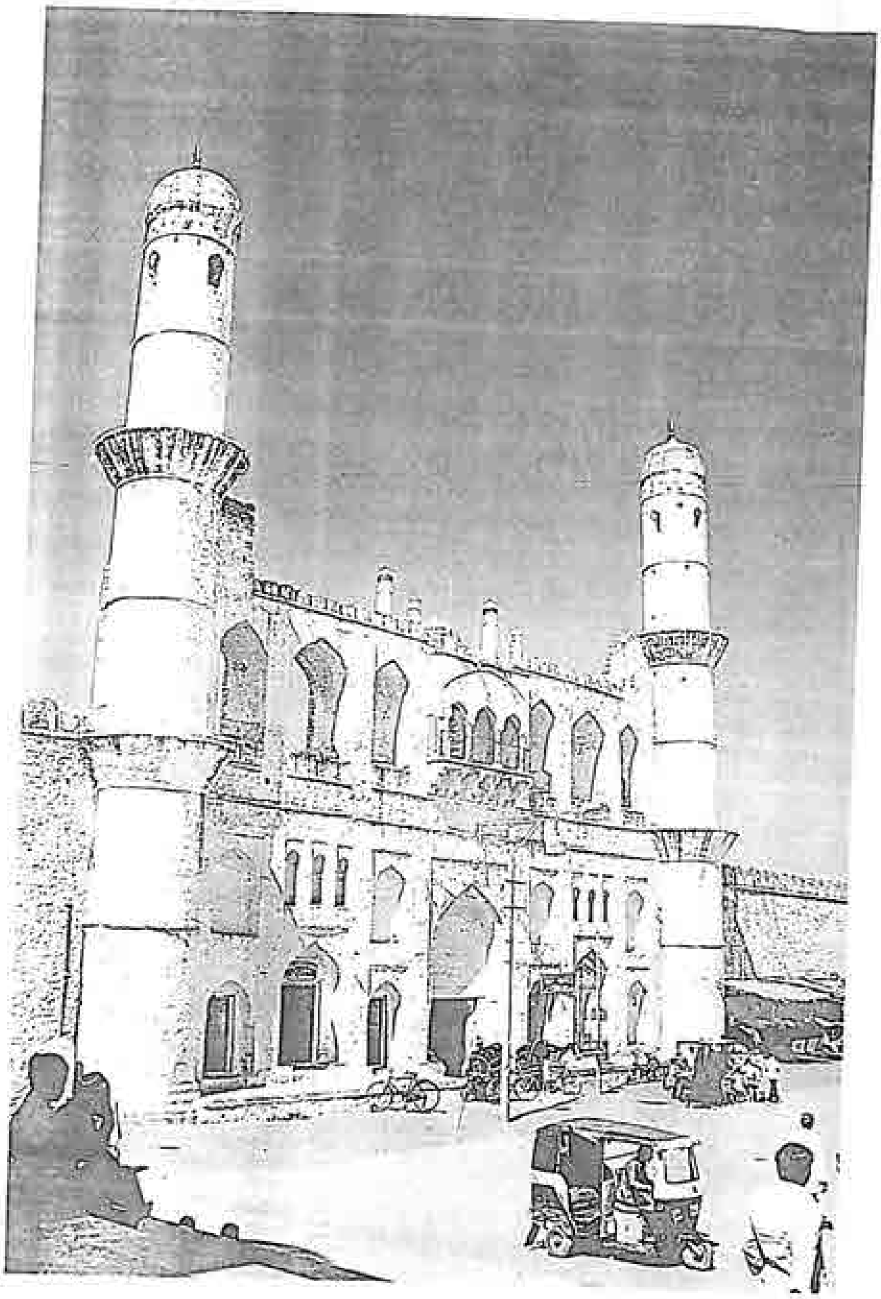

بیدر کا ایک حسین منظر

بد ذات پتھر اگر سونے کے پیالے کو توڑے تو پتھر کی قیمت نہ بڑھے گی اور سونے کی قیمت کم نہ ہوگی۔ پتھر پتھر ہے اور حقیر ہے اور سونا سونا ہے اور اعلیٰ اور قیمتی ہے۔

دشمن کو تو دی دام و درم کی دولت
اور ہم پہ بکھیری ہے کرم کی دولت
دی اتنی سمیٹے سے سمٹتی ہی نہیں
مولیٰ نے ہمیں لوح و قلم کی دولت
(صادقین)

گلبرگہ :۔

بنگلور کے شمال میں ۶۱۳؍ کیلو میٹر کے فاصلہ پر واقع شہر گلبرگہ دو تہذیبوں کا سنگم ہے۔ یہاں پر محلات، سرکاری عمارات اور بازار قابل دید ہیں۔ قلعہ میں پندرہ گنبد اور ۲۶ توپیں ہیں، جنکی لمبائی ۵۲ فٹ ہے۔ حضرت خواجہ بندہ نواز کی درگاہ مرجع خاص و عام ہے۔ جامع مسجد جو سپین کے کارڈوا کے مسجد کے نمونہ پر بنائی گئی ہے اہم ہے۔ درگاہ لائبریری میں اردو فارسی اور عربی کے تقریبا دس ہزار کتابیں موجود ہیں۔ دیگر عمارتوں میں غیاث الدین کا مقبرہ، فیروز شاہ اور اس کے خاندان کا مقبرہ اور ہفت گنبد اہم ہیں۔ بیرون شہر شرن بسویشور کا مندر ہے۔

مشرق سے ہوں مغرب تلک گر درہم و دینار
لے کے یہ زمیں تابہ فلک مال کے انبار
دریا سبھی موتی بنیں ، پارس بنے کہسار
اک سمت کھڑے ہوں جو مرے سید ابرارؐ
پھر کاکا پرشاد سے پوچھے کوئی کیا لے؟
نعلین کف پائے نبیؐ سرپہ اُٹھالے
(کاکا پرشاد)

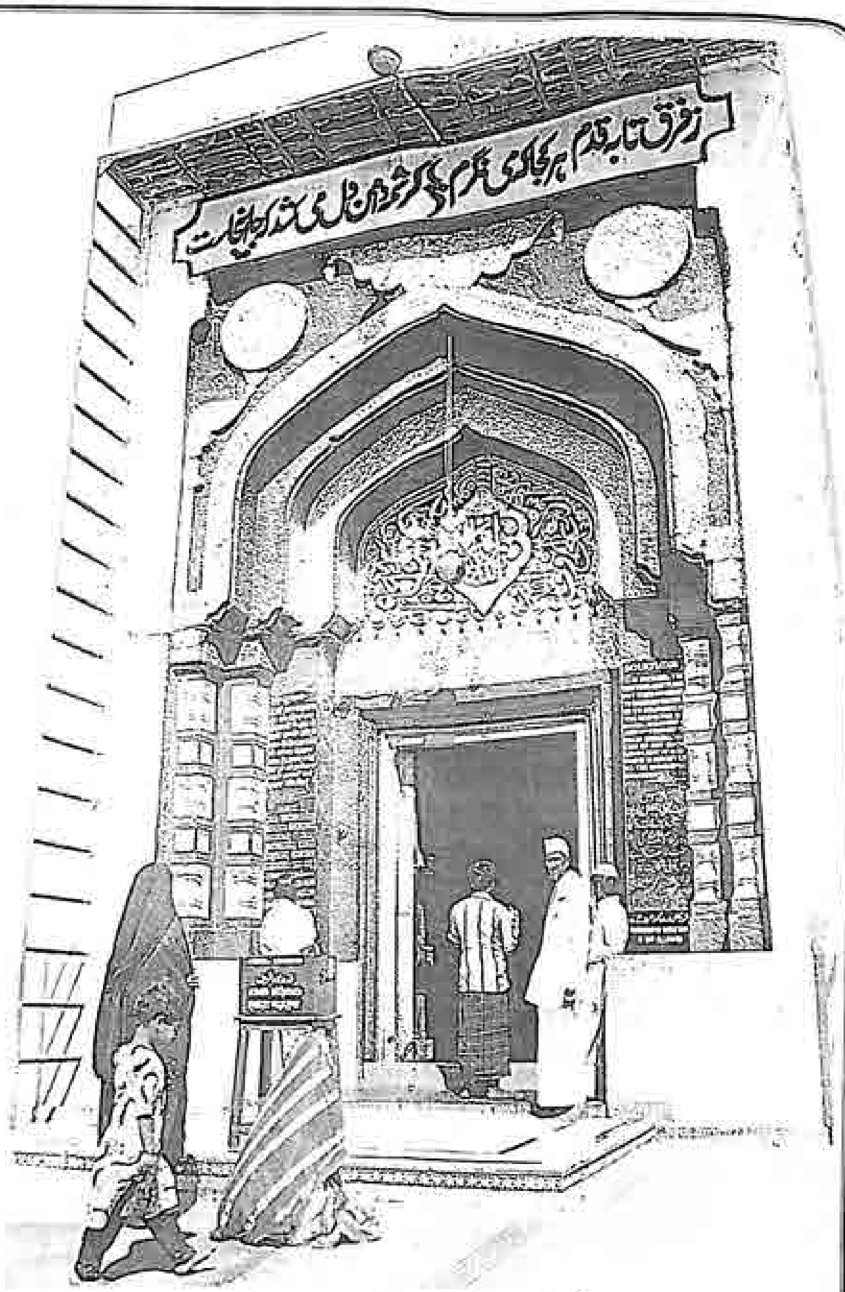

گلبرگہ میں درگاہ بندہ نواز کا باب الداخلہ

مرکرہ :۔

بنگلور سے ۲۵۲ کیلو میٹر دور سمندری سطح سے ۱۵۲۵ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ یہ کورگ ضلع کا صدر مقام ہے۔ اس کو ہندوستان کا سکاٹ لینڈ کہا جاتا ہے۔ یہاں کے کہرے پر پہاڑ، گھنے جنگلات، کافی کے باغات، دلکش مناظر سیاحوں کا من موہ لیتے ہیں۔ یہ کوڈیاؤں کا پسندیدہ مقام ہے۔ یہاں ۱۹ ویں صدی کا ایک قلعہ ہے اندرون قلعہ ایک عیسائی عبادت گاہ اور اس کی چھوٹی میوزیم ہے۔ ۱۸۲۰ء میں تعمیر کردہ اسلامی اور گاتھی طرز تعمیر کا اومکاریشور مندر تاریخی عمارت ہے۔ راجا کی کرسی :۔ یہاں سے غروب آفتاب کا منظر دیکھا جا سکتا ہے۔ کورگ کے راجے اپنی شام یہاں گزارتے تھے۔ مرکرہ سے ۸؍ کیلو میٹر دور ابے آبشار ہے، پکنک کا مرکز ہے۔ ۳۹؍ کیلو میٹر کی دوری پر بھاگ منڈل، یہ تین ندیوں کا سنگم ہے۔ ۴۶؍ کیلو میٹر کی دوری پر تلکاویری، کاویری کا جنم ستھان ہے۔ سال بھر یہاں کا موسم خوشگوار رہتا ہے۔ موسم باراں جون تا ستمبر۔

زاویہ

کرناٹک اردو اکادمی کے چھ سالہ پروگراموں کی جھلک

کرناٹک اردو اکادمی کے ایک جلسہ میں (دائیں سے) جناب حمید صفی (رجسٹرار) جناب چندر اہاسا گپتا (سکریٹری محکمہ کنڑا و ثقافت) اور پروفیسر عبدالغفار شکیل (چیرمین)

حکومت کرناٹک نے جون ۱۹۹۵ میں پروفیسر عبدالغفار شکیل کو تین سال کے لئے کرناٹک اردو اکادمی کا چیرمین نامزد کیا اور جون ۱۹۹۸ میں مزید تین سال کے لئے انہیں چیرمین نامزد کیا گیا۔ آپ اس چھ سالہ عہد میں اراکین کے تعاون سے کوئی دو سو پچاس تعمیری پروگرام ریاست کے مختلف شہروں میں کئے جن سے اکادمی کا وقار بڑھا یہ اکادمی کے لئے بڑے فخر کی بات ہے۔ ذیل میں ان پروگراموں کی ایک جھلک پیش ہے۔

کنڑا۔ اردو اور اردو کنڑا ڈکشنری کے دوسرے اور جدید ایڈیشن کی طباعت اور فروخت جس سے اکادمی کو تقریباً دو لاکھ کی آمدنی ہوئی۔

کرناٹک کے اردو طلبہ و طالبات کو پندرہ لاکھ روپوں کی تقسیم بطور میرٹ اسکالرشپ۔

کرناٹک کے ادباء، شعراء، صحافیوں اور اہل قلم کو ایوارڈ دو لاکھ دس ہزار روپے۔

بنگلور میں شام افسانہ، [illegible]

شام غزل (میسور، بنگلور، گلبرگہ، کولار اور ہمپی میں)

اردو اساتذہ کے لئے ورک شاپ۔ بنگلور میں پانچ سو اردو اساتذہ کے لئے جدید لسانیاتی طریقے سے اردو کی تدریس کے لئے تربیتی کورسز میسور، گلبرگہ، شیموگہ، لکھنو اور سولن (شملہ) میں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین پر سمینار اور ان کی تصویروں اور کتابوں کی نمائش۔

اپنی نوعیت کا ایک منفرد مشاعرہ جس میں شعراء نے صرف کرناٹک پر اپنی نظمیں سنائیں۔

بنگلور، میسور، گلبرگہ، شیموگہ، ہاسن، منڈیا، چنن پٹن، کولار، رائچور، بیجاپور، چٹگپ (بیدر)، بلگام، دھارواڑ اور شکور میں مشاعرے۔

نذیر چھوٹے عزیز نازاں اینڈ پارٹی کا قوالی پروگرام مرکیرہ اور ہمپی میں۔

گلبرگہ میں "کرناٹک میں طنز و مزاح پر" جس میں مجتبی حسین اور یوسف ناظم، محترمہ لئیق صلاح اور فاروق نشتر نے شرکت کی۔

ٹیپو سلطان سنٹرل اردو لائبریری کا قیام بنگلور میں۔

اکادمی کی اپنی ۱۸ کتابوں کی طباعت و اشاعت۔

اکادمی کے مالی تعاون سے کرناٹک کے شاعروں، ادیبوں کی ۳۸ کتابوں کی اشاعت۔

کرناٹک کی چند لائبریریوں کو کتابوں کی تقسیم۔

تین ماڈل اردو نرسری اسکولوں کا قیام شیموگہ، گلبرگہ، شر جاپور اور بنگلور میں۔

اردو اسکولوں کو بچوں کے گیتوں کی کتاب، آؤ گائیں خوشی منائیں مرتبہ ڈاکٹر شیلا کماری (CIIL) میسور، نرسری اردو نصاب، تصویری لغت، اردو زبان کا جادو حصہ اول اور حصہ دوم وغیرہ، کتابوں کی مفت تقسیم۔

آزادی کی پچاس ویں سالگرہ کے جشن پر جلسہ اور کتاب تحریک آزادی اور مجاہدین آزادی کی اشاعت۔

گلبرگہ میں مزاحیہ مشاعرہ اور شام غزل اور سلیمان خطیب کی نظموں پر مبنی ڈرامہ۔

اکادمی میں کمپیوٹر کی تنصیب

کرناٹک میں طنز و مزاح پر سمینار گلبرگہ میں۔

اکادمی کی کتابوں کی فروخت۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو NCPUL نئی دہلی کی آل انڈیا اردو اکادمیوں کی کوکنیشن، دہلی، سری نگر، پونا اور جے پور کانفرنسوں میں شرکت اور اکادمی کی نمائندگی۔ جس میں ڈائرکٹر ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ نے کرناٹک اردو اکادمی کے پروگراموں کو سراہا، کونسل کے اردو رسالہ "اردو دنیا" میں رپورٹیں شائع کیں اور ہر ممکن تعاون دیا۔

مولانا ریاض الرحمن خطیب جامع مسجد بنگلور کی صدارت میں اکادمی کا نعتیہ مشاعرہ، بنگلور میں۔

آل انڈیا مشاعرہ ۲۹ مارچ ۲۰۰۱ کو جس میں دہلی، یوپی، مدھیہ پردیش آندھرا پردیش، تامل ناڈو اور کرناٹک کے شعراء نے کلام سنایا جسے تقریباً ڈیڑھ ہزار سامعین نے سنا۔

اکادمی کے رسالے "اظہار نو" کے خاص نمبر "کرناٹک میں اردو افسانہ" کی اشاعت اور افسانہ نگاروں کو اعزازات۔

اکادمی کی طرف سے کنڑا، اردو اور انگلش تین زبانی ڈکشنری کی طباعت و اشاعت کی تیاری

کرناٹک کے صحافیوں کو انعامات اور مونٹو مدرسوں سے لے کر کالج اور یونیورسٹی تک کرناٹک میں اردو تعلیم و تدریس کا سروے۔

اکادمی کی سلور جوبلی تقریبات کے سلسلے میں مختلف مقامات پر جلسے مشاعرے انعامی مقابلے۔

اکادمی کے رسالہ اظہار نو (۲) کے خصوصی باتصویر سلور جوبلی نمبر کی اشاعت اور رسم اجراء "رہنمائے بیجاپور" اور کنڑا و اردو کے گیان پیٹھ انعام یافتہ اہل قلم، نامی کتابوں کی اشاعت۔

اکادمی کے مختلف پروگراموں میں اہم شخصیتوں جیسے جناب خورشید عالم خاں (سابق گورنر کرناٹک) سابق منسٹر شریمتی لیلا دیوی آر پرشاد موجودہ منسٹر شریمتی رانی ستیش، جناب سی ایم ابراہیم سابق وزیر حکومت ہند، راج بہادر گوڑ (حیدرآباد)، جناب کے رحمن خاں ایم پی، جناب سی آر صغیر احمد منسٹر، جناب قمرالاسلام منسٹر، جناب عبدالحکیم ہنڈ سگری منسٹر حکومت کرناٹک، جناب عزیز سیٹھ سابق منسٹر جناب بی شیخ علی صاحب سابق وائس چانسلر منگلور و گوا یونیورسٹیز، جناب میر مقصود علی خاں مرحوم، جناب ابراہیم خلیل اللہ خاں مرحوم وغیرہ۔

پروفیسر عبدالغفار شکیل اور رجسٹرار حمید اے صفی کی کوششوں سے اکادمی کو حکومت کی طرف سے پانچ ایکڑ زمین اردو محل بنانے کے لئے ملی، کاغذات بھی حاصل ہوئے مگر بدقسمتی سے اس زمین پر قبضہ حاصل نہ ہو سکا۔ تمام اراکین اکادمی کو اس کا بے حد افسوس ہے۔ پھر بھی ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے، انشاءاللہ اردو محل کا خواب ایک نہ ایک دن پورا ہوگا۔ پروفیسر عبدالغفار شکیل کا یہ شعر اردو والوں کے لئے مشعل راہ ہوگا۔

کام جو ہیں زبان اردو کے
اردو والوں کو مل کے کرنے ہیں

(پروفیسر محمد صبغت اللہ، رکن اکادمی)

15-10-2000

THE DAILY SALAR

اسلام کے دشمن ملک کے غدار۔ ایک قابل قدر کتاب

نام کتاب: اسلام کے دشمن، ملک کے غدار
دین دار چن بسویشور
مصنف: منیر احمد ہمکوری
صفحات: ۱۴۸
قیمت: ۳۰ روپے
پتہ: اسلامک پروپیگیشن سنٹر
غوث بلڈنگ ھور پیٹ مین روڈ،
ھمکور۔ا
تبصرہ نگار: ڈاکٹر محمد صبغۃ اللہ

معرکۂ حق و باطل ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ تاریخ گواہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ہمیشہ حق کا ساتھ دیا اس کی برتری قائم رکھی اور باطل اپنی لاکھ کوشش کے باوجود ہمیشہ ذلیل و رسوا ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ دین اسلام کا نزول تمام ادیان کے خاتمہ کا اعلان کرتا ہے اور نبی آخر الزماں پر آسمانی وحی اور کتب سماوی کے اختتام کا اعلان بھی کرتا ہے۔ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ حضور ﷺ کے دور سے آج تک جب سے اسلام کا ظہور ہوا اس کی دشمنی بھی عام رہی، کیا کفار مکہ، کیا عیسائی کیا یہودی ہر ایک نے اس کی مخالفت کا بیڑہ اٹھایا۔ اور اس کو نیست و نابود کرنے کی ٹھانی۔ آپ ؐ نے دین اسلام کی بقاء اس کی اشاعت و ترویج کے لئے جہاں بہت سے اقدامات کئے وہیں غزوات میں بھی حصہ لیا۔ آپ ؐ کے بعد خلفائے راشدین خصوصاً حضرت ابو بکر صدیق ؓ کے زمانے میں بہت سے فتنے کھڑے ہوئے جن کی بنیاد جھوٹے نبی اور مرتدین تھے۔ حضرت صدیق ؓ نے ان سب کا صفایا کیا اور پھر مذہب اسلام کو پھیلانے کا راستہ صاف ہوا۔ یہ تقریباً ۱۴۰۰ سال پہلے کی بات تھی۔

لیکن آج کے اس دور میں بھی اسلام دشمنی عروج پر ہے، ہر روز نت نئے فتنے کھڑے ہو رہے ہیں (اور فتنہ قتل سے بڑھ کر ہے) تاکہ نعوذ باللہ اسلام کی بیخ کنی کی جائے۔ اس کے مختلف روپ ہمارے سامنے آرہے ہیں۔ لیکن خدا کا بہت بڑا احسان ہے کہ ہر زمانے میں وہ ان کے تدارک کے لئے کسی نہ کسی مجاہد کو پیدا کرتا رہا جس نے باطل کے دانت کھٹے کر دیے اور فتنہ [illegible]

صدی میں ایسے ہی فتنے قادیانیوں اور چن بسویشوریوں نے کھڑے کئے ہیں۔ اشرف سعودی نے صحیح لکھا ہے کہ ایسے لوگ اسلام کا نقاب ڈال کر، مسلمانوں کی سی صورت بنا کر اور مسلمانوں کے نام رکھ کر جب دام ہم رنگ زمین پر بچھا دیا جائے تو بھولے بھالے اور سیدھے سادے کو پھانس لینا آسان ہے۔

انجمن صدیق دیندار چن بسویشور ایسا ہی خطرناک، غارت گر، تباہ کن، ایمان سوز اور اسلام دشمن فتنہ ہے۔ اس کے کارکن عام مسلمانوں میں گھل مل کر رہتے ہیں۔ دینی خدمات کے نام سے اسلامی معاشرے میں اثر و رسوخ پیدا کرتے ہیں اور آہستہ آہستہ حرم ایمانی پر اس طرح شب خون مارتے ہیں کہ معصوم مسلمانوں کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ ان کا ایمانی سرمایہ لٹ چکا ہے اور ان کی زندگی بھر کی محنت ضائع ہو چکی ہے اور وہ باوجود اپنے اسلامی نام اور مسلمانی تہذیب کے دائرہ کفر و ارتداد میں پہنچ چکے ہیں"۔ (دیباچہ ص ۵، کتاب ہذا)

چرچوں، مندروں اور مسجد پر حالیہ حملوں اور بم دھماکوں کی چھان بین کرنے والے ڈی ایس پی جناب یو نثار احمد کے حوالے سے مصنف نے لکھا ہے کہ ان انجمن کو دہشت گردی کی تربیت پاکستان میں مل رہی ہے۔ پاکستانی افراد اعراس اور دوسرے بہانوں سے یہاں آتے رہتے ہیں۔ ضیاء الحسن بن صدیق پاکستان سے یہاں ہر سال آیا کرتا ہے آصف نگر حیدر آباد میں ان کا اڈا جگت گرو آشرم ہے۔ پشاور کے قریب مردان میں، کراچی میں ان کے اڈے ہیں۔ اس فرقہ کی تعلیمات کی بنیاد نفاق ہے مختلف مذاہب کے درمیان نفرت پیدا کرنا اس کا مقصد ہے۔ اس نے مسلمانوں میں نفاق پیدا کیا، ہندوؤں میں نفاق پیدا کیا، مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان نفاق پیدا کیا۔

حالیہ عبادتگاہوں پر جو حملے ہوئے اسی نفاق کا نتیجہ تھے اس کا مقصد بھارت میں ہندو مسلمان عیسائی فسادات پھیلانا ہے۔ اگر ان فسادات کا طویل سلسلہ شروع ہو جاتا تو ملک میں انارکی اور [illegible] پاکستان کی طرف سے

دیندار انجمن والوں کے جلسے شروع ہو جاتے اور اس طرح چن بسویشور ریاست کا بنانا قرار پایا گیا تھا۔ اسی حوالے سے مصنف نے لکھا ہے کہ صدیق کو چالیس مرتبہ جیل کے سلاخوں کے پیچھے ڈالا گیا۔ بیڑیاں پہنا کر، منہ کالا کر کے راستوں اور چوراہوں پر گھمایا گیا، جرمانے عائد کئے گئے۔ ۱۹۴۸ء میں نظام سرکار نے اس انجمن پر پابندی عائد کر دی۔ غرض یہ کہ اس فرقہ کی ابتداء اذیت پسندی، دہشت گردی، قتل و غارت گری سے ہوئی تھی اور آج بھی یہ فرقہ یہی کام انجام دے رہا ہے۔ یہ کسی کا دوست نہیں بلکہ ساری انسانیت اور تمام مذاہب کا دشمن ہے۔ (ص ۵۰۔۵۳)

۱۴۸ صفحات پر پھیلی یہ کتاب بہت ہی دیدہ زیب سرورق سے آراستہ ہے۔ کتاب کی چھپائی اچھی ہے اور کاغذ بھی اچھا استعمال ہوا ہے۔ اگر اس کی ٹھیک پروف ریڈنگ ہوتی تو اغلاط سے پاک ہوتی، امید کہ اس کوتاہی کو اگلے ایڈیشن میں دور کر لیا جائے گا۔ اس کتاب کے سات ابواب میں مصنف نے اس فرقہ کی فتنہ پروری دین و ایمان اور شریعت کے خلاف انجمن والوں کی پر فریب چالوں کو حقائق کی روشنی میں مدلل پیش کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ یہ فرقہ اسلام دشمن ہی نہیں بلکہ ملک دشمن بھی ہے۔ ۱/۵ اکتوبر ۲۰۰۰ء کے روزنامہ پاسبان کی ایک رپورٹ کے مطابق ھمکور میں اس فرقہ کے کافرانہ عقائد پر یک روزہ کانفرنس منعقد کی گئی، اہل ھمکور لائق صد میں قابل مبارکباد ہیں کہ اس فتنہ کو رد کرنے میں انہوں نے پہل کی۔ اسی کانفرنس میں کتاب ہذا اور 'فتنہ چن بسویشور' از مولانا خالد بیگ ندوی کا اجراء عمل میں آیا۔ اگر ایسی ہی کانفرنسیں، سیمینار، سمپوزیم وغیرہ کا اہتمام ریاست میں پے در پے اور مختلف جگہوں پر ہوتے رہیں تو عوام الناس میں ان کی حقیقت کا پول کھل جائے گا۔

مصنف کتاب ہذا نے جرأت رندانہ سے کام لے کر ایک مجاہدانہ قدم اٹھایا ہے جو واقعی قابل تعریف ہے۔ ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ قادیانیت اور چن بسویشوریت کے اس فتنہ کو سمجھیں اور [illegible] ان [illegible] دشمنوں کا خاتمہ کریں۔

ಕನ್ನಡ ವಿಶ್ವವಿದ್ಯಾಲಯ, ಹಂಪಿ

ವಿದ್ಯಾರಣ್ಯ - ೫೮೩ ೨೭೬, ಹೊಸಪೇಟೆ ತಾಲೂಕು, ಬಳ್ಳಾರಿ ಜಿಲ್ಲೆ.

[illegible]

[illegible]

ದಿನಾಂಕ: [illegible]

ಮಾನ್ಯರಾದ ಡಾ ಮಹಮ್ಮದ್ ಸಿದ್ಧಿಕುಲ್ಲಾ ಅವರಿಗೆ ಆದರಪೂರ್ವಕ ವಿಜ್ಞಾಪನೆಗಳು.

ತಾವು ವಿಶ್ವಾಸವಿಟ್ಟು ಕಳಿಸಿದ ಲೇಖನ ತಲುಪಿತು. ತಮ್ಮ ಸಹಾಯವನ್ನು ಕೃತಜ್ಞತೆಯಿಂದ ನೆನೆಯುತ್ತೇನೆ. ಲೇಖನವು ಅಕ್ಟೋಬರ್-ಡಿಸೆಂಬರ್ ಸಂಚಿಕೆಯಲ್ಲಿ ಪ್ರಕಟವಾಗುವುದು. ಗೌರವಪ್ರತಿ ಕಳಿಸಿಕೊಡುತ್ತೇನೆ.

ಉರ್ದು ಕನ್ನಡಗಳ ನಡುವೆ ಅನೇಕ ಸಾಂಸ್ಕೃತಿಕ ಕಂದರಗಳಿವೆ. ಅವನ್ನು ಬೆಸೆಯುವ ಕೊಂಡಿಗಳ ಅವಶ್ಯಕತೆಯಿದೆ. ಈ ದಿಕ್ಕಿನಲ್ಲಿ ನಿಮ್ಮಂತಹವರ ಸಹಕಾರ ಸದಾ ಇರುತ್ತದೆ ಎಂದು ನಂಬುವೆ.

ನಮಸ್ಕಾರ

ವಿಶ್ವಾಸದ

[illegible]

ಅವರಿಗೆ:

ಡಾ ಮಹಮ್ಮದ್ ಸಿದ್ಧಿಕುಲ್ಲಾ
ನಂ.೫೦-೧೩, 'ಅಭಿಯಾನ'
೪ನೇ ಮೇನ್ ವಸಂತಪ್ಪ ಬ್ಲಾಕ್
ಗಂಗಾನಗರ ಬೆಂಗಳೂರು-೫೬೦ ೦೩೨

ಆಧುನಿಕ ಕನ್ನಡ ಸಾಹಿತ್ಯದ ಉರ್ದು ಅನುವಾದಿತ ಕೃತಿಗಳು ಹಾಗೂ ಅದರ ಮಹತ್ವ

ಸಂಸ್ಕೃತಿಯ ಅರ್ಥ ಮಾನವನ ಮಾನಸಿಕ, ಆಧ್ಯಾತ್ಮಿಕ ಹಾಗೂ ನೈತಿಕ ಅಭಿವೃದ್ಧಿ. ಇದು ಸಹ ಸಂಸ್ಕೃತಿಯ ಕೆಲಸಗಳಲ್ಲಿ ಒಂದು. ಸಂಸ್ಕೃತಿಯ ವಿಚಾರಣೆಯು ಸಹ ಒಂದು ಶಕ್ತಿ. ಹೇಗೆಂದರೆ, ಒಬ್ಬ ಮಾನವನು ಇನ್ನೊಬ್ಬ ಮಾನವನ ಜೊತೆ ವರ್ತಿಸುವುದರ ಮೇಲಿಂದ ಅವನ ಸಂಸ್ಕೃತಿಯನ್ನು ಅರಿಯಬಹುದು. ನಿಜಕ್ಕೂ ಒಳ್ಳೆ ಸಭ್ಯತೆಯನ್ನು ಕಲಿಸುವುದು ಸಹ ಸಂಸ್ಕೃತಿಯ ಉದ್ದೇಶ. ಹಾಗಾದರೆ ಇದರ ಅರ್ಥವೆಂದರೆ, ಒಬ್ಬ ಮಾನವ ಇನ್ನೊಬ್ಬ ಮಾನವನನ್ನು ಪೂರ್ಣ ಅರ್ಥಮಾಡಿಕೊಳ್ಳುತ್ತಾನೆಯೋ ? ಹೌದು ಇದರ ಮತ್ತೊಂದು ಉದ್ದೇಶವೂ ಇದೆ ಆಗಿದೆ. ಸಂಸ್ಕೃತಿಯ ಕೆಲಸವೆಂದರೆ ನಮ್ಮಲ್ಲಿ ಒಳ್ಳೆಯ ಗುಣಗಳಿದ್ದರೆ ಬೇರೆಯವರು ನಮ್ಮನ್ನು ಚೆನ್ನಾಗಿ ಅರ್ಥಮಾಡಿಕೊಳ್ಳುತ್ತಾರೆ. ಇಂದಿನಿಂದ ೨೦ ವರ್ಷಗಳ ಹಿಂದೆ ಭಾರತದಲ್ಲಿ Indian Council for cultural relations ನ ಸ್ಥಾಪನೆ ಮಾಡುತ್ತಾ, ಪಂಡಿತ ಜವಾಹರಲಾಲ ನೆಹರೂರವರು ಸಂಸ್ಕೃತಿ ಎಂದರೇನು ? ಎಂಬ ಪ್ರಶ್ನೆ ಎತ್ತಿದರು. ನನಗೂ ಸಹ ಈ ಪದದ ಸಂಕ್ಷಿಪ್ತ ಅರ್ಥ ದೊರಕಲಿಲ್ಲ. ಆದರೆ ಪ್ರತಿಯೊಂದು ಕೋಮಿನ ತನ್ನದೇ ಆದಂತಹ ಪೌರತ್ವ ಅಥವಾ ನಾಗರೀಕತೆಯ ಒಂದು ಕಲ್ಪನೆ ಇರುತ್ತದೆ. ಇದೇ ಸಂಸ್ಕೃತಿಯನ್ನು ಮಾರ್ಪಾಡು ಮಾಡುತ್ತದೆ. ಅದನ್ನು ಅಭಿವೃದ್ಧಿಗೊಳಿಸುತ್ತದೆ. ಈ ಸಂಸ್ಕೃತಿಯ ಸ್ಥಾಪನ ಹೇಗಾಯಿತು ಎಂದು ಸಂಶೋಧನೆ ಮಾಡಿದಾಗ ಇದರ ಬೇರುಗಳವರೆಗೆ ತಲುಪಬೇಕಾದರೆ ನೂರಾರು ಅಲ್ಲ ಸಹಸ್ರಾರು ವರ್ಷಗಳ ಸಿಂಹಾವಲೋಕನ ಮಾಡಬೇಕಾಗುತ್ತದೆ. ಈ ಯಾತ್ರೆಯಲ್ಲಿ ನಮಗೆ ಕಂಡುಬರುವುದೇನೆಂದರೆ, ನಾಗರೀಕತೆಯ ಒಂದು ಧಾರೆ ಮತ್ತೊಂದು ಧಾರೆಯಲ್ಲಿ ಬೆರೆತು ಹರಿಯುತ್ತಿದೆ. ಇದರ ಮುಂದುವರಿಗೆ ಎಲ್ಲಿಯವರೆಗೆ ಹೋಗಿದೆ ಎಂದು ಹುಡುಕಿದರೆ ಅದು ಅನಾದಿ ಕಾಲದವರೆಗೂ ತಲುಪುತ್ತದೆ. ಆದ್ದರಿಂದ ಯಾವ ಕೋಮೂ ಸಹ ಅದರ ಸಂಸ್ಕೃತಿಯ ಧಾರೆಯ ಬಗ್ಗೆ ತಮ್ಮದೇ ಆದ ಪ್ರತ್ಯೇಕ ಸಂಸ್ಕೃತಿ ಎಂದು ಹೇಳಿಕೊಳ್ಳಲು ಸಾಧ್ಯವಿಲ್ಲ. ಇದೇ ರೀತಿಯಾಗಿ ಯಾವ ಮಾನವನೂ ಸಹ ತನು ಅಪ್ಪಟ ವಂಶದವರು ಎಂದು ಹೇಳಲು ಸಾಧ್ಯವಿಲ್ಲ. ಈ ಚರ್ಚೆಯನ್ನು ಮುಂದುವರಿಸುತ್ತಾ ಸಂಸ್ಕೃತಿಯ ಬಗ್ಗೆ ಮೊದಲೇ ಕೇಳಿದ ಪ್ರಶ್ನೆಗಳಿಗೆ ಹೌದು ಎಂದು ಉತ್ತರಿಸಿ ಕೊನೆಗೆ ಇದರ ಸಾರಾಂಶವೆಂದರೆ ಈ ಎಲ್ಲಾ ಪವಾಡಗಳು ಸಹಸ್ರಾರು ವರ್ಷಗಳ ಸಂಸ್ಕೃತಿಯ ಧಾರೆಯು, ಅವು ಆ ದೇಶದ ಇತಿಹಾಸದ ಜೊತೆಯಲ್ಲಿ ಪ್ರಾರಂಭವಾಗಿ ಆ ದೇಶದ ಸಂಸ್ಕೃತಿಯ ಬುನಾದಿ ಎನಿಸಿಕೊಳ್ಳುತ್ತದೆ. ಈ ನೂರಾರು, ಸಹಸ್ರಾರು ವರ್ಷಗಳ ಯಾತ್ರೆಗಳಲ್ಲಿ ಬೇರೆ ಬೇರೆ ಧಾರೆಗಳೂ ಸಹ ಬಂದು ಸೇರುತ್ತವೆ. ಇವೆಲ್ಲಾ ಜೊತೆಗೂಡಿ ಒಂದಾಗಿ 'ಏಕತ್ವವನ್ನು ಸೃಷ್ಟಿಸುತ್ತವೆ. ಅದೇ ಆ ದೇಶದ ಸಂಸ್ಕೃತಿಯ 'ಏಕತ್ವ ಎನಿಸಿಕೊಳ್ಳುತ್ತದೆ.

....2)

ಈ ಹಿನ್ನೆಲೆಯಲ್ಲಿ ನಾವು ಭಾರತದ ಸಂಸ್ಕೃತಿಯ ಚಿತ್ರವನ್ನು ನೋಡಿದಾಗ ವರ್ಣರಂಜಿತ ಸಂಸ್ಕೃತಿಯ ಮೇಲೆ ಪಕ್ಷಿ ನೋಟವನ್ನು ಬೀರಿದಾಗ ವೇದಕಾಲದ ಸಂಸ್ಕೃತಿ (ಅದು ಮುಂದುವರೆದು ಆರ್ಯ ಸಂಸ್ಕೃತಿ, ಹಿಂದು ಧರ್ಮ ಮತ್ತು ಹಿಂದು ಸಂಸ್ಕೃತಿ ಎನಿಸಿಕೊಳ್ಳುತ್ತದೆ). ನಂತರ ಈ ಧಾರೆಯಲ್ಲಿ ಬೌದ್ಧ ಸಂಸ್ಕೃತಿ ಸೇರುತ್ತದೆ. ಇದರ ನಂತರ ಇಸ್ಲಾಮಿಯ ಸಂಸ್ಕೃತಿಯ ಧಾರೆಯು ಇದರ ಜೊತೆಯಲ್ಲಿ ಬಂದು ಸೇರಿತು. ಇಸ್ಲಾಮಿಯ ಸಂಸ್ಕೃತಿಯು ಭಾರತಕ್ಕೆ ರೂಪ ಲಾವಣ್ಯ, ಸೌಂದರ್ಯದ ಸಂವೇದನೆಯನ್ನು ನೀಡಿದಾಗ ಅದು ಲಲಿತ ಕಲೆಗಳಲ್ಲಿ ಪ್ರಕಟವಾಯಿತು. ವಿಶೇಷವಾಗಿ ಕಟ್ಟಡಗಳ ನಿರ್ಮಾಣದಲ್ಲಿ. ಇತಿಹಾಸ ಇದನ್ನು ಇಂಡೋ-ಸಾರಸಾನಿಕ 'ಆರ್ಟ ಎಂದು ಕರೆಯುತ್ತದೆ. ಇದರ ಬೇಕಾದಷ್ಟು ಉದಾಹರಣೆಗಳು ಭಾರತದಲ್ಲಿ ಕಾಣಬಹುದು. ವಿಶೇಷವಾಗಿ ತಾಜಮಹಲ ಇದರ ನಿದರ್ಶನವಾಗಿದೆ.

ಹೀಗೆಯೇ ಗಂಗಾ — ಜಮುನಿ ಸಂಸ್ಕೃತಿಯ ಪ್ರತೀಕ ಎಂದರೆ ಉರ್ದು ಭಾಷೆ. ಈ ಭಾಷೆಯ ವಿಶೇಷತೆ ಎಂದರೆ ಇದು ಭಾರತದಲ್ಲೇ ಜನಿಸಿ ಇಲ್ಲೇ ಬೆಳೆದು ಇಂದು ಭಾರತ ದೇಶದ ಒಂದು ಪ್ರತೀಕ ಎಂದು ಕಾಣಿಸಿಕೊಳ್ಳುತ್ತದೆ. ಇದು ಇಡೀ ಭಾರತದಲ್ಲಿ ಪ್ರಚಲಿತವಿರುವುದಲ್ಲದೆ ಇಡೀ ರಾಷ್ಟ್ರವನ್ನೇ ಒಂದು ಧಾರೆಯಲ್ಲಿ ಹರಿಯುವಂತೆ ಮಾಡಿದೆ. ಇದರ ಮತ್ತೊಂದು ವಿಶೇಷತೆ ಎಂದರೆ ಇದು ಭಾರತದಲ್ಲಿ ಜನಿಸಿರುವುದರಿಂದ ಇಲ್ಲಿ ಮೂಲ ಸ್ವರೂಪವನ್ನು ಹೊಂದಿದೆ. ಇದರಲ್ಲಿ ಇಲ್ಲಿಯ ಮಣ್ಣಿನ ವಾಸನೆ, ಇಲ್ಲಿಯ ಹೂವು ಹಣ್ಣು – ಹಂಪಲುಗಳ ಸುವಾಸನೆಯು ಇಲ್ಲಿ ಜನರ ಸಂಸ್ಕೃತಿ ಸಭ್ಯತೆಯನ್ನು ಪ್ರತಿಬಿಂಬಿಸುವ ಭಾಷೆ ಎಂದರೆ ದಖನಿ. ಇದರಲ್ಲಿ ತಮ್ಮ ವಿಚಾರಗಳನ್ನು ಪ್ರಕಟಿಸುವವರಲ್ಲಿ ಸೂಫಿ, ಸಂತರು, ರಾಜರು, ಅರಸರು ಹಾಗೂ ಅವರ ಕಾಲದ ಲೇಖಕರು ಹಾಗೂ ಕವಿಗಳು ಕರ್ನಾಟಕವು ಈ ಭಾಷೆಯ ತೊಟ್ಟಿಲು ಎಂದರೆ ತಪ್ಪಾಗಲಾರದು. ಇದರ ಬೆಳವಣಿಗೆ ಸೂಫಿ ಸಂತರಲ್ಲಿ ಗುಲಬರ್ಗಾದ ಮುಹಮ್ಮದ ಹುಸೈನಿ ಬಂದನವಾಜ, ಬಿಜಾಪುರದ ಮೀರಾಂಜಿ ಶಮಸುಲ ಉಶ್ಶಾಕ, ಬುರ್ಹಾನುದ್ದೀನ ಜಾನಮ ಹಾಗೂ ಬಿಜಾಪುರ ಅರಸನಾದ ಇಮ್ಮಡಿ ಇಬ್ರಾಹಿಂ ಆದಿಲ ಶಾ, 'ಕಿತಾಬಿ ನೌರಸ,' ಗೋಲಕೊಂಡ ಅರಸ ಮುಹಮ್ಮದ ಖುಲಿ ಖುತುಬ ಶಾ, ಅಬ್ದುಲ್ಲಾ ಖುತುಬ ಶಾ, ವಜಿಹಿ, ಗವ್ವಾಸಿ ಮತ್ತಿತರರ ಸಾಹಿತ್ಯದಲ್ಲಿ ಮೇಲ್ಕಂಡ ವಿಚಾರಗಳನ್ನು ಕಾಣಬಹುದು. ನಮ್ಮ ಲೇಖನಕ್ಕೆ ಸಂಬಂಧಿಸಿದಂತೆ ಕನ್ನಡ ಮತ್ತು ಉರ್ದು ಭಾಷೆ ಬಲ್ಲವರು ಹಲವಾರು ಲೇಖಕರು, ಕವಿಗಳು, ಕರ್ನಾಟಕದ ಸಂಸ್ಕೃತಿಯನ್ನು ಪ್ರತಿಬಿಂಬಿಸುವಂತೆ ಕನ್ನಡ ಸಾಹಿತ್ಯದ ಅನುವಾದ ಉರ್ದುವಿಗೆ ಹಾಗೂ ಉರ್ದು ಸಾಹಿತ್ಯದ ಭಾಷಾಂತರ ಕನ್ನಡಕ್ಕೆ ಮಾಡಿರುವಂತಹ ಹಲವಾರು ಉದಾಹರಣೆಗಳು ನಮ್ಮ ಮುಂದೆ ಇವೆ. ಈ ಎರಡು ಭಾಷೆಗಳ ಆದಾನ ಮತ್ತು ಪ್ರದಾನದ ಕೆಲಸ ಬಹಳ ಕಾಲದಿಂದ

ನಡೆದು ಬಂದಿರುವುದು ಸರಿಯಷ್ಟೆ. ಆದರೆ ನಾವು ಇಲ್ಲಿ ಆಧುನಿಕ ಕನ್ನಡ ಸಾಹಿತ್ಯದ ಮತ್ತು ಲೇಖಕರ ಉರ್ದುವಿಗೆ ಅನುವಾದವಾಗಿರುವ ಕೆಲವು ಹೆಸರುಗಳನ್ನು ಪ್ರಸ್ತಾಪಿಸಲು ಪ್ರಯತ್ನಿಸುತ್ತೇನೆ.

01. ಕರ್ನಾಟಕ ಜಾನಪದ ಸಾಹಿತ್ಯ ಮತ್ತು ಜನತೆಯ ಸಂಸ್ಕೃತಿ
ಮಾಸ್ತಿ ವೆಂಕಟೇಶ ಅಯ್ಯಂಗಾರ
ಕರ್ನಾಟಕ ಕಾ — ಅವಾಮಿ ಅದಬ್ ಔರ್ ಅವಾಮಿ ತಹಜೀಬ್
ಪ್ರಕಾಶಕರು : ಕರ್ನಾಟಕ ಉರ್ದು ಅಕಾಡೆಮಿ, ಬೆಂಗಳೂರು – 1982

02. ವಂಶವೃಕ್ಷ: ಎಸ್.ಎಲ್.ಭೈರಪ್ಪ, ಭಾಷಾಂತರ ಶಹಾಬುದ್ದೀನ್ ರೋಶನ್ ಶಜರವಿನಸಬ್ ಈ ಪುಸ್ತಕಕ್ಕೆ ಕರ್ನಾಟಕ ಉರ್ದುಅಕಾಡೆಮಿ ಅವಾರ್ಡ್ ನೀಡಿತು.

03. ಇದೇ ಲೇಖಕರು ಕುವೆಂಪುರವರ ಜೀವನ ಮತ್ತು ಸಾಹಿತ್ಯದ ಬಗ್ಗೆ ಪುಸ್ತಕವನ್ನು ಬರೆದು ಪ್ರಕಟಿಸಿದ್ದಾರೆ.

04. ದಾಟು. ಎಸ್.ಎಲ್.ಭೈರಪ್ಪನವರ ಕಾದಂಬರಿಗೆ ಸಾಹಿತ್ಯ ಅಕಾಡೆಮಿ ಅವಾರ್ಡ್ ಲಭಿಸಿದೆ. ಇದರ ಅನುವಾದ ಶ್ರೀ ಸೈಯದ ಅಬುತುರಾಬ್ ಖತಾಯಿಜಾಮಿಯೀರವರು ಮಾಡಿರುವರು. ಇದು 1997 ರಲ್ಲಿ ಪ್ರಕಟವಾಗಿದೆ.

05. ಕನ್ನಡ ಸಾಹಿತ್ಯದ ಇತಿಹಾಸ ಡಾ: ಆರ್.ಎಸ್.ಮುಗಳಿ. ಇದು ಕನ್ನಡ ಭಾಷೆ ಮತ್ತು ಸಾಹಿತ್ಯದ ಒಂದು ಅಧಿಕೃತ ಸಮೀಕ್ಷೆಯಾಗಿದೆ. ಇದು ಸಾಹಿತ್ಯ ಅಕಾಡೆಮಿಗಾಗಿ ಕನ್ನಡದಲ್ಲಿ ಬರೆಯಲಾಗಿತ್ತು. ಆಂಗ್ಲ ಭಾಷೆಯಲ್ಲಿ ಆದ ಭಾಷಾಂತರದ ನಂತರ ಅದನ್ನು ಉರ್ದುಭಾಷೆಗೆ ಅನುವಾದ ಮಾಡಿದವರೆಂದರೆ ಮೈಸೂರಿನ ದಿವಂಗತ ಮೀರ ಮಹಮೂದ ಹುಸೇನ್. ಇದನ್ನು ಪ್ರಕಟಿಸುವ ಉದ್ದೇಶ ಭಾರತದ ಓದುಗರಿಗಾಗಿ ಕನ್ನಡ ಭಾಷೆಯ ಬಗ್ಗೆ ಅರಿವು ಮಾಡಬೇಕೆಂಬ ಉದ್ದೇಶ (1988).

06. ಕನ್ನಡ ಸಾಹಿತ್ಯ, ಗದ್ಯ ಮತ್ತು ಪದ್ಯದ ಸಂಕಲನ ಅನುವಾದ ಕನ್ನಡ ಮತ್ತು ಸಂಸ್ಕೃತಿ ಇಲಾಖೆ ಹಾಗೂ ಕರ್ನಾಟಕ ಉರ್ದು ಅಕಾಡೆಮಿಯ ಸಹಯೋಗದಿಂದ 384 ಪುಟಗಳ ಆಧಾರಿತ ಈ ಕೃತಿ 1994 ರಲ್ಲಿ ಪ್ರಕಟವಾಯಿತು.

ಅ) ಮೊದಲಿಗೆ ಕನ್ನಡ ಕವನ ಸಾಹಿತ್ಯದ ಬಗ್ಗೆ ಶಿವಪ್ರಕಾಶರ ಅನುವಾದ ಖಲೀಲ ಮಾಮೂನ
ಆ) ಸಣ್ಣಕತೆಗಳ ಬಗ್ಗೆ ಜಿ.ಎಸ್.ಮೂರ್ತಿಯ ಅನುವಾದ ಅಸ್ಕರ ಪಾಷಾ

ಕಾವ್ಯ ವಿಭಾಗ :

01. ಪುರಂದರದಾಸರ 3 ಕವನಗಳು (ಅ) ಗಗರಿಯಾದ (ಅ) ಕೃಷ್ಣ (ಇ) ವೆಂಕಟರಮಣ
02. ಕನಕದಾಸ ಕೀರ್ತನ, ಸವಾಲ (ಪಕ್ಷಿ) ಮಾಹೆರ ಮನಸೂರ
03. ಬಸವಣ್ಣನವರ ವಚನ (ಖಲೀಲ ಮಾಮುನ)
04. ಅಕ್ಕಮಹಾದೇವಿಯ ವಚನ (ಖಲೀಲ ಮಾಮೂನ)
05. ಶಿಶುನಾಳ ಶರೀಫರ' ದೇವ ಪೈಕರ ನಿಲುಕರ ದೇಖೋ' ಮಾಹೆರ ಮನಸೂರ
06. ನಾನು ಹಾವು ಹೊಡೆದೆ (ಮೈನೆ ಸಾಂಪ ಕುಚಲ ಡಾಲ) — ಮಾಹೆರ ಮನಸೂರ
07. ಧರ್ತಿಮಾಂ 'ಭೂಮಾತೆ' ಮಧುರ ಚೆನ್ನ' ಖಲೀಲ ಮಾಮೂನ
08. ಬೇಂದ್ರೆ ಬೆಳಗು (ಸಹರ) — ಖಲೀಲ ಮಾಮೂನ
09. ಚೆನ್ನ (ಖೂಬಸೂರತ) ದ.ರಾ.ಬೇಂದ್ರೆ — ಖಲೀಲ ಮಾಮೂನ
10. ಬೆಕ್ಕಿನ ಮಗಳು — ಖಲೀಲ ಮಾಮೂನ
11. ಮೋಹನ ಮುರಳಿ : ಗೋಪಾಲ ಕೃಷ್ಣ ಅಡಿಗ — ಖಲೀಲ ಮಾಮೂನ
12. ದೇವತಾ ಔರ ಉನ್ಕಾ ಪುಜಾರಿ : ಕುವೆಂಪು — ಖಲೀಲ ಮಾಮೂನ
13. ಬೇನಾಂ (ಅನಾಮಿಕ) — ಖಲೀಲ ಮಾಮೂನ
14. ಅಬದಿ ಪ್ಯಾಸ (ಅನಂತ ತೃಷೆ) ಚೆನ್ನವೀರ ಕಣವಿ — ಖಲೀಲ ಮಾಮೂನ
15. ದೋಕಿನಾರೆ (ಎರಡು ದಡಗಳು) ಚೆನ್ನವೀರ ಕಣವಿ — ಖಲೀಲ ಮಾಮೂನ
16. ಬರ್ಫ ಬಾರಿ ಡಾ: ವಿ.ಕೆ.ಗೋಕಾಕ, ಅಲಿಫ ಅಹ್ಮದ ಬರ್ಕ ಕವಲೆ ಹವಿಗೆ
17. ಸಾಯು (ನೆರಳು) ಪಿ.ಎಫ.ನರಸಿಂಹಾಚಾರ, ಅಫ್ಜಾ ನಿಜಾಮಿ ಮುಹಮ್ಮದ ಸರೋಶ
18. ನಕಾತೆ ಅಗಹಿ ಪಿ.ಎಫ.ನರಸಿಂಹಾಚಾರ, ''
19. ಇಂತೆಜಾರ (ನಿರೀಕ್ಷೆ) '' ''
20. ದೀವಾರ (ಗೋಡೆ) ಡಾ: ಜಿ.ಎಸ.ಶಿವರುದ್ರಪ್ಪ ಜಂಯಾನೀರ ಮತ್ತು ಎಂ.ಆರ.ಕಮಲ
21. ಖ್ವಾಬಿ ಪರೇಶಾಂ '' ''
22. ಕಾಲ ಲಡಕಾ (ಕಪ್ಪು ಹುಡುಗ) ಕೆ.ಎಸ.ನರಸಿಂಹಸ್ವಾಮಿ ಮಾಹೆರ ಮನಸೂರ
23. ಘಡಿಯೊಂಕೆ ದುಕಾನ ಕೆ ರುಬರು '' ''
24. ತಾರೀಖ ಕಾ ಪರ್ದ '' ''
25. ಎಕ ಸಬಕ,(ಒಂದು ಪಾಠ)— ಕೆ.ಎಸ.ನಿಸಾರ ಅಹಮದ —ಖಲೀಲ ಮಾಮೂನ
26. ಸೌತೇಲೆ ಬಚ್ಚೇ '' ''
27. ಬೆನಾಂ ಅಂಗ್ರೇಜ (ಅನಾಮಿಕ ಆಂಗ್ಲರು) '' ರಾಹಿ ಫಿದಾಯಿ
28. ರಂಗೋಲಿ ಔರ ಬಚ್ಚ '' ''

29. ಜಾಪಾನಿ ಉನ್ಸುಬಾಚಿ ಮೆ ನಜ್ಮೇ — ಎ.ಕೆ.ರಾಮಾನುಜಂ — ಖಲೀಲ ಮಾಮೂನ

30. ಮುರ್ದೆ ದಾನಕ ಖ್ವಾಬ — ,, ,,

31. ಹಂ ಆಜಾದ ನಹೀಂ — ಚಂದ್ರಶೇಖರ ಕಂಬಾರ ,,

32. ತುಲೂಲನಕ ಹಾಮಾನ — ತಿರುಮಲೇಶ — ಮಾಹೆರ ಮುಸವ್ವರ

33. ತುಫಲಕ ,, ,,

34. ಕಹಾಂ ಖತ್ಮಂ ಹೋಗಾ ಸಫರ — ಜಿ.ಆರ.ಲಕ್ಷ್ಮಣರಾವ ,,

35. ಕುಲಂಬಸ — ಜಿ.ಆರ. ಲಕ್ಷ್ಮಣ ರಾವ ,,

36. ಪರ್ವಾಜ — ಎಚ.ಎಸ.ವೆಂಕಟೇಶ ಮೂರ್ತಿ — ಮಾಹೆರ ಮನ್ಸೂರ

37. ಜೋಗಿಯ ಹಾಡು (ಜೋಗಿ ಕಾ ಸಾಜ) ಎಚ.ಎಸ.ವೆಂಕಟೇಶ ಮೂರ್ತಿ
ಮಾಹೆರ ಮನ್ಸೂರ

38. ಖಿಸ್ಮತ (ಅದೃಷ್ಟ) — ಗಂಗಾಧರ ಚಿತ್ತಾಲ — ಮಾಹೆರ ಮನ್ಸೂರ

39. ಪಾಂಡು ಔರ ಮಾದರಿ — ರಾಮಚಂದ್ರ ಶರ್ಮ — ಖಲೀಲ ಮಾಮೂನ

40. ಪೇಡ ಔರ ಕುರ್ಸಿ (ಮರ ಮತ್ತು ಕುರ್ಚಿ) ಪಿ.ಲಂಕೇಶ — ಖಲೀಲ ಮಾಮೂನ

41. ಕಶ್ತಿ (ನಾವು) — ಎಚ.ಎಸ. ಶಿವಪ್ರಕಾಶ — ಖಲೀಲ ಮಾಮೂನ

42. ತುಮ ಯೂಂ ಹಿ ಬೈಠೆ ರಹೋ (ನೀನು ಹೀಗೆ ಕುಳಿತಿರು) — ಎಚ.ಎಸ.ಶಿವಪ್ರಕಾಶ —
ಖಲೀಲ ಮಾಮೂನ

43. ಜೋಗಮ ಕೆ ಬಚ್ಚೋಂ ಕಾ ಗೀತ (ಜೋಗಮನ ಮಕ್ಕಳ ಹಾಡು) —
ಡಾ: ಸಿದ್ಧಲಿಂಗಯ್ಯ — ಖಲೀಲ ಮಾಮೂನ

44. ಮೈಂ ಕಹನಾ ಚಾಹತಾ ಹೂಂ (ನಾನು ಹೇಳಬೇಕೆಂದಿದ್ದೇನೆ — ಡಾ॥ ಸಿದ್ಧಲಿಂಗಯ್ಯ —
ಖಲೀಲ ಮಾಮೂನ

45. ದೀವಾರ ಘಡಿ (ಗೋಡೆ ಗಡಿಯಾರ) — ಅಬ್ದುಲ್ ಮಜೀದ ಖಾನ—ಜಿಯಾ ಮೀರ

46. 'ಏಕ ಪುರಾನಿ ನಜಂ. (ಒಂದು ಹಳೇ ಕವನ) ರಂಜಾನ ದರ್ಗಾ — ಖಲೀಲ ಮಾಮೂನ

47. ಹಮ ಲಡಕಿಯಾಂ ಹೀ ಐಸೀ (ನಾವು ಹುಡುಗಿಯರೇ ಹೀಗೆ) — ಪ್ರತಿಭಾನಂದಕುಮಾರ
— ಸಾಜಿದ ಹಮೀದ

48. ಮುಸವ್ವಿರ (ಚಿತ್ರಗಾರ) ಸಿದ್ಧಲಿಂಗ ಪಟ್ಟಣಶೆಟ್ಟಿ — ತನೆಹಾ ತಿಮ್ಮಾಪುರಿ.

49. ಕೀಮಿಯಾ (chemist) ಹೇಮಾ ಪಟ್ಟಣ ಶೆಟ್ಟಿ — ಸಾಜಿದ ಹಮೀದ, ಶಶಿಕಲಾವೀರಪ್ಪ
ಸ್ವಾಮಿ

50. ಬುಲಾವೆ (ಕರೆ) — ಹೇಮಾ ಪಟ್ಟಣ ಶೆಟ್ಟಿ — ತನೆಹಾ ತಿಮ್ಮಾಪುರಿ.

51. ದೀವಾಲಿ ಕಾ ದಿನ (ದೀಪಾವಳಿಯ ದಿನ) ಎಂ.ಆರ. ಕಮಲಾ : ಸಾಜಿದ ಹಮೀದ.

52. ಮೈಂ ಸಿರ್ಫ ರಾತೋಂ ಸೆ ಪ್ಯಾರ ಕರ್ತೀ ಹೂಂ. (ನಾನು ಕೇವಲ ರಾತ್ರಿಗಳನ್ನು
ಪ್ರೀತಿಸುತ್ತೇನೆ) ಶಶಿಕಲಾ ವೀರಪ್ಪ ಸ್ವಾಮಿ — ಸಾಜಿದ ಹಮೀದ.

53. ಇಂತಿಜಾರ (ನಿರೀಕ್ಷೆ) ಕಮಲಾ ಹೆಮ್ಮಿಗೆ — ಸಾಜಿದ ಹಮೀದ, ಶಶಿಕಲಾ ವೀರಪ್ಪಸ್ವಾಮಿ

54. ಯೌಮೆ ಆಜಾದಿ 1986 (ಸ್ವಾತಂತ್ರ್ಯ ದಿನಾಚರಣೆ 1986) ಕಮಲಾ ಹೆಮ್ಮಿಗೆ —
ಅಲಿಫ್ ಅಹ್ಮದ ಬರ್ಕ.

<u>ಸಣ್ಣ ಕಥೆಗಳು :</u>

1) ಬಾಲ್ಸಬಾಂತಿ ಔರ ಉಸ್ ಕಾ ಬರ್ಚೆ ದುರ್ಮತಿ.
(ಬಾಲ್ಸಬಾಂತಿ ಮತ್ತು ಅವರ ಬರ್ಚೆ ಮರ) ಮಾಸ್ತಿ ವೆಂಕಟೇಶ ಅಯ್ಯಂಗಾರ — ಹನೀಫ ಅಲ್ತಾಫ್

2) ಖಾತಿಲ್ ಮೆಹ್ರ ಹರಾಂ (ಕೊಲೆಗಾರ ನಾನು) ಆನಂದ (ಎಂ.ಎನ್. ಸಯೀದ)

3) ಆಖಿರೀ ಗ್ರಾಹಕ (ಕೊನೆ ಗಿರಾಕಿ) ನಿರಂಜನ — ಅಜೀಜುಲ್ಲಾ ಬೇಗ.

4) ಫಿತರತ (ಸ್ವಭಾವ), ಅನಂತ ಮೂರ್ತಿ — ಅಜೀಜುಲ್ಲಾ ಬೇಗ.

5) ವಜೀ ಫಿಂಯಾಬ ಲೋಗ (ನಿವೃತ್ತರು ಹೊಂದಿದ ಜನ) ಲಂಕೇಶ — ಅಸ್ಕರ ಪಾಶಾ

6) ಬಾಜಿ (ಜೂಜು), ಯಶವಂತ ಚಿತ್ತಾಲ — ಅನ್ವರ ದಾಫ್.

7) ಬಾದಲ್ ಬಿಜಲಿ ಬರ್ಸಾತ (ಮೋಡ, ಮಿಂಚು, ಮಳೆ) ಜಿ.ಸಿ. ರಾಮಚಂದ್ರ ಶರ್ಮಾ.

8) ಭರ್ಮಯ್ಯಾ ಕಾ ನಿಖಿಲ ಬನ್ ಜಾನ
(ಭರ್ಮಯ್ಯಾ ನಿಖಿಲ ಆದನು)(ಶಾಂತಿ ನಾಥ ದೇಸಾಯಿ) ಅನ್ವರ ಮೀನಾಯಿ.

9) ರಥಿ ಬಾಹನಿ (ಸಾಹುಕಾರ) ಕಾಳೇಗೌಡ ನಾಗವಾರ — ಡಾ: ಸೈಯದ ಸಿರಾಜ.

10) ಕೋಲಾಲ್ತಾರ ಕಿ ಆಮದ (ಡಾಂಬರಿನ ಆಗಮನ) ದೇವನೂರ ಮಹಾದೇವ ಮಾಹೆರ ಮನ್ಸೂರ

11) ಆಂಖ (ಕಣ್ಣು) ಬೊಳುವಾರು ಮಹಮ್ಮದ ಕುಞ್ಞಿ — ಖಾಲಿದ ಇರಫಾನ.

12) ಬರ್ಫ   ಫಕೀರ ಮಹಮ್ಮದ ಕಟಪಾಡಿ — ಡಾ: ಎ.ಮು. ಇಬ್ರಾಹೀಂ.

13) ಸಚ್ಚಾ ದೋಸ್ತ (ನಿಜ ಸ್ನೇಹಿತ) ಕಟಿ ಚಿಕ್ಕಣ್ಣ — ಮಾಹೆರ ಮನ್ಸೂರ.

14) ಸೂಖಾ (ಬರಗಾಲ) ಬರಗೂರು ರಾಮಚಂದ್ರಪ್ಪ — ಎಂ.ಎನ್. ಸಯೀದ.

— — —

7. ಫರ್ಮಾಧಾತ, ಬಸವಣ್ಣನವರ ವಚನಗಳ ಉರ್ದು ಅನುವಾದ, ಹನೀಫ ಅಲ್ತಾಫ್.

8. ರಹಗುಜರ (ದಾರಿ), ಅಬ್ದುಲ್ ಮಜೀದ ಖಾನ ರವರ ಸುಮಾರು 25 ಕವನಗಳನ್ನು ಹನೀಫ ಅಲ್ತಾಫ ಮತ್ತು ಸಾಜಿದ ಹನೀಫ ರವರು ಉರ್ದುಗೆ ಅನುವಾದಿಸಿ ದಿನಪತ್ರಿಕೆ ಸಾಲಾರನ ಸಾಪ್ತಾಹಿಕ ಸಂಚಿಕೆಯಲ್ಲಿ ಪ್ರಕಟವಾಗಿದೆ. ಇವೆಲ್ಲವೂ ಒಂದೇ ಕಡೆ ಕೂಡಿಸಿದರೆ ಒಂದು ಉತ್ತಮ ಕವನ ಸಂಕಲನವಾಗಬಹುದು. ಇದೇ ಲೇಖಕರ ಎರಡು ಸಣ್ಣ ಕಥೆಗಳು (ಅಳತೆಗೋಲು) ಮತ್ತು ಡಾ|| ನಜೀಂ ಇಖಬಾಲ್ ರವರು ಉರ್ದುಗೆ ಅನುವಾದಗೊಳಿಸಿ ಸಾಲಾರನಲ್ಲಿ ಪ್ರಕಟಿಸಿದಂತೆ ನಿಸಾರ ಅಹ್ಮದ ರವರ ಕವನಗಳು ಸಹಾ ಸಾಲಾರನಲ್ಲಿ ಅನುವಾದ ಪ್ರಕಟವಾಗಿದ್ದು 1996. ಈಚನೂರ ಶಾಂತರವರು ಬರೆದಿದ್ದ ಪರಿಸರ ಮಾಲಿನ್ಯದ ಉರ್ದು ಅನುವಾದ '' ಮಾಹೋಲಿಯಾತಿ ಆಲೂದಗಿ '' ಎಂಬ ಶೀರ್ಷಿಕೆಯಿಂದ ಪ್ರಕಟವಾಯಿತು. ಇದರ ಅನುವಾದ ನಾನು ಮಾಡಿದ್ದೇನೆ.

ಚಾದಜಬಾನೇ ಚಾದ ಕಹಾನಿಂಯಾಂ (ಹದಿನಾಲ್ಕು ಭಾಷೆ, ಹದಿನಾಲ್ಕು ಕಥೆಗಳಲ್ಲಿ ಕನ್ನಡ ಕಥೆ, ಜೋಗಿ ಅಂಜಪ್ಪನ ಕೋಳಿ ಮಾಸ್ತಿ ವೆಂಕಟೇಶ ಅಯ್ಯಂಗಾರ — ಅನುವಾದ ಅಜೀಮುದ್ದೀನ್ ಅಜೀಂ ರವರ ಕಥಾ ಸಂಕಲನದಲ್ಲಿ ಸಿಗುತ್ತದೆ (1997).

ಇಸವಿ 1998 ರಲ್ಲಿ ಭಾರತ ಸ್ವಾತಂತ್ರ್ಯದ 50ನೇ ವಾರ್ಷಿಕ ಸಮಾರಂಭೋತ್ಸವ ಸಮಯದಲ್ಲಿ ಕರ್ನಾಟಕ ಉರ್ದು ಅಕಾಡೆಮಿ, ತೆಹರೀಕೆ ಆಜಾದಿ–ಮೆ–ಹಿಂದೆ ಜಿರ್ ಮುಜಾಹಿದೀನೆ ಆಜಾದಿ ಎಂಬ ಪುಸ್ತಕವನ್ನು ಪ್ರಕಟಿಸಿತು. ಇದರಲ್ಲಿ ಕರ್ನಾಟಕದಲ್ಲಿ ಸ್ವಾತಂತ್ರ್ಯದ ಹೋರಾಟದ ಬಗ್ಗೆ ಹಮೀದ–ಎ–ಸಫಿ, ಹೈದರ ಅಲಿ ಮತ್ತು ಟಿಪ್ಪು ಸುಲ್ತಾನರವರ ಬಗ್ಗೆ ಪ್ರೊ. ಅಬ್ದುಲ್ ಗಫ್ಫಾರ ಶಕೀಲ್, ಕಿತ್ತೂರು ರಾಣಿ ಚೆನ್ನಮ್ಮ, ಸಂಗೊಳ್ಳಿರಾಯಣ್ಣ ಬಗ್ಗೆ ಪ್ರೊ. ಅಬ್ದುಲ್ ಮಜೀದ ಖಾನ್, ಮಹಾತ್ಮ ಗಾಂಧಿ, ಬಾಬು ರಾಜೇಂದ್ರಪ್ರಸಾದ್, ಪಂಡಿತ ಜವಾಹರಲಾಲ ನೆಹರು ಬಗ್ಗೆ ಕನ್ನಡದಿಂದ ಉರ್ದುವಿಗೆ ಅನುವಾದ ಮಾಡಿದವರು ಪ್ರೊ. ಮುಹಮ್ಮದ ಸಿಬ್ಬತುಲ್ಲಾ. ಇಸವಿ 1997 ರಲ್ಲಿ ಕರ್ನಾಟಕ ಉರ್ದು ಅಕಾಡೆಮಿಯಿಂದ ಉರ್ದು ಕನ್ನಡ ಮತ್ತು ಕನ್ನಡ ಉರ್ದು ನಿಘಂಟುಗಳ ಪರಿಷ್ಕೃತ ಆವೃತ್ತಿಗಳನ್ನು ಪ್ರಕಟಿಸಿತು. ಇದರಲ್ಲಿ ಮುಖ್ಯವಾಗಿ ಕೆಲಸ ಮಾಡಿದವರೆಂದರೆ, ಪ್ರೊ. ಅಬ್ದುಲ್ ಮಜೀದ ಖಾನ್, ಪ್ರೊ. ಮುಹಮ್ಮದ ಸಿಬ್ಬತುಲ್ಲಾ ಹಾಗೂ ಹಾಮಿದ–ಎ–ಸಫಿ, ರಿಜಿಸ್ಟ್ರಾರ ಕರ್ನಾಟಕ ಉರ್ದು ಅಕಾಡೆಮಿ ಇವರ ಪ್ರಯತ್ನಗಳಿಂದ ಕನ್ನಡ ಮತ್ತು ಉರ್ದು ಪದಗಳ ಅನುವಾದಕ್ಕೆ ಒಂದು ಹೊಸ ತಿರುವು ಸಿಕ್ಕಿತು.

ಡಾ. ಮುಹಮ್ಮದ ಸಿಬ್ಬತುಲ್ಲಾ ರವರು ಕನ್ನಡದ ಎರಡು ಸಣ್ಣ ಕಥೆಗಳನ್ನು ಉರ್ದು ಭಾಷೆಗೆ ಭಾಷಾಂತರ ಮಾಡಿದರು (1) ಯುದ್ಧ (ಜಂಗ) ಸಾರಾ ಅಬು ಬಕರ (2) ಹಗರಣ (ಶರಾರಿಷ) ಪ್ರೇಮಾಭಟ. ಈ ಎರಡು ಕಥೆಗಳು ದಿನಪತ್ರಿಕೆ ''ಸಾಲಾರ'' ಬೆಂಗಳೂರು ಎರಡು ಹಂತಗಳಲ್ಲಿ ಮಾರ್ಚ 2000 ಪ್ರಕಟವಾದವು.

ಇಸವಿ 2000 ದಲ್ಲಿ ಖ್ಯಾತ ಕನ್ನಡ ನಾಟಕಗಾರ ಬಷೀರ ರವರ ನಾಟಕ ಟಿಪ್ಪುಸುಲ್ತಾನ್ ರ ಅನುವಾದ ಪ್ರೊ. ಮುಹಮ್ಮದ ಸಿಬ್ಬತುಲ್ಲಾ ರವರು ಮಾಡಿದರು. ಇದು ಕರ್ನಾಟಕ ಉರ್ದು ಅಕಾಡೆಮಿಯಿಂದ ಪ್ರಕಟಗೊಂಡಿದೆ.

ಖ್ಯಾತ ಮನಶಾಸ್ತ್ರಜ್ಞರಾದ ಡಾ: ಸಿ.ಆರ. ಚಂದ್ರಶೇಖರ ನಿಮ್ಹಾನ್ಸ, ಬೆಂಗಳೂರು ಇವರು ಮಾನಸಿಕ ಸಮಸ್ಯೆಗಳ ಬಗ್ಗೆ 75 ಕ್ಕೂ ಹೆಚ್ಚು ಪುಸ್ತಕಗಳನ್ನು ಬರೆದಿರುವರು. ಇದರಲ್ಲಿ ನಾನು ಜ್ಞಾಪಕ ಶಕ್ತಿಯನ್ನು ವೃದ್ಧಿಸುವುದು ಹೇಗೆ? (ಯಾದ ದಾಷತ ಕೈಸೆ ಬಢಾಯೆಂ) ಲೈಂಗಿಕ ಅರಿವು 106 ಪ್ರಶ್ನೆಗಳು (ಮುಫೀದ ಜಿನ್ಸಿ ಮಾಲೂಮಾತ) ಹದಿ ಹರೆಯದ ಮಾನಸಿಕ ಸಮಸ್ಯೆಗಳು (ನೌಜವಾನೋಂಕೆ ನಫಸಿಯಾತಿ ಮಸಾಯಿಲ) ಮೂರು ಪುಸ್ತಕಗಳನ್ನು ಉರ್ದುವಿಗೆ ಭಾಷಾಂತರಿಸಿದ್ದೇನೆ.

ಕನ್ನಡ ಮತ್ತು ಉರ್ದುವಿನ ಜ್ಞಾನಪೀಠ ಪ್ರಶಸ್ತಿ ವಿಜೇತರ ಕಿರುಪರಿಚಯಗಳು ಹೈದರ ನಾಮು (ಕನ್ನಡ ತುಮಕೂರಿನ ಜಾಗೀರದಾರ ನಲ್ಲಪ್ಪನವರು ಬರೆದಿರುವ) ಹಾಗೂ ವಿಸ್ಮಯರು ಇದು ಬಿಜಾಪುರ, ಕೃಷ್ಣಾ ಕೊಲ್ಹಾರ ಕುಲಕರ್ಣಿ ಈ ಮೂರು ಪುಸ್ತಕಗಳನ್ನು ಉರ್ದುಗೆ ಭಾಷಾಂತರಿಸಿದ್ದೇನೆ. ಉರ್ದು ಅಕಾಡೆಮಿ ಇದನ್ನು ಶೀಘ್ರದಲ್ಲೇ ಪ್ರಕಟಿಸಲಿದೆ.

کسانوں کا خیر خواہ پسماندہ طبقات کا مسیحا بادشاہ حضرت ٹیپو سلطان شہیدؒ

از: ستلاؤ چک رنگے گوڑا
(صدر ٹیپو سلطان پرچار سمتی)
ترجمہ: پروفیسر محمد صبغت اللہ

عیسوی کیلنڈر کے حساب سے آج 4/مئی کی تاریخ حضرت ٹیپو سلطان شہیدؒ کا یوم شہادت ہے

شیر میسور ٹیپو سلطان ؒ نے سرزمین میسور خاص کر پرانے میسور کے کسانوں پر جو احسانات کئے ہیں، ان کی مدد کی ہے۔ صحیح معنوں میں انہوں نے اسے نہیں سمجھا اگر انہیں اس بات کا علم ہو جائے کہ انہوں نے ان کی ترقی اور خوشحالی کے لئے جو طویل مدتی اقدامات کئے ہیں تو شاید اس علاقے کے سارے کسان حضرت ٹیپو سلطان ؒ سے اتنی محبت کرنے لگ جائیں گے کہ انہیں اپنا معبود اور عبادت کے لائق خدا مان کر ان کی پوجا کرنے لگ جائیں۔ شاید اسی خیال کے تحت اس زمانے کے انگریزوں نے اپنے سب سے طاقتور دشمن حضرت ٹیپو سلطان شہید کو ان کی رعایا ہو یا کوئی دور مستقبل میں ان سے محبت نہ کرے اور نہ ہی انہیں چاہے اسی سازش کے تحت ان پر کئی طرح کے بے بنیاد الزام لگا کر ان کی شخصیت کو مسخ کرنے کے بعد انہیں ایک فرقہ پرست، ظالم، رعایا کا دشمن، ان کا استحصال کرنے والا اور بدھ و خالف بادشاہ کے روپ میں ان کی تصویر کشی کی۔ آج بھی چند فرقہ پرست لوگ اسی بات کو، اسی خیال کو آگے بڑھا رہے ہیں اور اسی کا پرچار کرتے آرہے ہیں۔

حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔

نواب حیدر علی ان پڑھ تھے اسی بنا پر انہوں نے اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ اس طرح ٹیپو سلطان نے بچپن میں ہی کنڑا، فارسی، اردو، عربی، فرنچ زبانیں سیکھنے کے علاوہ قرآن مجید، بھگوت گیتا، رامائن وغیرہ مذہبی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ حضرت ٹیپو سلطان شہیدؒ بنیادی طور پر ترقی پسند خیالات کے حامل تھے۔ انہوں نے استحصال کی مخالفت کی۔ ان کی پالیسی تھی کہ کوئی کسی کا استحصال نہ کرے۔ جب انہیں اس بات کا پتہ چلا کہ ان کے خزانہ کی آمدنی کا منبع کسان ہیں تو وہ انہیں چاہنے لگے اور ان کے لئے کئی فلاحی منصوبے تیار کئے۔

سب سے پہلے انہوں نے اپنی ریاست میں بہترین آبپاشی کا انتظام کیا۔ اس کے لئے ساری ریاست میں چھوٹے بڑے تالاب، نہریں، چھوٹے بڑے پیمانے پر کنوئیں بنوائے۔ آپ کے دور میں بہت ساری آبپاشی کی سہولتیں فراہم ہوئیں۔ ان میں حکومت نے خود بڑے پیمانے کے آبپاشی کے منصوبوں ... اختیار کیا۔ عوام اور حکومت کے اشتراک سے درمیانی پیمانے کے منصوبے، اور عوام اور ...

واپس لے لئے۔ اس کے بدلے انہیں تنخواہیں مقرر کیں۔ ان سے واپس لی ہوئی زمینات کسانوں میں بانٹ دی گئی۔ پھر اس پر سائنٹفک طریقہ کار سے محصول لگایا گیا۔ اس طریقہ کار کے مطابق خالی زمین کے لئے پہلے سال میں محصول نہیں ہوا کرتا تھا۔ دوسرے سال قانونی روایت کے مطابق محصول کا ایک چوتھائی حصہ لیا جاتا۔ پھر اگلے سالوں میں سب کی طرح ان کو بھی عام محصول ادا کرنا ہوتا۔ گزشتہ دس سال سے بنجر پڑی زمین پر پہلے سال محصول نہیں لیا جاتا تھا۔ دوسرے سال سے انہیں عام مقررہ محصول ادا کرنا ہوتا۔ پھر تیسرے سال سے پورا محصول ادا کرنا ہوتا۔ اگر زمین کا وہ حصہ جو خراب، پہاڑی دامن، اور پتھریلی ہوتی تو پہلے سال محصول نہیں، دوسرے سال روایت کے مطابق ایک چوتھائی محصول، تیسرے سال نرخ کا آدھا حصہ اور چوتھے سال میں پورا محصول لیا جاتا۔ ٹیپو سلطان کے بعد جب انگریزوں نے انتظامیہ سنبھالا تو مزدور طاقتوں کو وسیع کرنے کے لئے اسی قسم کے اقدامات کئے۔

اس کے علاوہ ٹیپو سلطان وکلیگاؤں کی فلاح و بہبودی کے تحفظ کے لئے اپنے عاملوں کے ذریعے درج ذیل کام لیا کرتے تھے۔ عامل کا یہ فریضہ تھا کہ زراعت کی ترقی و ترویج کی نگرانی کرے، دیہات کے رہنے والوں کو استحصال سے بچائے۔ مالی سال کے آخر میں اپنے ماتحت کے علاقے کا دورہ کرنا ہوتا۔ مزروعہ زمینات کا محاسبہ کرنا ہوتا۔ اپنے ماتحت ضلع میں موجود سارے دیہاتوں کی مزروعہ زمین کی وسعت، دیہات کے رہنے والوں کی مردم شماری ان کے کنبے والوں کے ساتھ، ان کا پیشہ، اور ذات۔ ان تفاصیل کی جدول تیار ہوتی۔ اگر کسان ہل خریدنے کے لائق نہ ہوتا تو اسے "تکاوی" یعنی زرعی قرضہ دیا جاتا جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ مقامی افسران اور ساہوکاروں کے استحصال سے بچے۔ دیہات کا پٹیل کسی بھی کسان کو بغیر کسی اجرت کے اپنے کھیت میں کام کرنے کے لئے مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ اگر وہ اس قانون کی خلاف ورزی کرتے تو حکومت ان کی ساری فصل ضبط کر لیتی۔ حصہ داری کی کاشتکاری بازراعت عام تھی۔ لیکن ایک آدمی کو ایک قریہ ...

آلات جیسے ہل، بیل گاڑی وغیرہ خریدنے کے لئے حکومت کی طرف سے قرضہ کی سہولیات فراہم ہوئے۔ اس کے علاوہ بند، تالاب، نہریں، کنوئیں کی تعمیر ان سب سہولیات کی فراہمی کے باعث اس زمانے کے کسان خوشی خوشی کاشتکاری میں جٹ گئے۔ اور زیادہ سے زیادہ فصلیں لینے لگے۔ ارضی محصول کے باعث ٹیپو سلطان کے خزانہ کی آمدنی بڑھی اور خوب روپیہ پیسہ جمع ہونے لگا۔ اس سے خوش ہو کر ٹیپو سلطان نے اپنے سپاہیوں کو زیادہ سے زیادہ تنخواہیں مقرر کیں۔ انہیں بہتر سہولیات فراہم کیں۔ انہیں جوش دلا کر انگریزوں کے خلاف بھوکے شیروں کی طرح ان پر پل پڑنے اور ان کو شکست دے کر اس ملک سے نکال باہر کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن اپنے معتبر اور خاص آدمی دیوان پورنیا اور اپنے ہی ذات کے میر صادق کی غداری کے باعث ٹیپو سلطان کو جام شہادت نوش کرنا پڑا۔

ہاں او وکلیگاؤں قوم میں وشوامانو کا پیغام دینے والے عظیم شاعر پیدا ہوئے ہیں۔ ایک سو کروڑ بھارت واسیوں پر بہتر حکومت کرنے والے سابق وزیر اعظم بنے ہیں۔ سارے انسان ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھنے والے ہیں "شاعر" کے اس پیغام کی طرح "تمام وکلیگا ایک ہیں، ان کے خاندانی گرو سدا یا نہیں صرف ایک ہے" ایسا پیغام دینے والے پیچک دوان (نکلی کوچپر) میں اڑنے والے سوامی جی بھی ہیں۔ اس ملک کے وزرائے اعلیٰ میں نمبر ایک وزیر اعلیٰ کے نام سے شہرت پانے والے بالی ٹیک وزیر اعلیٰ بھی ہیں۔ لاتعداد آئی اے ایس، کے اے ایس، عہدہ دار، ماہر تعلیم، سیاسی ماہرین، مجاہدین آزادی، ادباء و شعراء، کنڑا زبان کے تحریک چلانے والے، کسان لیڈر، فلمی اداکار، فنکار، صحافی، سائنس دان، صنعت کار، سماجی خدمت گار، اہل تمیز حضرات زمیندار، مالدار وغیرہ اس طرح سماج کے ہر شعبہ وکلیگا معزز ہیں۔ اس کا بنیادی سبب کون؟

شیر میسور ٹیپو سلطان کے حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے سے قبل ہم پر حکومت کرنے والے (وکلیگا تنکلا) کے گنگا اور راشٹر کوٹ ...متلق) سارے راجہ وکلیگاؤں کو کھیتوں اور مزرعوں میں کام کرنے والے جانور ہی سمجھ رکھا ...

سمجھا اور انہیں زمین کا حق دیا۔ آزادانہ کاشتکاری کے لئے انہیں بہتر سہولیات فراہم کیں اور انہیں کے لئے آسان قانون بھی بنایا گیا۔ جس کے باعث ان وکلیگاؤں نے بہتر کاشتکاری کی دولت کمائی، وطن کو بھی کچھ حصہ دیا کچھ اپنے پاس رکھا، اپنے بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا۔ یہاں سے آگے 50-60/ سالوں میں یعنی 1859-60ء سے وکلیگاؤں میں زمیندار، مالدار، تعلیم یافتہ، وکلاء، سیاست دان، ادباء و شعراء پیدا ہوئے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ پاس کے صوبیدار پورنا گوڑا کا خاندان، سری رنگاپٹن وکیل مرودیے گوڑا کا خاندان، ڈاکٹر ہنڈی سدے گوڑا کے خاندان اور تنکلا کے زمیندار کے گوڑا کے فرزند قدیم ریاست کے پہلے وکیل وقت استاد تنکلا آر۔ رنگے گوڑا وغیرہ جیسے لوگوں کو ترقی کرنے کا موقع فراہم ہوا۔ پھر صوبیدار پورنا گوڑا کے خاندان والوں میں کے۔ پی۔ گنٹیا گوڑا پہلی مرتبہ قدیم ریاست میسور (میسور سمستھان) میں وکلیگا کے وزیر نامزد ہوئے۔ پھر ان کے فرزندان جسٹس بنے اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ اسی طرح وکلیگا قوم میں خود اعتمادی کا جذبہ بیدار ہونے سے بعد اس دور کے عظیم مفکر شاعر اعظم کو لیمپو ابھر آئے۔ زمینوں کے مالک غریب اور متوسط طبقے کے کسانوں کے زرعی پیداوار تحریروں کے باعث آدی چن چن گری منڈی کی ترقی ہوئی۔ اس منڈی کے سوامی جی شری بالگنگا دھر سوامی جی کی محنت و مشقت کے باعث وکلیگاؤں کے صد فیصد ایک زمیندار، مالدار ہوئے۔ ان کے باعث وکلیگاؤں میں سیاسی طاقت یک جٹ ہو کر ابھری۔ دو تین نسلوں میں زمیندار گھرانوں کے۔ کے۔ سی۔ ریڈی ... کوئنگل ہنومنتیا، کڑی دل منجپا، ڈی۔ دیوے گوڑا۔ ایس۔ ایم کرشنا سب کو وزرائے اعلیٰ اور وزیر اعظم بننے کا موقع ملا۔ ان سب کا بنیادی سبب 200/ سال قبل ٹیپو سلطان کا جاری کردہ اصلاحات اراضی قانون، یعنی ٹیپو سلطان کا ...

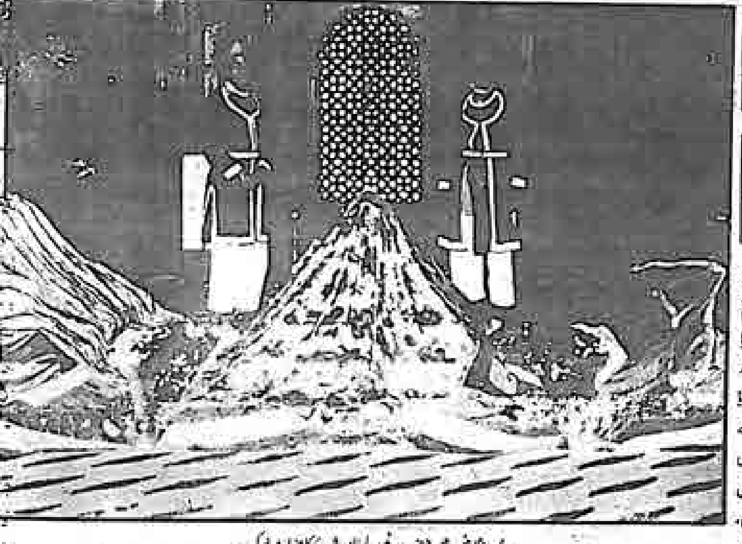

سری رنگاپٹن میں حضرت ٹیپو سلطان شہید کا مزار مبارک

ٹیپو سلطان کے اس احسان عظیم کو یاد رکھیں۔

پڑوسی ریاست آندھرا پردیش، شمالی ہند کی چند ریاستوں میں نکسلیوں کی دھاندلیاں بہت زوروں پر ہیں۔ لیکن کرناٹک میں یہ چیز نہیں ہے اس کے بجائے یہاں خوشحالی اور امن اور چین قائم ہے۔ انہی اسباب کے بنا ہمارے وطن کے مقبول اور انصاف کے مشہور ماہر جو وکلیگا ہی ہیں جسٹس بال کرشنا کا درج ذیل بیان قابل ذکر ہے۔

"تقریباً دو سو سال قبل ہی ٹیپو سلطان پر سینکڑوں، ہزاروں ایکڑ زمین کے مالک بن بیٹھے اور اصل جو لوگ کاشتکار ہیں انہیں زمین کا ٹکڑا بھی نہیں مل پایا اور ان کا استحصال ہوتا رہا جس کے نتیجے میں وہاں کے محنتی کاشتکار نکسلی بن گئے۔ میسور سمستھان میں ٹیپو سلطان کے جاری کردہ اراضی اصلاحی قوانین ان ریاستوں میں بھی اگر جاری کئے گئے ہوتے تو وہاں کے کسان اور زرعی مزدور نکسلی نہیں بن پاتے"۔

جسٹس بی۔ بی۔ بال کرشنا کی یہ بحث سو فیصد صحیح ہے۔ ہمارے قدیم ریاست میسور میں اکثر تمام کسان چھوٹی زمین کے مالک ہیں۔ کسی بھی کسان کے پاس 400/300 ایکڑ زمین نہیں ہے اور زرعی مزدوروں کا استحصال نہیں ہو پا رہا ہے۔ نیز اس طرح یہاں کوئی نکسلی کارروائیاں بھی نہیں امن اور شانتی ہے۔ ... کی جو ریتوں کے فلاح و بہبود ...

کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ الغرض قدیم پیداوار ریاست میسور کی آج یہ امن و آشتی وسائل سے پر خوش حالی کے لئے اس عہد میں ٹیپو سلطان کے اخذ کردہ کسان موافق اعمال ہی بنیادی سبب ہیں۔

ٹیپو سلطان کی طبیعت میں ہمیشہ یہ بات پائی گئی کہ وہ ہر وقت کوئی نہ کوئی ایجاد، اختراع میں مصروف رہتے۔ دنیا کے کسی بھی حصے میں زرعی یا صنعتی میدان میں اگر کوئی نئی ایجاد ہوتی یا کوئی نئی بات دریافت کی جاتی تو وہ فوراً اپنے سفیروں کو وہاں روانہ کرتے اور اس کو حاصل کرنے کے بعد اپنی ریاست میں اس کی پیداوار بڑھائی جاتی۔ انکی اس ایجاد و اختراع والی ناصیت کے باہر کے ممالک سے ریشم اور اس کی کاشت کاری کے معلومات حاصل کرنے کے بعد کرناٹک میں اپنی رعایا کو اس سے متعارف کروایا۔ ٹیپو سلطان کو ریشم کی کاشت سے بے حد دلچسپی تھی۔ 1786ء میں جنگ میں گھر جانے کے باوجود اپنی روزانہ کی مصروفیات کے درمیان میں بھی تھوڑا سا وقت نکال کر باہر سے لانے والے ریشمی کاتوں کی کس طرح حفاظت کرنی ہے اور ریشم کی کاشت کس طرح کرنی ہے اس کے بارے میں افسران کو متعلقہ ہدایات لکھ کر روانہ کیا تھا۔ اور ان کی رہنمائی کی تھی۔ ان ہی اس انتظام کو ... باعث ہی اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں میسور کے علاقے میں 318/ ریشم کی کاشت ... قدیم پیداوار میں ملک میں پہلے نمبر پر ہے۔ تقریباً ... وسائل چند لاکھ دیہاتی عوام ریشم کی کاشت سے ... میں نیچ خوشحال اور معمول زندگی گزار رہے ہیں۔ ... اس وقت اگر آپ ہماری ریاست کو ریشم کی کاشت سے متعارف نہ کرایا ہوتا تو آج ریاست کے ... یہ بات 35/ لاکھ زرعی مزدور (جس میں اکثریت ... اختراع وکلیگا، پسماندہ طبقات کے دیگر لوگ ... حصے میں دلت شامل ہیں) بے روزگار رہتے۔ آج ... ایجاد سارے لوگوں کی روٹی روزی کے فراہم کرنے ... حق صرف ٹیپو سلطان ہی کا ہے۔

قدیم میسور میں وقتاً فوقتاً ... برسات ہو کر بہترین فصلوں کے حاصل کرنے ... بنیادی سبب یہاں کے جنگلات کی دولت ہے۔ ... اس کے ترقیات میں ٹیپو سلطان نے دور اندیشی سے کام لیا۔ انہوں نے اپنی ریاست میں مجرم قیدیوں کو سزا کے روپ میں دو درخت اگانے اور ان کی پرورش کا حکم دیا تھا۔ ماحول ... جاگزین سے ان کے ریاست میں ہر جگہ درخت اور پودے اگائے گئے۔ ہر طرف سرسبز و شاداب پر فضا ماحول بنا۔ وقت پر بارش ہوتی ... جس کے باعث کسانوں کے کاشتکاری کے کام تاج بغیر کسی رکاوٹ کے ہمیشہ جاری رہتے۔ آج بھی اس کا فائدہ قدیم ریاست میسور کے کاشتکار حاصل کر رہے ہیں۔ اسی طرح وکلیگا ... ہے اور اسے کبھی نہیں بھلایا جا سکتا۔

پرست لوگ اسی بات کو ، اسی خیال کو آگے بڑھا رہے ہیں اور اسی کا پرچار کرتے آ رہے ہیں۔ اور اس کو بھلا کر ریاست میسور کا کسان جو صحیح معنوں میں ان کے خیر خواہ کو بھول گیا۔ یہ حضرت ٹیپو سلطان شہیدؒ کا ان کسانوں پر احسان عظیم ہے کہ ایک عرصہ دراز سے بڑے بڑے زمینداروں ، جاگیرداروں کے غلام بنے ، بیگار میں کام کر کے ، محنت مزدوری کرنے کے باوجود غربت ، لاچاری ، افلاس و نکبت میں زندگی بسر کرنے والے کسانوں کو آگے چل کر زمین کا مالک ، زمیندار اور مالدار بنایا۔ اپنی حالات میں تبدیلی آنے کے بعد انہوں نے روز افزوں ترقی کی منزلیں طے کیں ، تعلیم حاصل کی ، سرکاری ملازمتیں حاصل کیں ، افسران بنے ، اعلیٰ عہدہ دار ہوئے ، راجہ کے دربار میں جگہ حاصل کی۔ پھر وزیر ، وزیر اعلیٰ ، وزیر اعظم بنے۔ ادیب و شاعر بنے۔ قومی شاعر (راشٹر کوی) شاعر اعظم (مہاکوی) بنے۔ ایک طرح سے دو سو سال قبل اس وکلیگا فرقہ کے لوگوں کے لئے ایک مضبوط بنیاد فراہم کرنے والی عظیم شخصیت شیر میسور ٹیپو سلطان کو بھلا دیا۔ اس کا بنیادی سبب اس زمانے میں انگریزوں کا بویا ہوا زہریلا بیج تھا اور یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ اس بیج کی تخم ریزی سے کونپل پھوٹے اور درخت بنا اور اس زہریلے درخت کو پروان چڑھانے والے چند فرقہ پرست عناصر ہیں۔

ہماری کسان برادری مستقبل میں اس قسم کی غلط فہمیوں کا شکار نہ ہو اور تاریخ کے صحیح واقعات سے اس سرزمین کے لوگ واقف ہوں ، آج جس کے باعث آپ مستفید ہو رہے ہیں انہیں بنا کسی سبب کے کسی غلط بہکاوے میں آ کر ان سے دشمنی نہ کریں بلکہ انہیں پیار کریں۔ اسی مخلص ارادے سے تاریخ کے چند صحیح واقعات کو اس مختصر سے مضمون میں تاریخی شواہد کے ساتھ چند معلومات فراہم کر رہا ہوں کہ سرزمین کرناٹک اور خاص طور پر پرانے میسور کے کسان ان سے مستفید ہوں۔

تقریباً دو سو سال قبل ریاست میسور میں وکلیگا ، پس ماندہ طبقہ کے لوگ اور دلت اعلیٰ طبقہ کے استحصال کا شکار تھے۔ ان لوگوں کی خوش قسمتی تھی کہ 1761ء میں میسور کی قیادت جناب حیدر علی کے ہاتھ آئی۔ انہوں نے 1782ء تک حکومت کی پھر ان کے فرزند ارجمند نے آپ کی رحلت کے بعد اقتدار کیا۔ عوام اور حکومت کے اشتراک سے درمیانی پیمانے کے منصوبے ، اور عوام اور رعیتوں کے اتحاد سے حکومت کی پشت پناہی حاصل کئے جانے والے آبپاشی کے منصوبے اہم ہیں۔ آبپاشی کے باعث ریاست میسور میں کل 39,000/ چھوٹے بڑے تالاب موجود تھے۔ سارے بھارت میں آبپاشی کے لحاظ سے ریاست میسور پہلے مقام پر تھا۔ 1803-04ء کے ایک اندازے کے مطابق اس وقت کاشتکاری کے لائق 3012397/ ایکڑ تری زمین تھی۔ ایک اور اندازے کے مطابق 1799ء کے اواخر تک کل 35/ فیصد زمین کے لئے آبپاشی کی سہولت فراہم تھی۔ حضرت ٹیپو سلطان شہیدؒ نے اپنے سرکاری خزانہ سے 5/ لاکھ پگوڈا (اشرفیاں) کے خرچ سے کاویری ندی پر کنم باڑی کے مقام پر 26/ اپریل 1798ء مطابق 27/ ذی الحجہ 1212ھ بند کی تعمیر کا کام شروع کروایا۔ لیکن 4/ مئی 1799ء میں میسور کی چوتھی جنگ میں جام شہادت نوش فرمانے کے باعث یہ کام مکمل نہ ہو سکا۔ آگے چل کر اسی تعمیری کام کو آگے بڑھانے کے لئے میسور کے راجا نالوڑی کرشنا راج وڈیر نے اپنے خزانہ سے ضروری مبلغ فراہم کیا۔ جب یہ بھی ختم ہو گیا تعمیری کام مکمل نہ ہو سکا تو انہوں نے اپنی بیوی کے سارے گہنے بیچ کر اس وقت کے ماہر انجینئر دیوان سر ایم۔ وشویشوریا کو مبلغ فراہم کی تاکہ بند کا کام مکمل ہو سکے۔ اس بند کی بنیاد شیر میسور ٹیپو سلطان شہیدؒ نے رکھی اس بات پر دونوں متفق ہو کر ٹیپو سلطان کے کتبہ کو کرشنا راج ساگر کے صدر دروازے پر نصب کر کے اس کو محفوظ کر دیا ہے۔ اس کتبہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ آج کے اس کے۔ آر۔ ایس بند کی بنیاد ٹیپو سلطان شہیدؒ نے رکھی تھی۔ (اس کتبہ کو جو بھی دیکھنا چاہے وہاں دیکھ سکتا ہے)۔

کسانوں ، پس ماندہ طبقوں اور دلتوں کے سارے حالات کے جاننے کے بعد ایک انقلابی حکم نامہ جاری کیا۔ جو دراصل قانون اصلاحات اراضی ہے۔ اس قانون کے مطابق اس زمانے کے کسان اپنی اپنی زمینات کے مالک و مختار بن گئے۔ ٹیپو سلطان نے اپنے عہدیداروں ، علماء و فضلاء اور پجاریوں کو (مندروں ، مٹھوں اور دیگر اداروں کو چھوڑ کر) دیئے گئے جاگیرات [illegible] بھی دیہاتی کو بغیر کسی اجازت کے اپنے کھیت میں کام کرنے سے نہیں روک سکتا تھا۔ اگر وہ اس قانون کی خلاف ورزی کرتے تو حکومت ان کی ساری فصل ضبط کر لیتی۔ حصہ داری کی کاشتکاری یا مزارعت عام تھی۔ لیکن ایک آدمی کو ایک قریہ سے زیادہ نہیں دیا جاتا۔ اور وہ اپنا جائیداد پورے طور پر ادا کرنے کے لئے ضمانت دینی پڑتی۔ وہ دیگر کسانوں کا استحصال نہ کرنے پائے اس بات کی نگرانی عامل کو کرنی ہوتی۔ وہ ضلع کا دورہ کرتا ، کاشتکاروں کے ساتھ طے شدہ معاملات کے مطابق کسانوں کو پٹہ دینا ہوتا۔ ارضی محصول کو بہتر انداز میں سال میں تین قسطوں میں لیا جاتا تھا۔ عامل کے استحصال یا تکلیف دینے پر اگر رعیت یا کسان قریہ سے ہجرت کر جاتا یا لاپتہ ہو جاتا ، اگر وہ رعیت مالدار ہوتا تو ایک ہل کے 20/ (پگوڈا) اشرفیوں کے حساب سے ، اور اگر وہ غریب رعیت ہوتا تو 10/ پگوڈا (اشرفیوں) کے حساب سے عامل کو جرمانہ ادا کرنا ہوتا۔ اس طرح گاؤں چھوڑ کر جانے والے کسانوں کو عامل تسلی دے کر دوبارہ لوٹا کر انہیں واپس لے آتا۔ عامل ، سررشتہ دار ، اور طرفدار کو کسانوں سے تحفہ یا پیسہ حاصل کرنا ممنوع تھا۔ حکومت کو دراصل جو پیسہ آتا وہ تالاب چھوڑ کر دور حقیقتوں یا کسانوں سے اور کچھ حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ افسروں سے اگر کوئی دیہاتی شکایت کرتا تو اس کی باقاعدہ تحقیق کروائی جاتی۔ اگر فصل نہ ہوتی یا کسی اور سبب سے کاشتکار محصول ادا کرنے کے قابل نہ ہوتے تو عامل اس بات کو فوراً سلطان تک پہنچا دیتا۔ اور سلطان فوری کارروائی کے بعد ان کا محصول معاف کر دیا کرتے۔ ایک مرتبہ [illegible] والے کوئی تعلق میں میسور کی تیسری جنگ کے موقع پر کچھ گھوڑوں نے کسانوں کو روند ڈالا۔ اس کی خبر ملتے ہی ٹیپو سلطان نے فوراً اپنے آصف کو ایک خط لکھ کر یہ حکم دیا کہ فوری طور پر ان کسانوں کو بچایا جائے۔

اس کے علاوہ کسانوں کو اپنا کے زمین عطا کر دی جائے تو وہ انہیں آزادانہ طور پر کاشت کرنے کے لئے زرعی آلات کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ کسان استحصال کے شکار ہیں ان زرعی آلات کو خریدنے کی ان میں طاقت نہیں ہے اسی لئے ان کسانوں کو "تقاوی" نامی مخصوص قرضہ دیئے جانے کا انتظام کیا۔ جن کسانوں کے پاس زمین نہیں تھی انہیں زمین ملی۔ ارضی محصول میں ڈھیل دی گئی۔ فصل ہوئی تو محصول ورنہ نہیں ایسا رعیتوں کے مناسب قانون جاری ہوئے۔ کاشتکاری کے لئے ضروری

شیر میسور ٹیپو سلطان کے حکومت کی کمان سنبھالی [illegible] باگ ڈور سنبھالنے سے قبل اہم پر حکومت کرتے گوڑا۔ یہ ہم کرشنا سب کو وزارت اعلیٰ والے وکلیگاؤں کے [illegible] اور راشٹر کوتا ہے اور وزیر اعظم بننے کا موقع ملا۔ ان سب کا بنیادی مستحق) سارے راجہ وکلیگاؤں کو کھیتوں اور جب 200/ سال قبل ٹیپو سلطان کا جاری کردہ مزدوں میں کام کرنے والے جانور کی طرح رکھا اصلاحات اراضی قانون ، یعنی ٹیپو سلطان کا تھا۔ لیکن صرف ٹیپو سلطان نے وکلیگاؤں کو زمینات کا حق دیا۔ اس کے لئے بھتی جانور نہیں بلکہ انہیں بھی اشرف المخلوقات کرناٹک سارے وکلیگاؤں کو چاہئے کہ وہ [illegible]

کسی بھی کسان کے پاس 400/300 ایکڑ زمین نہیں ہے اور زرعی مزدوروں کا استحصال نہیں ہو رہا ہے۔ اور اس طرح یہاں کوئی تشدد کارروائیاں بھی نہیں ، امن اور شانتی ہے۔ رعیت کی انجمن نہیں اور رعیتوں کے [illegible] کے لئے پرامن احتجاج کرتے ہیں۔ کوئی خون خرابہ نہیں ہوتا۔ حکومت کی جائیدادوں کو کس طرح کرتی ہے اس کے بارے میں افسران کو متعلقہ ہدایات لکھ کر روانہ کیا تھا اور ان کی دیانتداری تھی۔ ان کی اس نگاہ پر توجہ گئے باعث ہی اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر میں میسور سے علاقے میں 318/ ریشم کی کاشت کاری کرنے والے گئے موجود تھے۔ آج ہماری ریاست کرناٹک ریشم کی [illegible]

آج بھی اس کا فائدہ قدیم ریاست میسور کے کاشتکار حاصل کر رہے ہیں۔ اس طرح وکلیگا تو ہم ٹیپو سلطان [illegible] ہے اور اسے بھی نہیں بھلایا جا سکتا۔

مولانا ابوالکلام آزاد

پروفیسر محمد صبغۃ اللہ

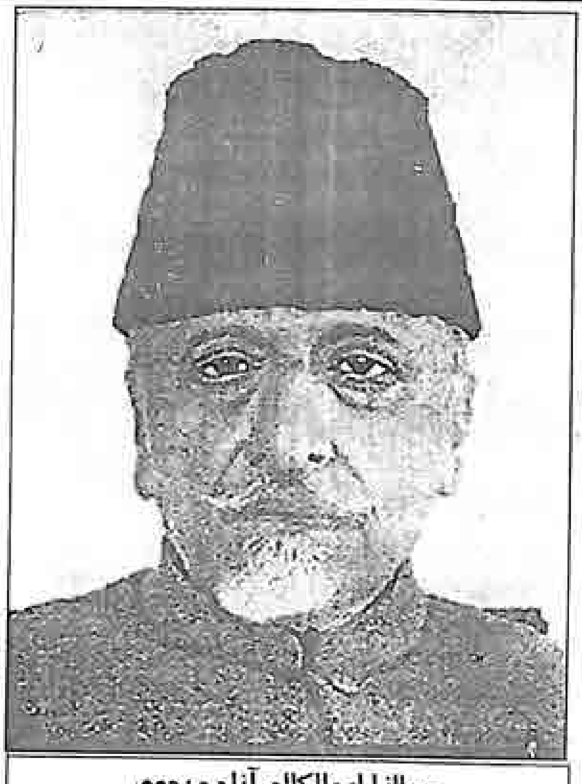

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم

مولانا ابوالکلام آزاد کی پیدائش ۱۰ ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ عیدالاضحیٰ کے دن مکہ معظمہ میں ہوئی۔ خاندانی سلسلہ ابوبکر صدیق سے ملتا ہے۔ آباؤ اجداد اسی مناسبت سے صدیقی کہلاتے تھے۔ آپ کا خاندان دلی کے مشہور خاندانوں میں سے تھا۔ والد خیر الدین بہت بڑے صوفی اور عالم دین تھے۔ پیری مریدی کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ آزاد کا اصلی نام غلام محی الدین تھا۔ لیکن انہوں نے غلام کا لفظ پسند نہ کیا اور اپنا نام احمد ابوالکلام رکھا اور آزاد تخلص اختیار کیا۔ ابوالکلام کی کنیت سے مشہور ہیں۔ فیروز بخت آپ کا تاریخی نام تھا۔

آپ نے غضب کا حافظہ پایا تھا جو سنتے یا پڑھتے وہ برسوں نہیں بھولتے تھے۔ تعلیم کے زمانے میں آپ کو اپنے اسباق دہرا کر پڑھنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ یہاں تک کہ صفحے، سطریں بلکہ کتاب کی جلد اور رنگ تک بخوبی یاد رہتیں، غبار خاطر، خطوط کا مجموعہ جو شیروانی صاحب کو مخاطب کر کے احمد نگر جیل میں لکھے گئے اس کی بہترین مثال ہے۔ ان خطوط میں قرآنی آیات، احادیث اشعار عربی، فارسی اور اردو جو حوالوں کے طور لکھے گئے ہیں وہ سب کے سب حافظہ کی مدد سے لکھے گئے اپنی تحریروں اور تقریروں میں جو حوالے دیا کرتے کبھی کوئی لفظ غلط نہیں ہوتا تھا۔ حافظہ کا اتنا اچھا ہونا خدا کی بڑی نعمت ہے۔

پہلے پہل مولانا آزاد اجرت پر مضامین لکھتے، عربی فارسی رسالوں کے ترجمے کرتے اور جو کچھ ملتا اس سے کتابیں خرید لیتے۔ متعدد اخبارات کے مدیر رہے۔ احسن الاخبار، المصباح، لسان الصدق، وکیل، پیغام، الہلال، البلاغ وغیرہ ہیں۔ ۱۹۰۸ء میں مولانا نے مصر، عراق، شام، ترکی اور فرانس کا سفر کیا تو اخبار اور پریس کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ شیخ محمد عبدہ، جمال الدین افغانی کے ساتھ پیرس سے العروۃ الوثقیٰ نکال کر یورپ کے سیاسی حلقوں میں کھلبلی مچا چکے تھے اور مصر کے سرکاری اخبار الوقائع المصریہ کے ایڈیٹری حیثیت سے اپنے اخبار کو اصلاح معاشرہ کا مؤثر ترین حربہ بنا چکے تھے۔ مولانا لکھتے ہیں

''واپسی کے بعد کچھ دنوں تک غور کرتا رہا کہ مجھے کیا طریقہ اختیار اور کیا پروگرام بنانا چاہئے۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہمیں اپنے خیالات کو پبلک تک پہنچا کر اپنی موافقت کے لئے راستہ ہموار کرنا چاہئے اس لئے کہ ایک اخبار جاری کرنا ضروری تھا اسی ارادے سے الہلال پریس قائم کی''۔ ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو الہلال جاری ہوا یہ جرجی زیدان کے الہلال کے نمونہ پر تھا۔ ۱۸ ستمبر ۱۹۱۴ء کو پریس ایکٹ کے تحت الہلال سے دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کی گئی بعد کو دس ہزار کی جس کے نتیجہ میں وہ بند ہو گیا۔ ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء کو البلاغ جاری کیا۔ ان کو اپنے مقاصد اور مشن سے اتنا عشق تھا کہ اس کے نشر و اشاعت کے لئے ہر ممکن جدوجہد کرتے رہے تھے مقصدیت کا سوز دروں خطرات کی آگ میں بھی گلزار ابراہیم کا مزہ پا رہا تھا۔ ۲۸ مارچ کو حکومت بنگال نے بنگال سے باہر نکل جانے کا حکم دیا، یہ رسالہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

مولانا آزاد اس ہندو مسلم تہذیب کا ایک شاہکار تھے جو گذشتہ ہزار برس میں پروان چڑھی تھی انہوں نے تحریر و تقریر کے فن میں بے نظیر کمال حاصل کیا جس کے ذریعہ وہ اپنے خیالات کی اشاعت بہت مؤثر اور شگفتہ انداز میں کر سکتے تھے اور کرتے رہے اس اعتبار سے یہ پیش گوئی کرنا مشکل نہ تھا کہ وہ ایک جید عالم دین بنیں گے اور مسلمانوں کی ذہنی اور مذہبی قیادت کا فرض انجام دیں گے لیکن قدرت کو ان سے یہ کام لینا بھی تھا اور اس کے ساتھ ساتھ قوم کی سیاسی رہبری بھی ان کے نصیب میں لکھی تھی ان کا کام یہ ہے کہ انہوں نے دو فریقوں کی انجام دہی میں بڑی حسین ہم آہنگی پیدا کی۔ انہوں نے مسلمانوں کو ان کی تہذیب اور مذہب کی قدروں سے آشنا کیا ہندوستان کے ایوان مستقبل میں انہیں ان کا مقام دکھایا اور مختلف لیکن مربوط فرائض کی تعلیم دی جو ایک مسلمان ایک ہندوستانی اور ایک انسان کی حیثیت سے جو دنیا کا شہری ہے ان پر عائد ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے محسوس کیا کہ ہندوستان میں مسلمانوں اور دوسری جماعتوں کے مفاد اور بہبود اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں جیسے گوشت سے ناخن کا جدا ہونا ناقابل قیاس ہے جب تک سارا ملک آزاد نہ ہو اس میں غریبی بیماری اور جہالت کو دور نہ کیا جائے عام لوگوں کے معیار زندگی کو بہتر نہ بنایا جائے جب تک پوری قوم کے دماغ میں علم و عمل کے چراغ روشن نہ ہوں کریم قلب میں انسانیت کا گداز پیدا نہ ہو مسلمان اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کر اپنے مسئلوں کا حل نہیں کر سکتے اپنی کشتی کو اکیلے کھے کر عافیت کے ساحل تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس لئے خود ان کی بہتری کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ ملکی آزادی کی جدوجہد اور ایک بہتر سماج بنانے کی تحریک میں کھلے دل سے شریک ہوں۔ ان کا ذہنی اور جذباتی الحاق ان کے اپنے الفاظ میں ''ایک عالم گیر تصور انسانیت'' کے ساتھ تھا وہ ہر مسئلے کو ایک انسانی مسئلہ سمجھتے تھے اور خیر و شر کو تمام دنیا کے انسانوں کے لئے ایک ناقابل تقسیم میراث۔

ساری زندگی سیاست کی منجدھار میں گزرنے کے باوجود انہوں نے اپنی قوت اور اثر کو بڑھانے کے لئے بھی انتشار بازی سے کام نہیں لیا اپنی کوئی پارٹی نہیں بنائی۔ سیاست کا کھیل کھیلنے والے جو گھٹیا چالیں اور ریشہ دوانیاں اس مقصد کے لئے کرتے ہیں ان سے اپنے وقار اور عفت کو آلودہ نہیں کیا۔ سستی مقبولیت حاصل کرنے کے لئے عوام کے وقتی جذبات اور تعصبات کے لئے ناکمروفان نہیں بنے۔ گمراہ عوام کی سطح پر نہیں اترے بلکہ بھی ناصح مشفق کی محبت اور ہمدردی کے ساتھ بھی پیغمبرانہ جرأت اور للکار کے ساتھ انہیں اپنی سطح پر لانے کی کوشش کی۔ سیاست کے طوفان میں ان کے قدم پہاڑ کی طرح اٹل رہے۔ مثلاً وہ ہندوستان کی تقسیم کے خلاف تھے اور اس کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے نقصان دہ اور خطرناک سمجھتے تھے جب مجبوری اور مصلحت کے تقاضوں سے قوم کے دوسرے بڑے نیتا اس عمل جراحی پر آمادہ ہو گئے اس وقت بھی ان کے رائے ثبات میں فرق نہیں آیا۔

قدرت نے انہیں ایسا روشن دماغ دیا تھا کہ وہ ہر مشکل سیاسی مسئلہ کی گتھیوں کو سلجھا دیتے اور ان کا ناخن تدبیر کامیابی کا راستہ کھول دیتا۔ یہی حال دفتر کے کاموں میں تھا۔ تمام اقلیتوں کو پورا بھروسا تھا اور وہ جانتے تھے کہ مولانا ان کے جائز حقوق کی حمایت کریں گے۔ آخر فطرتاً ایک پالیٹیشن نہ تھے بلکہ ٹیگور گاندھی اور نہرو کی طرح ایک معلم تھے ان کی دلچسپی کا مرکز قوت کے کھیل اور سیاست کی مہرہ بازی نہ تھی بلکہ صحیح اور صالح قدروں کی اشاعت اور قومی کردار کی تشکیل وہ جانتے تھے کہ جو سیاسی اقتدار اور آزادی ان قدروں کی بنیاد پر قائم نہ ہو اس کا انجام بخیر نہیں ہو سکتا اور جب تک قوم میں رواداری، جرأت، سچائی کی لگن، محنت کی عادت، ڈسپلن، مل جل کر کام کرنے کی صلاحیت اور ایثار کی صفات پیدا نہ ہوں آزادی ریت کی دیوار ثابت ہوگی۔ ابتدائی زندگی میں انہوں نے محسوس کیا کہ یہ تعمیری کام سیاسی آزادی حاصل کئے بغیر خوبی کے ساتھ نہیں ہو سکتا تو وہ خانقاہ کی گوشہ نشینی ترک کر کے سیاست کے خارزار میں آئے لیکن اس تبدیلی سے ان کے مقصد میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ مقصد وہی تھا لیکن عمل کا دائرہ وسیع ہو گیا۔

اس مرد مومن کی زندگی میں خدا کی فیاضی کی ایک عجیب شان نظر آتی ہے۔ اسے قدرت نے کیا کچھ نہیں دیا۔ وجاہت ظاہری جو اس کو لاکھوں میں ممتاز بناتی تھی۔ دماغ کی تابانی جو فکر و عمل کے تاریک گوشوں کو منور کرتی تھی دل کی فراخی جس میں تعصب کے سوا ہر چیز کے لئے جگہ تھی۔ علم کی وہ فراوانی کہ حدوں کا پتہ نہ چلے۔ تحریر و تقریر کا وہ کمال جو اس کی زندگی میں فسانہ بن گیا۔ زبان کو اس نے ایک نیا انداز اور اسلوب بخشا اور لفظوں سے کام لیا شعلہ و شبنم کا، رزم اور بزم کا، پھول اور تلوار کا۔ مذہب میں اس کی وہ نظر تھی کہ اس کے آئینے میں دین و دنیا دونوں کی واضح تصویر نظر آتی تھی اور فکر حاضر سے ایسی واقفیت کہ مغرب کے عالم بھی اس کا لوہا مانتے تھے۔ یہ تھے مولانا آزاد ایسا کہاں سے آئے گا۔

فکری تابانی تو سب پر روشن ہے اور محفل سے جدائی کی شان بھی بہت لوگوں نے دیکھی لیکن سب کی رفاقت، کم لوگوں کو صحیح اندازہ تھا۔ اس کا ثبوت طلا جب ان کے بنانے والے نے ان کو یاد کیا اور وہ اس کا نام لیتے لیتے اس کے حضور میں پہنچ گئے۔ اس وقت نہ صرف لاکھوں دلی والوں کی بلکہ بے شمار ہندوستانیوں کی عقیدت اور محبت صبر اور ضبط کے بندھن توڑ کر امنڈ پڑی۔ باہمی تفرقوں اور اختلافوں کو بھول کر سب نے ان کی خاموشی اور بے لوث خدمت کا اعتراف کیا۔ گاندھی جی اور جواہر لال نہرو آپکی دانائی کے بہت قائل تھے۔ آپ کی سمجھ بوجھ دیکھ کر حکومت ہند نے صیغۂ تعلیمات کا وزیر بنا دیا۔ اس صیغہ میں آپ نے اتنا اچھا کام کیا اور اس میں اتنی اصلاحیں کیں کہ پھر کسی کو مزید اصلاح کی ضرورت ہی نہ رہی۔ بہت سی بیش قیمت کتابیں تصنیف کیں، تذکرہ قول فیصل، غبار خاطر اور ترجمان القرآن بہترین یادگار ہیں۔ ترجمان القرآن کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج دنیا کی بیشتر زبانوں میں اس کے تراجم تیار ہوئے اور اچھی اچھی شکلوں میں اس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ افسوس کہ یہ ترجمہ پورے قرآن کا نہ ہو سکا۔ ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو وفات پائی۔ جامع مسجد دلی کے روبرو سپرد خاک کیے گئے۔

☆☆☆☆

پروفیسر محمد صبغۃ اللہ

جنگ آزادی کے عظیم مجاہد

مولانا حسرت موہانی

سید فضل الحسن نام، حسرت تخلص، اردو کے صف اول کے شاعر، ادیب، نقاد، صحافی اور جنگ آزادی کے صف اول کے مجاہد تھے۔ ایم اے او کالج سے بی اے کیا۔ وہ ایک متوسط جاگیردار خاندان سے تھے۔ اس پس منظر کے طالب علم کے لئے ڈپٹی کلکٹری یا دوسری ملازمت کی بہت اہمیت تھی۔ لیکن حسرت نے اپنے درویشانہ صفات کی بناء پر ان سب کو ٹھوکر ماری اور ساری زندگی درویشانہ انداز میں زندگی گزاری۔ بڑے خوددار انسان تھے۔ اپنی خودی کا کبھی سودا نہیں کیا اور نہ اس پر آنچ آنے دی۔ اسی خودی اور غریبی میں رہ کر شاعری صحافت اور سیاست میں نام پیدا کیا۔

حسرت کی سیاسی زندگی کی کہانی بہت طویل ہے۔ انہوں نے عین جوانی میں میدان سیاست میں قدم رکھا۔ سیاسی سرگرمیوں کی ابتداء قید و بند سے ہوئی اردوئے معلی بابت اپریل ۱۹۰۸ء میں ایک مقالہ چھپا جس کا عنوان تھا "مصر میں انگریزوں کی تعلیمی پالیسی" اس مقالے پر مصنف کی حیثیت سے "راقم الحروف ایک طالب علم از علی گڈھ" دیا گیا تھا۔ یہ مضمون حکومت کی نظروں میں باغیانہ قرار پایا۔ اس کی بنیاد پر ۲۳/جون ۱۹۰۸ء کو حسرت کو بغاوت کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ اس مقالے میں ایسا کچھ نہیں تھا جس کی بنیاد پر ایڈیٹر کو گرفتار کیا جا سکے۔ دراصل یہ اس سیاسی مہم کا حصہ تھا جو برطانوی حکومت نے باغی آوازوں کو دبانے کے لئے شروع کی تھی۔ ۱۹/جون ۱۹۰۹ء کو حسرت رہا ہوئے۔ اکتوبر سے اردوئے معلی دوبارہ جاری کیا۔ قید و بند کی تفصیلات "مشاہدات زنداں" کے نام سے لکھیں۔ بقول حسرت "۲۳/جون ۱۹۰۸ء سے ۱۹/جون ۱۹۰۹ء تک اور زمانہ قید فرنگ میں جو کچھ راقم الحروف نے دیکھا یا سنا اس کو شائع کرنے کا بوجوہ اور در چند ارادہ نہ تھا لیکن بعض احباب کے اصرار سے مجبور ہو کر اب یہ قصد کر لیا گیا ہے کہ مندرجہ بالا عنوان سے کم از کم دلچسپ واقعات و حالات ہر ماہ درج ہوا کریں۔ یہ قسطیں ۱۳ مہینے تک شائع ہوتی رہیں بعد میں یہ کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ حسرت کی سیاسی زندگی میں نشاط النساء بیگم المعروف بیگم حسرت موہانی کی خصوصی اہمیت رہی ہے اور ان کی سیاسی زندگی کی تشکیل میں انہوں نے جو کردار ادا کیا اس کی روداد بھی "مشاہدات زنداں" میں ملتی ہے۔ گرفتاری کے وقت حسرت کی شیر خوار بچی نعیمہ بہت بیمار تھی اور اتفاق سے گھر پر بیگم حسرت اور خادمہ کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ ایسے نازک حالات میں بھی باحوصلہ اور باہمت خاتون بیگم حسرت نے سپرنٹنڈنٹ جیل کے ذریعہ حسرت کو ایک خط بھیجا جس میں لکھا تھا "تم پر جو افتاد پڑی ہے اسے مردانہ وار برداشت کرو میرا یا گھر کا مطلق خیال نہ کرنا۔ خبردار تم سے کسی قسم کی کمزوری کا اظہار نہ ہو۔"

بیگم حسرت پردے کی زبردست پابند تھیں لیکن ایسے سخت حالات میں وہ گھر سے باہر نکل آئیں انہوں نے حسرت کے مقدمہ کی پیروی شروع کی۔ آخرکار وہی فیصلہ ہوا جو اس قسم کے مقدمات میں ہوا کرتا ہے۔ ۴/اگست ۱۹۰۸ء کو قید سخت کا آغاز ہوا۔ اس دوران حسرت کو بہت سی ذہنی اور جسمانی اذیتوں سے گزرنا پڑا۔ بالآخر ۱۹/جون ۱۹۰۹ء کو حسرت جیل سے رہا ہوئے۔ خیال تھا کہ ایسی جسمانی مشقتیں اٹھانے کے بعد حسرت سیاست سے توبہ کر لیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ زندگی کے آخری لمحے تک وہ ایک سیاست داں ہی رہے۔

دوسری مرتبہ قید میں

۱۰/اپریل ۱۹۱۶ء مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کا جلسہ لکھنؤ میں تھا۔ حسرت نے اس میں شرکت کی پھر علی گڈھ چلے آئے۔ ۱۳/اپریل ۱۹۱۶ء دوپہر سپرنٹنڈنٹ پولیس علی گڈھ نے اپنے ساتھ اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ (کوتوال) کورٹ انسپکٹر اور پولیس کے سپاہیوں کے ساتھ حسرت کے گھر پر دھاوا بول دیا، انہیں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ مکان اور دوکان کی تلاشی لی۔ بہت سے خطوط تجارتی کاغذات، مولانا محمد علی، ابوالکلام آزاد انور پاشاہ کی تصویریں وغیرہ ضبط کر لئے۔ یکم مئی ۱۹۲۱ء ہفت روزہ "مدینہ" بجنور خبر دیتا ہے کہ حسرت کو جیل میں علاحدہ کمرہ دیا گیا اور بستر اور پلنگ بھی ملا۔ اہل و عیال کو ان سے ملنے کی اجازت دی گئی کھانا بھی گھر سے بھیجا جا سکتا تھا۔

حسرت اور ان کی بیگم دونوں کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ حسرت کو کس جرم میں گرفتار کیا گیا ہے۔ مولانا آزاد اور مولانا حسرت دونوں یکساں حالات میں کیوں معتوب ہوئے اس کی اصل داستان یہ ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے دوران کچھ ممتاز مجاہدین آزادی نے کابل میں حکومت وقت ہند Independent Republic of India قائم کی۔ ان لوگوں میں دیوبند کے شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے شاگرد مولانا عبیداللہ سندھی، مہاراجہ مہیندر پرتاب سنگھ اور برکت اللہ وغیرہ پیش پیش تھے۔ مہاراجہ اس حکومت کے صدر، برکت اللہ وزیر اعظم اور عبیداللہ سندھی وزیر داخلہ منتخب ہوئے۔ شیخ الہند نے "جنود ربانیہ" کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے یہ مسلم انقلابی فوج تھی۔ اس فوج میں جو لفٹننٹ جنرل مقرر ہوئے ان میں حسرت موہانی بھی شامل تھے۔ مولانا محمد میاں شیخ الہند کے خطوط لے کر مولانا حسرت کے اور ابوالکلام آزاد کو دعوت دینے ہندوستان آئے تھے ان کے ہندوستان پہنچنے سے قبل برطانوی حکومت کو اس دعوت کا علم ہو گیا تھا اس لئے حسرت کو گرفتار کیا جا چکا۔

۱۹/اپریل کی صبح خفیہ طور پر رہا کرنے کے لئے راضی ہوئی لیکن حسرت کو قید محض تھی انہیں جسمانی اذیتیں نہیں دی جاتی تھیں۔ پھر بھی کبھی کبھی جیل کے ذمہ داران کے خلاف باقاعدہ سختیاں کرتے، حسرت کو ذہنی و جسمانی اذیتیں دیتے۔ جیل کی مشقتوں اور بے انتہا خراب کھانے کے باعث حسرت کی طبیعت خراب ہو گئی۔ انہیں گردے کی شکایت ہو گئی۔ ہاضمہ خراب ہو گیا۔ بیگم حسرت نے حکیم اجمل خاں سے دوائیاں لے کر بھیجیں اس دوران ان کا وزن گھٹ کر ۲۱۱ پونڈ ہو گیا۔

حسرت کے کچھ غیر سیاست دوستوں، سماجی تنظیموں نے حکومت سے حسرت کی رہائی کی اپیلیں کیں، کوئی نتیجہ نہیں نکلا، یہاں تک کہ دو سال کی مدت ختم ہو گئی۔ رہائی سے کچھ دن قبل حسرت کو اطلاع ملی کہ انہیں قید سے رہائی کے بعد نظر بند کیا جائے گا۔ حسرت نے ۲۱/مئی کو گورنمنٹ کو تار دے کر اطلاع دی کہ اگر انہیں نظر بند کر دیا گیا تو وہ چرخہ اکار کر دیں گے۔ گورنمنٹ نے جواب دیا کہ نوٹس نظر بندی منسوخ کر دیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود نظر بندی ... جاری رہے۔ ۲۲/مئی ۱۹۱۸ء کو حسرت جیل سے رہا ہوئے ان کے استقبال کے لئے بیگم حسرت اور صاحبزادی نعیمہ میرٹھ جیل کے پھاٹک پر موجود تھیں۔ بقیہ (صفحہ 9 پر)

مولانا حسرت موہانی

بقیہ: جنگ آزادی کے عظیم مجاہد

تیسری مرتبہ قید میں

احمد آباد میں مسلم لیگ کانگریس اور خلافت کانفرنس کے سالانہ اجلاس دسمبر ۱۹۲۱ء میں منعقد ہوئے۔ ان اجلاس میں حسرت نے باغیانہ تقریریں کیں اور مکمل آزادی کا مطالبہ کیا اس لئے ۱۳ را پریل ۱۹۲۲ء کو کانپور میں گرفتار کرکے احمد آباد لایا گیا اور سابرمتی جیل میں رکھا گیا۔

حسرت کی گرفتاری پر مولانا احمد سعید دہلوی نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

''ہم کو مولانا کی ذات سے بے حد محبت اور عقیدت ہے کیونکہ سات کروڑ مسلمانوں کی اس آبادی میں اگر کوئی ابوذرؓ کی سی صفات کا مسلمان ہے تو وہ اسلام کا دیوانہ حسرت ہی ہے۔ مگر باوجود اس کے ان کی گرفتاری نے ہم کو رنج وملال نہیں پہنچایا۔ البتہ اس خیال سے کہ ان کی اکلوتی بیٹی کی شادی ہو رہی تھی یعنی اپنی عائلی زندگی میں پہلی اور آخری خوشی ان کو نصیب ہو رہی تھی عین اس وقت ان کی گرفتاری ہمیں سخت اذیت پہنچاتی ہے اور غالباً تمام مسلمانوں کو اس سے تکلیف ہوگی۔''

مولانا اکثر کہا کرتے تھے کہ اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کرنا خوشی خوشی جیل جانا حکومت کے کام کو آسان کرنا ہے اور اسی لئے انہوں نے عزم کر لیا ہے کہ اگر انہیں پولیس گرفتار کرنے آئی تو وہ ساتھ جانے سے انکار کر دیں گے۔ گرفتاری کے وقت انہوں نے ایسا ہی کیا۔ وہ خود پولیس کے ساتھ نہیں گئے پولیس مجبوراً انہیں گود میں اٹھا کر دوکان سے موٹر اور موٹر سے ریل میں رکھا۔ مقدمہ احمد آباد میں چلا۔ آخری انصاف کی غرض سے معاملہ ہائی کورٹ کے سپرد کر دیا گیا۔ مقدمے کی کاروائی دو گھنٹے تک چلتی رہی۔ ۱۱ر جولائی ۱۹۲۲ء کو سرلالو بھائی شاہ قائم مقام چیف جسٹس اور جسٹس کرپس نے حسرت کو زیر دفعہ ۱۲۱ تعزیرات ہند بری کر دیا۔ زیر دفعہ ۱۲۴ (الف) کے تحت دو سال کی قید بامشقت کی سزا دی۔ ۱۱ر اگست ۱۹۲۲ء کو حسرت کو یروداجیل سے بمبئی لایا گیا۔ رات کو بائی کلا کے ایک مکان میں رکھا گیا۔ ۱۲ر اگست کی سہ پہر کو انہیں قیدیوں کی گاڑی میں بوری بندر اسٹیشن پہنچایا جہاں سے وہ کانپور چلے گئے۔

حسرت کا دستور ہند

حسرت نے ایک ایسے دستور کی تجویز پیش کی تھی جس کی رو سے ہندوستان میں چھ ریاستیں ہوتیں۔ (۱) مشرقی پاکستان (۲) مغربی پاکستان (۳) مرکزی ہندوستان (۴) جنوب مشرقی ہندوستان (۵) جنوب مغربی ہندوستان (۶) حیدر آباد

اس سب کو وفاقی اتحاد ریاست ہائے ہند کا اجزائے ترکیبی ہونا چاہئے۔

حسرت اور سودیشی تحریک

برطانوی حکومت نے کچھ سیاست مصلحت اور کچھ ہندوؤں اور مسلمانوں میں خلیج پیدا کرنے کے لئے بنگال کو اس طرح تقسیم کر دیا کہ مصلحت کے تحت مسلم اکثریت کا علاقہ علاحدہ ہو گیا۔ یہ تقسیم ۱۹ر جولائی ۱۹۰۵ء کو کلکتہ میں پندرہ ہزار لوگوں کا جلوس نکلا۔ ٹاؤن حال میں جلسہ ہوا جس میں یہ تجویز منظور ہوئی۔ ''یہ جلسہ اس تجویز کی پوری حمایت کرتا ہے جس مفصل میں منعقد ہونے والے بہت سے جلوسوں میں منظور ہوئی ہے۔ تجویز یہ کہ جب تک بنگال کی تقسیم ختم کرکے دونوں حصوں کو متحد نہ کر دیا جائے برطانیہ میں بنی ہوئی چیزوں کا بائیکاٹ کریں گے'' کچھ ہی دن میں یہ تحریک پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔ بال گنگادھر تلک نے بمبئی پریزیڈنسی میں اس مہم کو اور تیز کیا۔ اب مطالبہ صرف تقسیم شدہ بنگال کو متحد کر دینے تک محدود نہیں رہا بلکہ طے پایا کہ جب تک ملک آزاد نہ ہو جائے تحریک جاری رہے گی۔ حسرت سودیشی تحریک کے بڑے علمبردار اور مبلغ تھے اس سلسلے میں انہوں نے خود کو تحریر و تقریر تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس تحریک کو عملی روپ دینے میں بھی سرگرم رہے۔

حسرت لوہے کے آدمی تھے ایک دفعہ جس چیز کا فیصلہ کر لیتے زندگی بھر اس پر عمل کرتے۔ سودیشی تحریک کے معاملے میں بھی یہی حال رہا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ ''ایک مرتبہ حسرت موہانی کا ان کے گھر پر قیام تھا اس وقت سیاست میں سودیشی تحریک کا آغاز ہو چکا تھا۔ یہ سردی کا زمانہ تھا۔ میزبانوں نے ان کے پائیدان پر کمبل رکھ دیا جو ولایتی تھا۔ حسرت نے رات سردی میں اسی طرح کاٹ دی مگر وہ کمبل نہیں اوڑھا''۔ حسرت نے سودیشی اسٹور کے نام سے سودیشی کپڑوں کی دوکان قائم کی یہ اسٹور علی گڈھ رسل گنج میں قائم کیا گیا۔ حسرت کی نگرانی میں یہ اسٹور ٹھیک چلتا رہا لیکن اس کی گرفتاری کے بعد اسٹور کی حالت خراب ہو گئی۔ غالباً ۱۹۲۴ء کے اواخر یا ۱۹۲۵ء کے وائل میں بند کرنا پڑا۔

آزادئ کامل کی تجویز

حسرت کے مزاج میں بغاوت تھی اس لئے انہوں نے کانگریس کے گرم دل کے۔ بال گنگادھر تلک کو اپنا رہنما تسلیم کیا ان کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا مکمل آزادی حاصل کرنا، جنگ آزادی کے مجاہدین کو اپنی کمزوری اور برطانوی حکومت کی طاقت کا بالکل اندازہ نہیں تھا۔ انہوں نے جنگ آزادی میں جو قربانیاں دیں اور مصائب وآلام، قید وبند کی مشقتیں اور برطانوی حکومت کے ظلم وستم برداشت کئے اس میں ان کے خلوص اور عظیم مقصد کے لئے جدوجہد سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر وہ ذرا ٹھنڈے مزاج مصلحت اور دوراندیشی سے کام لیتے تو ان کی ایثار وقربانی موثر وکارآمد ہوتی۔

رکن پارلیمان

حسرت اتر پردیش اسمبلی کے رکن کی حیثیت سے دستور ساز اسمبلی کے رکن بنے۔ جب ہندوستان آزاد ہو گیا اور ہندوستانی پارلیمنٹ وجود میں آئی تو دستور ساز اسمبلی کے ممبران پارلیمان کی پہلی پارلیمان کا رکن بنا دیا گیا۔ اس طرح حسرت پارلیمنٹ کے ممبر بھی بن گئے۔

حسرت کی زندگی کا تذکرہ بیگم حسرت کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ ان کے خطوط جو حسرت کے نام ہیں ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ نشاط النساء بیگم نے ہمیشہ حسرت کی نظر بندی سے بہتر قید کو ترجیح دی۔ یہ اس خاتون مشرق کی آواز تھی جو باوجود ایک دولت مند باپ کی بیٹی ہونے کے حسرت کے ساتھ نمک کی روٹی کھا کر اور اجرت پر سلائی کرکے اور چکی پیس کر زندگی بسر کی۔ مگر کیا مجال جو ایک حرف بھی شکایت کا زبان پر آیا ہو۔ ان کے صبر واستقلال اور حرارت ایمانی کی اس سے بہتر مثال نہیں ہو سکتی۔ حسرت موہانی جنگ آزادی کے صف اول کے مجاہد تھے۔ جنہوں نے انگریزوں کے خلاف آواز اٹھائی اور ان کو ہندوستان سے نکلنے پر مجبور کر دیا اس کے لئے وہ عزم وارادے کے ساتھ آخر تک مقابلہ کرتے رہے۔

۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان دو حصوں میں بٹ گیا۔ ایک حصہ پاکستان کی طرف اور دوسرا آبادی کے اعتبار سے ہندوستان کے حصہ میں آیا۔ مولانا نے ہندوستان میں رہنا پسند کیا ان کی آواز میں وہ جادو تھا کہ جس کی گل افشانیاں لوگوں کو تقویت دیتی رہی۔

وہ رکن پارلیمان بھی بنے۔ آزادی کے بعد جب ہندوستان کا دستور ۲۶ر جنوری ۱۹۳۹ء کو قانون ساز اسمبلی میں منظوری کے لئے پیش کیا گیا تو منظوری سے قبل اتفاق رائے کے لئے اسپیکر نے دریافت کیا کہ ہندوستان کا یہ نیا دستور آپ سب حضرات کو منظور ہے، سب نے نئے دستور کی موافقت میں ہاتھ اٹھائے۔ لیکن اچانک پورے ایوان میں ایک آواز گونجی ''مجھے منظور نہیں ہے'' یہ تنہا آواز اس مرد مجاہد کی تھی جس نے ۱۹۲۱ء میں جب گاندھی جی کانگریس پر چھائے ہوئے تھے اور تحریک ترک موالات کا بہت زور تھا اور کانگریس کی سبجکٹ کمیٹی کا اجلاس احمد آباد میں ہو رہا تھا اس موقع پر ہندوستان کے استقلال (انڈی پنڈنٹ) کی تجویز انہوں نے پیش کی تھی۔ گاندھی جی حسرت کے اس اقدام سے گھبرا گئے مگر وہ اپنی بات پر جمے رہے۔

انہوں نے اس کو جب کھلے اجلاس میں پیش کیا تو کسی نے ان کے حق میں ہاتھ نہیں اٹھایا۔ لیکن جب ۱۹۲۹ء میں پنڈت نہرو نے آواز اٹھائی تو سب نے اس کی تائید کی۔ اسی طرح نئے دستور کی منظوری کے خلاف آواز اٹھائی تو کسی نے نہیں سنا بلکہ سردار پٹیل تو تحقیر کے انداز میں مسکراتے ہوئے دکھائی پڑے۔ اس مجاہد کو کیا معلوم تھا کہ آگے چل کر ہندوستان کے مسلمانوں کو وہ حقوق نہیں دئے جائیں گے جس کے لئے کانگریس کے ساتھ مل کر آزادی کا بگل بجایا۔ افسوس کہ حسرت موہانی باصد حسرت ویاس ۱۳ر مئی ۱۹۵۱ء کو کانپور میں انتقال کر گئے ان کی وہ آواز آج بھی ایوان کے ستونوں میں گونجتی سنائی دیتی ہے اور بے انصافی کی مذمت کرتی ہے۔

☆☆☆☆☆

Printed and Published by
Mansoor Ali Khan
at Dina Sudar Printing Division, Bangalore
and Published from
No. 3/2, 4th floor,
Al-Ameen Apartments,
P.T. Street,
Basavanagudi,
Bangalore -560 004
Phone:
6570314/6570346
Editor:
K. RAHMAN KHAN M.P.

ICICI PRUDENTIAL
LIFE INSURANCE
Tariq Ali
Insurance Advisor
Contact Address:
2nd Floor, Changiah Compound, Krishnappa Garden,
Opp. Husna Masjid, Bangalore-560 041
Tel :(R) 654 3478 Mobile : 5672 5481

22-7-2003
THE DAILY SALAR

نگارشات

ہم سب کو سبق لینا چاہیئے

روزنامہ سالار کے سنڈے ایڈیشن کافی دلچسپ ہوا کرتے ہیں۔ زیر بحث 15/اور 22/جون کے سنڈے ایڈیشن خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جس میں میڈیکل زون کے تحت ڈاکٹر خان کا تحریر کردہ موضوع "ایڈز" نظر سے گذرا۔ اس بیماری کے بارے میں اتنا تو جانتے ہی تھے کہ یہ لاعلاج مرض ہے۔ عالمی تنظیم صحت کی طرف سے سال میں ایک مرتبہ اس بیماری کے بارے میں آگاہ کیا جاتا ہے جلسے، جلوس، سیمپوزیم وغیرہ منعقد ہوتے ہیں۔ میڈیا بھی خاص دلچسپی لیتا ہے تاکہ اس جان لیوا مہلک بیماری سے انسان بچ سکیں۔ لیکن ایک دن کی ساری گڑبڑ کے بعد یہ ساری باتیں بھلادی جاتی ہیں اور روزانہ کے مشاغل میں یہ بات یاد تک نہیں رہتی کہ ہم نے کیا سنا تھا اور اس پر کہاں تک عمل کرنا ہے۔۔۔ "وہی رفتار بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے" کے مصداق آدمی پھر اپنے اسی رفتار سے آدمی ہی رہتا ہے نہ کہ انسان بننے کی کوشش کرتا ہے۔ "آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا"۔ اور یہ متعدی بیماری ہے کہ لگاتار پھیلتی ہی جارہی ہے اور روز بروز ایسے مریضوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو ناجائز اور حرام قرار دیا ہے اس میں کتنی دور اندیشی اور حکمت چھپی ہوئی ہے ان آیات کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے۔

سود کے بارے آل عمران: آیت 12/میں فرمایا سود میں آدمی محنت کچھ نہیں کرتا صرف حرام کا مال بغیر محنت مشقت، خطرہ مول لئے بغیر گھر بیٹھے دونے پر دوگنا مال بناتے پڑا رہتا ہے۔ یہ طریقہ دوسرے انسانوں کے لئے مالی تنگی کا باعث بنے گا کہ آدمی بغیر کسی قسم کا خطرہ مول لے، دوسرے افراد کے مال میں سے اپنا مال دوگنا کرتا چلا جائے۔

جب مال مفت حاصل ہوتا ہے چاہے وہ سود سے ہو، رشوت سے ہو، غبن سے ہو یا چوری ڈکیتی سے، تو اس سے آدمی اس کو ناجائز طریقے سے بے دریغ خرچ کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کا عادی بن جاتا ہے، جس میں اس کو حلال اور حرام کی تمیز نہیں ہوتی اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لامحالہ ایسی چیزوں پر اپنا حرام سے حاصل کیا ہوا مال لٹاتا ہے کہ دنیا کی لعنت اور ملامت اس کو گھیر لیتی ہے جس میں ایک لاعلاج مرض ایڈز کا بھی ہے۔

جوا بھی حرام ہے۔ اس میں بھی آدمی مفت میں بغیر محنت کے مال حاصل کرنے کی کوشش میں سارا مال گنوا دیتا ہے۔ جس کسی کو اس کی لت پڑی سمجھئے کہ اس کا گھر برباد ہوا۔ محنت سے حاصل کیا ہوا مال کوئی اور حاصل کرلیتا ہے۔ اور ہارنے والا پوری طرح سے پامال ہو جاتا ہے۔ اس کی بھی کئی قسمیں ہیں جیسے تاش عام طور پر نوکر پیشہ لوگ جب اپنی نوکریوں کو جانے کے لئے دور دراز کا سفر کرتے ہیں تو وقت گذاری کے بہانے جوا کھیلنا شروع کردیتے ہیں خاص طور پر ریلوں میں، ایک نے پہلے آکر جگہ بنائی اور پھر ساری ٹیم وقت مقررہ پر جمع ہوئی اور اپنی اپنی منزل مقصود تک پہنچنے تک کھیل ہے کہ جاری ہی رہتا ہے نہ ہم سفر لوگوں کا خیال ہے نہ بچوں کا نہ بزرگوں کا۔ کوئی ایک ہے کہ جیت رہا ہے اور باقی ہیں کہ ہارتے ہی جارہے ہیں ہارنے والوں کی یہ دھن ہے کہ اگلے کھیل میں ضرور جیتنا ہے اور گیارنٹی کے ساتھ کھیلتا ہے کہ ضرور جیت جائے گا اور لگاتار یہی سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ لاٹری' یہ بھی جوا ہے اور اس کی جس کو لت لگی وہ بھی برباد

ہوا، ریس (گھوڑدوڑ) اور ئی ایسے کھیل ہیں جس کو جوا بنا کر کھیلا جاتا ہے جیسے کیرم، شطرنج، کرکٹ وغیرہ کھیلوں کے نام پر جوا کھیلنا اور اس کا عادی ہونا بربادی کی علامت ہے۔ قدرتی پھل جہاں تازہ ہوتے ہیں مفید ہیں ان کو کھانے سے انسان کی صحت بنتی ہے اور تندرستی کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ لیکن انسان کی عقل کی داد دینی چاہئے کہ اس نے سڑے گلے پھلوں کا بھی استعمال سیکھ لیا مختلف پھلوں کو سڑا گلا کر شراب حاصل کی جاتی ہے۔ جس میں کھجور اور انگور کا ذکر تو قرآن مجید میں ملتا ہے لیکن ہندوستان میں کئی پھلوں سے بھی اسے تیار کیا جاتا ہے۔ یہ اللہ کے دیئے ہوئے رزق کا غلط استعمال ہے۔ شراب کے حرام ہونے کا اشارہ پارہ 16/ سورا النحل: آیت 27/ میں ملتا ہے۔ یہ ام الخبائث یعنی برائیوں کی ماں یا دوسرے الفاظ میں برائیوں کی جڑ کہلاتی ہے۔ اگر دشمن کو برباد کرنا ہو تو کسی مار پیٹ یا جھگڑے فساد کی ضرورت نہیں، اس کو یا اس کی اولاد کو بڑی حکمت کے ساتھ ایک دو مرتبہ شراب یا کسی اور نشیلی چیزوں کو دے دو پھر اپنے آپ وہ اس کا عادی بن جائے گا اور رفتہ رفتہ وہ خود بربادی کے منہ میں چلا جائے گا۔ اس کو عار نہیں سمجھے گا۔ چاہے خوشی کا موقع ہو یا غم ہر وقت وہ اس کا استعمال کرے گا۔ حکومت لوگوں کی نبض کو پہچانتی ہے ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے حکومت کو بھی فائدہ پہنچتا ہے کیونکہ حکومت کا سب سے زیادہ ٹیکس اس پر لگتا ہے اور خزانہ کی آمدنی میں اچھا خاصہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہر کوئی بادشاہ ٹیپو سلطان نہیں ہوتا جو شراب، سیندھی اور نشیلی چیزوں پر پابندی عائد کرکے اپنے خزانہ کی آمدنی گھٹالے۔ اور اپنے عوام کی بھلائی کے لئے نقصان برداشت کرلے اور ان کے اخلاقی اقدار میں اضافہ کرے۔

زنا ایک جرم ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو ایسا جرم جس سے صرف شخصی حقوق متاثر ہوتے ہیں دوسرے وہ جس کی سزا دینا حکومت اور سماج کے فرائض میں شامل ہو جیسے کہ زنا۔ اس جرم پر حکومت اور سماج پر لازم ہے کہ وہ زانی اور زانیہ کو سزا دے، کیونکہ زناکاری سے بدی کے راستے کھلتے ہیں، شراب جوے، ناچ گانے اور قتل بھی اس کے ساتھ لگے ہیں۔ غنڈہ گردی، آوارگی اور نکما پن بے شرمی اور ننگا پن یہ سب زناکاری کے ساتھ چلتے ہیں۔ زناکاری کے رواج پڑنے پر کون کس کا باپ ہے اور کون کس کا بیٹا یا بیٹی اس کا پتہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔ آدمیت کی روحانی پاکیزگی اور طہارت کے خلاف وحشی درندوں جیسا ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے اس کو بڑی سختی کے ساتھ منع کیا گیا اور اس پر سخت سزا بھی جاری فرمائی گئی۔ (17/ بنی اسرائیل: آیت 32) پارہ 24/ النور: آیت 1-2 میں بھی اس کی خرابی اور سزا بیان کی گئی ہے۔

قرآنی احکامات پر عمل کرنے والوں کے لئے برکت ہی برکت ہے۔ علماء کی زبانی ان کو بار بار سنا بھی ہے اسی لئے شاید مسلم سماج میں اس کا اثر کم دکھائی دیتا ہے۔ لیکن پھر بھی دنیا کے دیگر اقوام میں جو چھوٹ ان حرام اور ناجائز افعال کے لئے ملی ہے اس کے کیا اندیشے اور خطرات ہو سکتے ہیں اس کا جائزہ لینا مشکل ہے۔ اور ان سے نہ بچنے کے باعث کیا کیا مشکلات جھیلنے پڑ رہے ہیں اور کن کن مسائل سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے اس کو آئے دن دیکھا جا رہا ہے۔ ان مسائل اور مشکلات میں ایک باب ایڈز کا بھی ہے، جس کے بارے میں آگاہی ڈاکٹر خان نے میڈیکل زون میں کروادی ہے۔ جب ڈاکٹر خان کا مضمون پڑھا۔ تو بے اختیار ڈراما انارکلی کے آخری باب کے پانچویں سین کے پانچویں منظر، سلیم کا یہ جملہ بے اختیار ذہن میں گھومنے لگا" ۔۔۔ پناہ! پناہ! میرے گرد کس جہنم کا منھ کھل گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے تو نے کس ہیبت کا نقشہ کھینچ دیا۔" اسی ایڈیشن میں بڑی ہی مکروہانہ بات جوڑوں کا بھیجنا بھی تھا اور یہ ڈاکٹر صاحب ہی کا حق ہے کہ انہوں نے اس کے بارے میں اس نوجوان کو جواب دیا۔ اور مورخہ 6/ جولائی 2003ء کے ایڈیشن میں طالبہ کی جو مختصر دردناک کہانی بیان کی گئی ہے اس سے ہم سب کو درس لینا چاہئے کہ ہمارے نوجوانوں کا وحشیانہ رویہ یہی رہا تو آخر کس پر بھروسہ کیا جائے؟ آزادی نسواں کی بے راہ روی آخر کیا رنگ لاسکتی ہے۔ ڈاکٹر خان قابل مبارکباد ہیں کہ سماج کے ایسے گھناؤنے مسائل کا حل پیش کر رہے ہیں اور اگر اب بھی ہم نے ان سے فائدہ نہیں اٹھایا تو اس کو ہماری بدقسمتی کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

(پروفیسر محمد صبغت اللہ۔ نمبر 50/ فورتھ مین وسنتھاپلاک گنگانگر۔ بنگلور۔32)

ایک نئی اچھی کتاب:

"تصوف اور صوفیائے کرام"

تبصرہ نگار: شاہ قادری سید مصطفیٰ رفاعی جیلانی

اس "حقیقت واقعہ" میں کسی کو اختلاف وشک نہیں ہے کہ "اسلام" کی عالمی دعوت و تبلیغ اور نشر و اشاعت میں سب سے بڑا حصہ اور عمل دخل "حضرات صوفیائے کرام" کا رہا۔ دنیا کے مختلف علاقوں میں ان کے اسفار و قیام سے، اسلام کا دائرہ وسیع تر ہوا ہے۔ جب سے "خانقاہی نظام" سرد ہوا ہے "تبلیغ کا کام رک گیا ہے۔

ماضی کی طرح آج بھی تبلیغی کام کے لئے، صوفیا کی زاہدانہ و قلندرانہ اور عاشقانہ زندگی کی ضرورت ہے۔ محض لٹریچر سے اور تقاریر سے یہ کام ممکن نہیں ہے۔ آج کا المیہ یہ ہے کہ مدارس اور اسکولوں کو چلانے میں، تنظیمیں، تحریکیں اور انجمنیں بنانے میں، اکیڈمیوں، انسٹی ٹیوشنوں اور نشر و اشاعت کے اداروں کو قائم کرنے میں، "سب کے سب" لگے ہوئے اور جٹے ہوئے ہیں۔ ان کاوشوں سے مسلمانوں کا چاہے کچھ بھلا ہو جائے مگر اسلام کی وسعت پذیری کا بھلا نہیں ہو رہا ہے۔ کسی تحریک یا ادارہ کی ترغیب سے کسی اکے دکے آدمی یا گھرانے کا اسلام قبول کر لینا، یہ تبلیغی کام نہیں ہے۔ تبلیغی کام تو وہی ہے جس کو حضرات صوفیائے کرام نے یدخلون فی دین اللہ افواجا (اللہ کے دین میں فوج در فوج وہ داخل ہوتے ہیں) کے منظر میں دکھایا ہے۔

روئے زمین پر جہاں صوفیائے کرام مدفون ہیں، وہاں انہیں کے دم قدم سے اسلام پھیلا ہے، ان حضرات کی اتنی بڑی تعداد رہی کہ ان کے مبارک ناموں سے آج بھی ہم واقف نہیں ہیں۔ ہندوستان میں بھی اسلام کی اشاعت انہیں سے ہوئی۔ ان کی خانقاہیں تعلیم و تربیت کے معہد بھی تھیں اور اشاعت اسلام کا مرکز بھی۔ جنوبی ہند میں بھی صوفیائے کرام تشریف لائے اور اس وسیع و عریض علاقے کو نور اسلام سے منور کیا۔

ہندوستان میں جو صوفیائے کرام تشریف لائے، وہ مختلف سلسلوں سے متعلق تھے، ان سلاسل تصوف میں پانچ سلسلوں کو بڑی شہرت و مقبولیت ملی۔ قادریہ، رفاعیہ، سہروردیہ، نقشبندیہ اور چشتیہ۔ ان کے علاوہ شطاریہ، مداریہ، قلندریہ وغیرہ سلسلوں سے منسوب صوفیائے کرام بھی اس سرزمین میں مدفون ہیں اور ان کے سلسلے آج بھی موجود ہیں۔

اس نئی کتاب "تصوف اور صوفیائے کرام" میں انہیں مشاہیر صوفیائے کرام کے حالات و خدمات کا مختصراً تذکرہ ہوا ہے۔ جنوبی ہند کے اور خاص طور سے کرناٹک کے صوفیائے کرام کے حالات و واقعات اس میں درج ہیں جو کہیں اور اس طرح یکجا پڑھنے میں نہیں آئے۔

اس کتاب کے دونوں محترم مرتبین، صد ہزار مبارکبادی کے مستحق ہیں کہ انہوں نے سارے ملک و بیرون ملک کے مشاہیر صوفیائے کرام کے حالات و خدمات کو اور ان کے سلاسل تصوف کی تعلیمات اور شجروں کو، بڑے سلیقہ سے یکجا مرتب کر دیا ہے۔ اور دیگر ادیان و مذاہب اور مکاتب فکر کے تقابلی مطالعہ کے ساتھ تصوف اسلامی اور اس کے تاریخی مواد کو جمع کر دیا ہے۔

تصوف کی حقیقت کے جویا اور صوفیائے کرام کے کارناموں کے متلاشی اور ان کے نقش قدم پر چل کر برزخ و حشر میں ان کے زمرے میں رہنے کے خواشمندوں کے لئے، یہ کتاب ایک وسیلہ ہے۔

> مرتبین: ڈاکٹر محمد صبغۃ اللہ۔ سید ابوتراب خطائی ناصر
> قیمت: ۵۵ روپئے۔ صفحات: ۲۸۰۔
> پتہ: نمبر ۵/۲ امتیاز بلڈنگ، فورتھ کراس، ماریاترپا،
> ایم۔ آر پالیہ، بنگلور ۔ ۶

14-11-1992 سا ۷/

The daily Siasat Bijore-

DECEMBER 25 THURSDAY, 1986

"سرا تاریخ کے آئینہ میں"

جناب محمد صبغۃ اللہ کی قابل تعریف تصنیف

ایک ایسے دور میں جب کہ اردو میں تحقیقی علمی و تاریخی موضوعات پر تصانیف مفقود ہو چلی ہیں۔ ایک کالج کے نوجوان اردو لیکچرار کی جانب سے تاریخ کے موضوع پر تصنیف کی اشاعت فال نیک ہے۔ ایسی کوشش اردو گورنمنٹ کالج سرا کے صدر شعبۂ اردو جناب محمد صبغۃ اللہ نے کی ہے۔ ان کا ایک مختصر سا کتابچہ "سرا تاریخ کے آئینہ میں" ایک قابل تعریف کوشش ہے۔ ۹۶ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں نوجوان مصنف نے سرا کی تاریخ قلم بند کی ہے جو یقیناً دیدہ ریزی و عرق ریزی کا کام ہے۔ گرچہ تاریخ خواہ کسی چھوٹے مقام ہی کی کیوں نہ ہو، طوالت اور زیادہ عمیق مطالعہ کی متقاضی ہوتی ہے لیکن کسی ابتدائی کوشش کو نقد و تبصرہ کی اس اعلیٰ ترین کسوٹی پر پرکھنا بھی تنقید کی حقیقی اسپرٹ کے خلاف بات ہوگی۔ مذکورہ کتاب میں صبغۃ اللہ نے سرا کی سیاسی کشمکش، تہذیب و ثقافت، زبان و تمدن وہاں کے اولیائے کرام، ارباب تصوف، سبھی باتوں کا جامع و مختصر انداز میں احاطہ کیا ہے۔ مقدمہ میں جو سید ابو تراب خطائی ضامن صاحب کا تحریر کردہ ہے اشارۃً سمجھایا گیا ہے کہ مصنف، سرا کے بزرگان دین کے ملفوظات جمع کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، یقیناً یہ ایک قابل قدر اضافہ ہوگا۔

زیر بحث کتاب میں مصنف نے سرا کی تاریخی عمارات کی نادر تصاویر بھی شائع کی ہیں جو رفتہ رفتہ کمیاب ہوتی جا رہی ہیں، تاہم ان کی اس سعی نے ایک ایسی سمت وجہت کی نشاندہی کی ہے جس پر دیگر اہل علم کو بھی غور کرنا چاہیئے۔

مجموعی طور پر "سرا تاریخ کے آئینہ میں" اردو ادب میں ایک قابل تعریف اضافہ ہے۔

سلیمان اطہر جاوید | میرا مطالعہ

وہ سرا نہ کو جنوبی ہند بالخصوص ریاست کرناٹک کی تاریخ میں اہمیت حاصل ہے۔ اگرچہ ان دنوں اس کی حیثیت ریاست کرناٹک کے ضلع ٹمکور کے ایک تعلقہ کی ہے۔ لیکن قبل ازیں اس کی اہمیت بہت زیادہ رہی ہے۔ سلطنت بیجاپور میں اس کو ایک صوبہ کی حیثیت حاصل تھی اور مغل دور کی فتح کے بعد بھی اس کا مرتبہ رہا مرہٹوں نے بھی فتح کے بعد یہاں گورنر کی عملداری برقرار رکھی سلطنت خداداد میں تو اس کو اور اونچا مقام دیا گیا۔ غرض آج جو بھی ہو کبھی وہ سرا تاریخی تہذیبی بلکہ ادبی اعتبار سے بھی ایک اہم مرکزی مقام رہا ہے۔ یقیناً ضرورت تھی کہ اس علاقہ کی تاریخ کو ضبط تحریر میں لایا جائے۔ محمد صبغۃ اللہ نے اپنی کتاب "سرا تاریخ کے آئینہ میں" سرا کے اسی تاریخی تہذیبی اور ادبی موقف پر روشنی ڈالی ہے۔ ایسے تحقیقی کام خاصے صبر آزما اور وقت طلب ہوتے ہیں محمد صبغۃ اللہ نے راہ تحقیق کی ان دشواریوں کو طے کیا اور نہ صرف گزیٹیر اور دیگر اہم ماخذ تک رسائی حاصل کی بلکہ متعلقہ فرامین وغیرہ کا بھی جائزہ لیا اور اپنے طور پر مختلف افراد سے ملاقات کی سرا کے تاریخی مقامات تک پہنچنے اور ممکنہ حد تک مواد حاصل کیا۔ پہلے باب میں انہوں نے نہایت اختصار کے ساتھ سرا کے پس منظر پر روشنی ڈالی ہے۔ دوسرا باب تاریخ سرا سے تعلق رکھتا ہے جو ایک حد تک مفصل ہے یہاں کی قدیم عمارتوں کا بھی انہوں نے جائزہ لیا ہے۔ اور بزرگان دین کے مقابر کی بھی انہوں نے تفصیل دی ہے سرا کے تعلیمی اور دیگر اداروں کے بارے میں بھی ہے یہاں کی دستکاریوں کے باب میں انتہائی مختصر ہے یہاں تفصیل سے کام لیا جانا چاہئے تھا نیز اعراس اور جاتراؤں کے بارے میں بھی درج کیا گیا ہے۔ بہر کیف اس کتاب کے بعض حصے اگرچہ تشنہ محسوس ہوتے ہیں لیکن مجموعی طور پر یہ کیا غنیمت ہے ریاست میسور کے تعلق سے آئندہ لکھنے والوں کو اس سے مدد مل سکتی ہے۔ خود محمد صبغۃ اللہ بھی اسی ضمن میں مزید لکھنے کی سمت توجہ دے سکتے ہیں۔

کوکن ہمارا شٹرا کا ایک اہم ترین شہر ہے اردو شعر و ادب کی ترویج و اشاعت میں بھی اس شہر کا حصہ رہا ہے۔ اور آج تو یہاں کے کئی لکھنے والے جانے پہچانے ہیں جن میں صوفی بانکوٹی یعقوب راہی پرویز باغی داود غازی آدم نصرت۔ ساحر شیوی اجودھیاوس اعظمی وغیرہ۔ یہاں ادبی انجمنیں بھی ہیں جو شعر و ادب کی خدمت میں مصروف رہتی ہیں۔ بزم ادب کوکن کو اس میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس انجمن نے "تذکرہ شعراء کوکن" شائع کیا ہے۔ اس سے یہاں کے کئی شاعروں سے تعارف ہو جاتا ہے۔ اور ایک ساتھ ان شاعروں کے کلام کے مطالعہ سے کوکن کی شعری فضاء کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اس تذکرہ میں گذشتہ نسل کے شاعر بھی ہیں اور موجودہ نسل کے بھی نیز ہر مزاج مذاق اور مکتب خیال کے۔ بزم فروغ ادب نے اس تذکرہ کو شائع کرتے ہوئے ایک اچھی خدمت انجام دی ہے کہ اردو شاعری کی تاریخ کا ایک گوشہ یوں محفوظ ہو گیا ہے۔

The Daily Munsif
Hyderabad. Sunday Edn.
2/8/1992

"سِرا" تاریخی شہر...... تاریخی سوال؟

ناقدری، قطع رحمی، احسان فراموشی، حق تلفی اور حق ناشناسی کا چلن "کلچر" ہم میں آگیا ہے۔ بعض دفتروں مخلص بندے ہماری آبرو بنے ہیں...... اور تکلیف اٹھارہے ہیں۔ ہماری وجہ سے......!!

اسی طرح علم کے حصول سے ہمیں الرجی ہے..... نہ ہم خود پڑھنا لکھنا سیکھتے سکھاتے ہیں نہ اپنے بچوں کو معقول تعلیم وتربیت کا فکر ہم کرتے ہیں اور جو پڑھنا لکھنا جانتے ہیں، انہیں مطالعہ کتب بینی سے جیسے نفرت ہے۔ زیادہ سے زیادہ جرائم، کرائم اور سزا، گھٹیا لطیفے اور سکسی مضامین وغیرہ دیکھ لیتے ہیں..... اور خصوصاً "تاریخ" سے مخالفت سے تو دلی صدمہ ہے کہ آج ملک کے نام نہاد اور سیاست سے مطلوب تاریخ دان تاریخ کی تجدید اور اس کی درستگی کے نام پر تاریخ کے ساتھ تاریخی خیانت، کھلواڑ، مذاق اور تاریخی قتل کررہے ہیں۔ اس کا نتیجہ کب کیا نکلے اور آنے والے دور میں کیا تاریخ بنے گی؟ واللہ اعلم بالصواب!

بہرحال سارے ہندوستان، خصوصاً کرناٹک والوں کے لئے اس میں بھی خصوصاً مسلمانوں کے لئے..... نواب حیدر علی بہادر اور سلطان ٹیپو شہید کے بارے میں، ان کی تاریخ، ان کی سیرت اور کرناٹک میں ان کے ادوار سے متعلق جاننا بے حد ضروری اور ان کا حق ہے..... ورنہ یہ بھی ایک طرح سے حق تلفی، حق ناشناسی اور ناقدری والی بات ہوگی..... ہے کہ نہیں.....؟؟

سالار کے برادران..... آج ہر ایک کو ہر ایرے غیرے کو بھی عالی جناب، عزت مآب، حضرت، علامہ اور فلاں فلاں لکھ دیا جاتا ہے..... لیکن ہمارے ہی کرناٹک کے کتنے لوگ ہوں گے جنہوں نے محمود خان محمود بنگلوری کا نام تک سنا ہے.....؟؟

جناب محمود خان محمود صاحب کو حق بجانب قوم کا خیر خواہ، ہمدرد، حضرت بلکہ علامہ بھی کہا جاسکتا ہے..... تاریخ دان، مورخ بھی..... مرحوم بھی ہیں، اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ (آمین) انہوں نے بڑی جاں فشانی سے "تاریخ سلطنت خداداد (میسور)" کتاب لکھی ہے۔ (۱۹۹۳ء) جسے دنیا بھر کے اہم علم وفن وتاریخ داں حضرات نے بڑا سراہا ہے اور یہ کتاب واقعی (آسان سادہ زبان، تاریخی، ٹھوس، تحقیقی حقائق سے بھری) پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے ایک نوٹ لکھا ہے......

"نوٹ۔ سرا بنگلور سے ۷۰ میل شمال مغرب میں واقع ہے موجودہ آبادی تقریباً پانچ ہزار ہے۔ سلاطین مغلیہ کا آخر صوبہ دار دلاور خان کا محل نہایت شاندار اور مغلیہ طرز تعمیر کا بہترین نمونہ تھا۔ اب بھی اس جگہ مساجد کے آثار نظر آتے ہیں۔ عہد جہانگیری کی مشہور مسجد کے علاوہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی مسجد اور عیدگاہ اب بھی اچھی حالت میں باقی ہیں۔ یہاں عالمگیر اورنگ زیب کی ایک بیٹی کا بھی مزار ہے۔ سوائے اس مسجد اور عیدگاہ کے تمام شہر اور مساجد وغیرہ ویران پڑے ہیں اور جابجا کھنڈر اور ٹوٹے پھوٹے مزار ومحلات ایک وسیع رقبہ میں نظر آتے ہیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار"۔

..... اس نوٹ کی روشنی میں اہل سرا کے باذوق، اہل علم اور قابل شہریوں سے عاجزانہ التماس (سوال) یہ ہے کہ مندرجہ بالا مقامات کا مختصر موجودہ حال لکھیں کہ ناظرین اور سالار کے قابل قارئین کی معلومات میں اضافہ وتسکین کا باعث ہو۔

(سابق منور..... ۱۳۹ فرسٹ فلور، بی ایس اے روڈ، بنگلور، ۵)

سالار ۲۰۰۲-۱۱-۱۱

سالار ۱۱-۹-۲۰۰۲

سرا تاریخی شہر پر ایک کتاب

مورخہ ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۲ء کے سالار میں پاؤ گشت میں جناب سابق منور صاحب کا طویل مراسلہ "سرا، تاریخی شہر تاریخی سوال؟" پڑھا اور بے حد خوشی ہوئی کہ ہمارے قارئین میں تاریخی اہمیت کو جاننے اور خصوصاً حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے بارے میں جاننے کا جذبہ پایا جاتا ہے جس کا ثبوت آپ کے زیر مطالعہ کتاب جناب محمود خان محمود بنگلوری کی "تاریخ سلطنت خداداد" ہے۔ جس میں آپ نے ایک گونہ تشنگی باقی رکھی اور وہ پہلو ہے تاریخی شہر "سرا" کے بارے میں ہمارے سامنے یہ سوال اٹھتا ہے کہ جہاں مرحوم نے اتنی محنت اور جانفشانی سے اتنی عظیم کتاب لکھی وہاں یہ پہلو کیوں تشنہ رہ گیا؟ اس کی اصل وجہ ہماری قوم کی بے حسی، بے علمی اور جہالت ہے جس کے باعث ہماری اپنی ثقافت بھی ختم ہوتی جارہی ہے۔ جو لوگ کام کرنے کے لئے آگے بڑھتے ہیں ان کی قدر کرنا تو کجا، سیدھے بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ یہ پہلو تشنہ رہ گیا ہو۔ تاریخ سرا کے جو ظاہری شواہد تھے انہیں کے متعلق ایک نوٹ لکھ دیا ہو۔

اس کے پیش نظر جب ڈاکٹر محمد صبغت اللہ صاحب کا سرا میں اردو لیکچرر کی حیثیت سے تقرر ہوا تو انہیں بھی یہی خیال ہوا اور انہوں نے وہاں کے آثار قدیمہ کا تفصیلی جائزہ لے کر "سرا تاریخ کے آئینہ میں" کے عنوان سے تقریباً ۱۰۰ صفحات پر مختصر کتاب شائع کی۔ ۱۹۸۶ء میں اس کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا اور اس کی کافی پذیرائی بھی ہوئی۔ ۲۰۰۰ء میں اس کا کمپیوٹرائزڈ ایڈیشن منظر عام پر آیا ہے۔ امید کہ سابق منور صاحب اس کتاب سے مستفید ہونے کی کوشش کریں گے۔ (سید ابو تراب خطائی ضامن..... پالیس کنٹیلی، بنگلور)

ایک نئی اچھی کتاب :

"تصوّف اور صوفیائے کرام"

تبصرہ نگار : شاہ قادری سید مصطفٰی رفاعی جیلانی

اس "حقیقت واقعہ" میں کسی کو اختلاف و شک نہیں ہے کہ "اسلام" کی عالمی دعوت و تبلیغ اور نشر و اشاعت میں سب سے بڑا حصہ اور عمل دخل "حضرات صوفیائے کرام" کا رہا۔ دنیا کے مختلف علاقوں میں ان کے استقرار و قیام سے اسلام کا دائرہ وسیع تر ہوا ہے۔ جب سے "خانقاہی نظام" سرد ہوا ہے، تبلیغ کا کام رک گیا ہے۔

ماضی کی طرح آج بھی تبلیغی کام کے لیے صوفیا کی زاہدانہ و قلندرانہ اور عاشقانہ زندگی کی ضرورت ہے۔ محض لٹریچر سے اور تقاریر سے یہ کام ممکن نہیں ہے۔ آج کا المیہ یہ ہے کہ مدارس اور اسکولوں کو چلانے میں "تنظیمیں، تحریکیں اور انجمنیں بنانے میں، اکیڈمیوں، انسٹی ٹیوشنوں اور نشر و اشاعت کے اداروں کو قائم کرنے میں" سب کے سب لگے ہوئے اور بٹے ہوئے ہیں۔ ان کاوشوں سے مسلمانوں کا چاہے کچھ بھلا ہو جائے مگر اسلام کی وسعت پذیری کا بھلا نہیں ہو رہا ہے۔ کسی تحریک یا ادارہ کی ترغیب سے کسی اکّے دکّے آدکا یا گھرانے کا اسلام قبول کر لینا، یہ تبلیغی کام نہیں ہے۔ تبلیغی کام تو وہی ہے جس کو حضرات صوفیائے کرام نے "یدخلون فی دین اللہ افواجا" (اللہ کے دین میں فوج در فوج وہ داخل ہوتے ہیں) کے منظر میں دکھایا ہے۔

روئے زمین پر جہاں صوفیائے کرام مدفون ہیں، وہاں انہیں کے دم قدم سے اسلام پھیلا ہے۔ ان حضرات کی اتنی بڑی تعداد رہی کہ ان کے مبارک ناموں سے آج بھی ہم واقف نہیں ہیں۔ ہندوستان میں بھی اسلام کی اشاعت انہیں سے ہوئی۔ ان کی خانقاہیں تعلیم و تربیت کے معہد بھی تھیں اور اشاعت اسلام کا مرکز بھی۔ جنوبی ہند میں بھی صوفیائے کرام تشریف لائے اور اس وسیع و عریض علاقے کو نور اسلام سے منور کیا۔

ہندوستان میں جو صوفیائے کرام تشریف لائے، وہ مختلف سلسلوں سے متعلق تھے۔ ان سلاسل تصوف میں پانچ سلسلوں کو بڑی شہرت و مقبولیت ملی۔ قادریہ، رفاعیہ، سہروردیہ، نقشبندیہ اور چشتیہ۔ ان کے علاوہ شطاریہ، مداریہ، قلندریہ وغیرہ سلسلوں سے منسوب صوفیائے کرام بھی اس سرزمین میں مدفون ہیں اور ان کے سلسلے آج بھی موجود ہیں۔

اس نئی کتاب "تصوف اور صوفیائے کرام" میں انہیں مشاہیر صوفیائے کرام کے حالات و خدمات کا مختصر تذکرہ ہوا ہے۔ جنوبی ہند کے اور خاص طور سے کرناٹک کے صوفیائے کرام کے حالات و واقعات اس میں درج ہیں جو کہیں اور اس طرح یکجا پڑھنے میں نہیں آئے۔

اس کتاب کے دونوں محترم مرتبین، صد ہزار مبارکبادی کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اپنے سارے ملک و بیرونی ملک کے مشاہیر صوفیائے کرام کے حالات و خدمات اور ان کے سلاسل تصوف کی تعلیمات اور شجروں کو بڑے سلیقے سے یکجا ترتیب دیا ہے۔ اور دیگر ادیان و مذاہب اور مکاتب فکر کے تقابلی مطالعہ کے ساتھ تصوف اسلامی اور اس کے تاریخی مواد کو جمع کر دیا ہے۔

تصوف کی حقیقت کے جویا اور صوفیائے کرام کے کارناموں کے متلاشی اور ان کے نقش قدم پر چل کر برزخ و حشر میں ان کے زمرے میں رہنے کے خواشمندوں کے لئے، یہ کتاب ایک وسیلہ ہے۔

مرتبین : ڈاکٹر محمد صبغۃ اللہ ۔ سید ابو تراب خطائی ضامن
قیمت : ۵۵ روپئے ۔ صفحات : ۲۸۰ ۔
پتہ : نمبر ۳ امتیاز بلڈنگ ، فورتھ کراس ، مارپا توٹا ، یم ۔ آر پالیہ ، بنگلور ۔ ۶

Daily Salar Bangalore
14-11-92

"ایک روح پرور، ولولہ انگیز نایاب کتاب"

تبصرہ نگار : شاہ قادری سید مصطفےٰ رفاعی جیلانی

سجادہ خانقاہ رفاعیہ جن پٹن کرناٹک

کتاب : افراب سلطانی (فتح نامہ ٹیپو سلطانؒ)
از ملک الشعرا حسن علی عزت
مرتبہ : ڈاکٹر محمد صبغتہ اللہ
قیمت : تیس روپئے
پتہ : نمبر 4/2 امتیاز بلڈنگ، فورتھ کراس روڈ، مارپا، بے سی نگر بنگلور-٦

ڈاکٹر محمد صبغتہ اللہ (صدر شعبۂ اردو گورنمنٹ آرٹس کالج کولار) کی مرتب کردہ یہ کتاب "افراب سلطانی" کسی بھی طرح کے تنقید و تبصرے سے بالاتر ہے کیونکہ اسکو ملک شعرا حضرت حسن علی عزت نے، مجاہد اعظم شہید وطن حضرت فتح علی ٹیپو سلطان کی ایما و امر پر لکھا ہے جس مثنوی کو لکھنے کا ایما و حکم حضرت عالی جاہ سلطانؒ نے دیا ہو وہ کتاب ہمارے لئے تقدیس و تبریک کی حامل ہے ملک الشعرا حضرت حسن علی عزت نے اپنی اس مثنوی میں ایک عادل و مدبر اور غریب نواز وسالار لشکر حضرت ٹیپو سلطانؒ کی مختلف معرکہ آرائیوں میں فتوحات کی منظر کشی کی ہے مثنوی میں جابجا مدح سرائی بظاہر تو چیستاں معلوم ہوتی ہے مگر درحقیقت یہ مبالغہ آرائیاں بھی واقعات و حقائق کی صحیح عکاسی سے کمتر ہیں اس رفاعی فقیر کا دل گواہی دے رہا ہے کہ ان جہادی معرکہ آرائیوں و جنگوں میں حضرت عالی پناہ سلطانؒ کی اور اکے لشکر کی میدان کارزار میں سرفروشانہ و اولوالعزمانہ کارنامے اس مثنوی میں نظم کردہ منظر نگاری سے کہیں زیادہ ہزار درجہ بڑھکر ہیں حضرت سلطانؒ اور لشکر مجاہدین کی اور دشمنان ملک انگریزوں اور منافقان وطن نواب حیدر آباد مرہٹوں کی مثال "شیر اور گیدڑ" کی ہے گیدڑ بھپکیاں، مکاریاں اور دھوکہ بازیاں تو دے سکتا ہے کارنامے وہ انجام نہیں دے سکتا - ملک الشعرا حضرت حسن علی عزتؒ تمام ہندوستانیوں خاص طور سے مسلمانوں کی طرف سے صد ہزار دعاؤں اور مبارک بادیوں کے حقدار ہیں کہ خلافت نما سلطنت خدا داد کے اس مبارک دور کی معرکہ آرائیوں کی جانبازیوں کی انہوں نے واقعہ نگاری کی ہے تاریخی واقعات کو انہوں نے ردیف و قافیہ کا التزام کرتے ہوئے رومیہ اسلوب میں شاعرانہ آفرینی کے ساتھ اس وقت کی موجہ دکنی اردو میں آسان سلیس پیرائے میں مسلسل و رواں بیان کیا ہے اس مبارک مثنوی کو پڑھتے وقت رفاعی فقیر کے دو تاثرات تھے ایک انہوں نے تصویر کشی اور منظر نگاری اسطرح فرمائی ہے کہ یہ سب آنکھوں دیکھے گئے ہیں دوسرا ایک حال و وجدانی طرب و شادمانی کے ساتھ جہادی کیفیات، قلب و روح پر طاری ہوتے ہیں، مرتب کتاب عالی جناب ڈاکٹر محمد صبغتہ اللہ بھارت کے مسلم و غیر مسلم تمام باشندگان کی طرف سے مبارک بادی کے مستحق ہیں کہ گوشہ گمنامی میں پڑی اس نایاب قیمتی کتاب کی ترتیب واشاعت کا انہوں نے بیڑا اٹھایا محترم مرتب کے استاد عالی مقام میر محمود حسن مرحوم نے ایک مکتوب گرامی میں اپنے شاگرد رشید کو مخاطب کرکے صحیح لکھا ہے کہ "افراب سلطانی" یہ آپ کا ایک اور کارنامہ ہے مبارک ہو اور اس مبارک کتاب پر پیش لفظ لکھتے ہوئے عالی جناب ابو تراب خطائی ضامن نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ "ڈاکٹر محمد صبغتہ اللہ نے ایک عظیم الشان کارنامہ سر انجام دیا ہے - یہ معلوم کرکے بے انتہا مسرت ہوئی کہ "کرناٹکا اردو اکیڈمی" نے محترم مرتب کی کاوشوں کا اعتراف کرتے ہوئے اس عظیم کتاب کو امسال ایوارڈ عطا کیا ہے لیکن اصل قدر دانی یہ کہ کہ ہر مسلم اور غیر مسلم ہندوستانی نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر اس عظیم کتاب کو پڑھے تاکہ دشمنوں اور منافقوں سے وطن عزیز کی حفاظت کیلئے جانبازانہ وسرفروشانہ عزائم و جذبات کو اپنے سینوں میں معمور و موجزن کرکے ہمیشہ سینہ سپر رہنے کا سبق پائے -

پپو خاں کے ایک دوست کی ہیبتناک خود کشی

بمبئی : ایک ہیبتناک واقعہ میں منگل کی شام شمال مغربی بمبئی کے جوہو میں بادرہ کے ایک تاجر راکیش کمراو نے اپنی دو بیٹیوں آٹھ سالہ ششی اور پانچ سالہ نیہا اور اپنی بیوی نیتو کو گولی مار کر ہلاک کرنے کے بعد خود کشی کرلی یہ واردات جوہو کی ایک ویران گلی میں پیش آئی راہگیروں نے لاش کو دیکھ کر پولس کو مطلع کیا اور چاروں کو فوراً قریبی کوپر ہسپتال پہنچایا گیا ہسپتال لائے جانے پر میاں بیوی کو مردہ قرار دے دیا گیا اور نیہا والدے کے فوراً بعد مرگئی اور ششی نے جس کا ایک آپریشن کیا گیا تھا چہارشنبہ کی شام کو دم توڑ دیا، کمراو وائر فیلڈ روڈ پر ، کیشن ماڈرن ڈرائی کلینرس کا مالک تھا بتایا جاتا ہے کہ خود کشی سے پہلے پولس مطلوب دہشت پسند پپو خان کے ساتھ اس کے چند روابط کے بارے میں پوچھ تاچھ کرنے لے ماہم پولس اسٹیشن لے گئی تھی لاشوں کے پاس ایک خط ملا جس میں بتایا گیا ہے کہ کمراو نے مجرم عناصر کے ساتھ اپنے روابط کے بے نقاب ہونے کی وجہ یہ انتہائی قدم اٹھایا ہے کمراو نے خود کشی کے لئے جو ریوالور استعمال کیا اسے جوہو پولس نے قبضہ کرلیا ہے پولس کا کہنا ہے کہ یہ واردات غالباً شام کے پانچ بجکر پچاس منٹ اور چھ بجکر پندرہ منٹ کے درمیان پیش آئی ہوگی پولس نے قتل اور خود کشی کا ایک مقدمہ درج کرلیا ہے پولس نے بتایا کہ کمراو کو پوچھ گچھ کے لئے صبح ساڑھے گیارہ بجے ماہم پولس اسٹیشن طلب کیا گیا تھا اور دو گھنٹے بعد گھر واپس آگیا تھا اور اس کے بعد بے حد پریشان دکھائی دے رہا تھا وہ اپنی بیوی اور بیٹیوں کو ایک آٹو میں ایک ویران مقام پر لے گیا جو جوہو میں گاندھی گرام اور اسکان کے درمیان واقع ہے پولس کا کہنا ہے کہ چونکہ یہ علاقہ سنسان ہے کمراو نے فوراً اپنی بیوی بچوں کو ہلاک کرنے کے بعد

The daily Salar Bangalore
17-4-1993

غواصی کی مثنویوں کا تنقیدی مطالعہ

تبصرہ نگار:- ڈاکٹر ضیاالرحمن صدیقی ایم اے، پی ایچ ڈی

کتاب کا نام :-	غواصی کی مثنویوں کا تنقیدی مطالعہ
مصنف:-	ڈاکٹر محمد صبغۃ اللہ
اشاعت :-	1996
قیمت:-	دو سو روپیے
ملنے کا پتہ:-	مالک پبلی کیشنز نمبر 50/12 آشیانہ ، فورتھ مین روڈ ، وسنتپا بلاک گنگانگر ، بنگلور 560032

ڈاکٹر صبغۃ اللہ اردو کے کہنہ مشق تحقیق کار ، تذکرہ نگار محقق و مترجم ہیں - موصوف گورنمنٹ آرٹس کالج بنگلور میں پروفیسر صدر شعبہ کے عہدے پر فائز ہیں اور گزشتہ اکیس برس سے درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں - تحقیق سے انہیں گہری دلچسپی ہے - اب تک ان کی کم و بیش دس کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں - ان میں " ڈرامے کا فن " اور " انار کلی " " فتح نامہ ٹیپو سلطان " اور صوفیائے کرام ، تذکرہ محققین کرناٹک ، ضحاک (ڈرامہ ترجمہ) بطور خاص توجہ طلب ہیں - نیز چند کتب زیر طبع ہیں - زیر نظر کتاب " غواصی کی مثنویوں کا تنقیدی مطالعہ " ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جو حال ہی میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا ہے - یہ مقالہ پروفیسر فہمیدہ بیگم کی نگرانی میں پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے -

مقالہ بالترتیب پانچ ابواب پر مشتمل ہے -

پہلا باب تین شقوں پر مشتمل ہے - قطب شاہی سلاطین کے حالات نیز اس عہد کا علمی منظر نامہ ، شاعر کے سوانحی حالات کی تفصیل ، غواصی کے ہمعصر شعرا کے فن کا جائزہ ، بیجاپور اور گولکنڈہ کا ادبی ماحول اور تاریخی خاکہ وغیرہ -

باب دوم میں غواصی کی تصانیف ، کلیات راثی ، ریختی ، قصیدہ نگاری ، رباعیات اور غزل کے علاوہ اس کے فارسی کلام کا تفصیلی جائزہ اور تنقیدی تجزیہ پیش کیا گیا ہے - تیسرے باب کے تحت غواصی کی مثنویوں مثلاً قیا ، ستونتی ، سیف الملوک ، بدیع الجمال اور طوطی نامہ کا تنقیدی نقطۂ نگاہ سے جائزہ لیا گیا ہے - مثنویات کی تاریخ تصنیف ، اشعار کی تعداد ، کردار نگاری ، واقعہ نگاری ، مکالمہ نگاری وغیرہ پر ذیلی عنوانات کے تحت خاطر خواہ بحث کی گئی ہے - نیز ادبی جائزے میں کلام کی لطافت ، تشبیہات و استعارات ، صنائع و بدائع پر شعری محاسن سے بحث کی گئی ہے -

باب چہارم میں غواصی کی مثنویوں کے پیش نظر ان کے ادبی مرتبہ کا تعین کیا گیا ہے - اور مختلف شعرا کے کلام سے تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے - پانچواں باب کتابیات پر مشتمل ہے -

منصف نے یہ کتاب بڑی دیدہ ریزی اور محنت مشاقہ سے تصنیف کی ہے جس میں غواصی کے فن اور شخصیت کا تام و کمال جائزہ پیش کیا ہے - اس نوع کی کتاب پہلی بار منظر عام پر آئی ہے جس کی ضرورت ادب میں برسوں سے محسوس کی جا رہی تھی - ڈاکٹر صبغۃ اللہ نے یہ کتاب لکھ کر اردو تحقیق کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے - کتابت اور طباعت کے لحاظ سے بھی کتاب معیاری ہے - امید ہے کہ یہ کتاب اہل ادب اور ارباب نظر کی توجہ کا مرکز بنے گی - □□

The daily Pasban. Bangalore - 20-1-97

20-1-97

---

۹ ــ مینا ستونتی کا تنقیدی جائزہ (قیمت پچاس روپیے)

۱۰ ــ تذکرہ محققین کرناٹک (قیمت ایک سو پچاس روپیے)

مصنف ۔ ڈاکٹر محمد صبغۃ اللہ

پتہ ۔ مالک پبلی کیشنز ۔ 50/12 ، آشیانہ ، فورتھ مین ، وسنتپا بلاک ، گنگانگر بنگلور ۔ 32

پہلی کتاب پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوا کہ مینا ستونتی کا تنقیدی جائزہ ، ڈاکٹر محمد صبغۃ اللہ کے تحقیقی مقالے غواصی کی مثنویوں کا تنقیدی جائزہ کا ایک حصہ ہے ۔ کیونکہ زیر تبصرہ کتاب کی ابتداء صرف تیسرے باب سے ہوتی ہے اور اس کتاب میں صفحات نمبر بھی نہیں دیئے گئے ہیں ۔ اس کے باوجود یہ کتاب اس لئے اہمیت رکھتی ہے کہ اس میں طالب علموں کے لئے نہایت ہی انضباط سے صحیح اسناد مختلف حوالے دیئے گئے ہیں ۔

اور اس مثنوی کے تعلق سے مکمل مواد فراہم کیا گیا ہے اور ہر زاویہ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے ۔ اس کتاب کی اشاعت ایک اچھا ادبی کارنامہ ہے ۔ ڈاکٹر محمد صبغۃ اللہ کا یہ تنقیدی جائزہ ، مینا ستونتی کا ماخذ ، موضوع ، کردار نگاری ، استعارے ، منظر کشی ، واقعہ نگاری علاقائی عناصر اور شاہی تہذیب و تمدن جیسے اہم ابواب پر مشتمل ہے ۔ کتاب کے آخر میں ڈاکٹر صاحب نے اس مثنوی کی ادبی حیثیت کو بھی اجاگر کیا ہے ۔

The daily Salar 24-2-1997

تنقیدی کتابیں نیز رسالے و ماہنامہ ...

ڈاکٹر صاحب کی دوسری کتاب موضوع کے اعتبار سے انفرادی حیثیت کی حامل ہے ۔ ڈاکٹر عبدالرزاق فاروقی ، ڈاکٹر قیوم صادق ، ڈاکٹر راہی قریشی ، ڈاکٹر لئیق خدیجہ اور ڈاکٹر ظفر اقبال کا تعلق ریاست کرناٹک سے نہیں ہے اور نہ انہوں نے اس ریاست کی کسی یونیورسٹی کے لئے تحقیقی مقالہ لکھا ہے ۔ البتہ کتاب کے پیش لفظ میں ان حضرات کا سرسری ذکر ہوسکتا تھا ۔ کیونکہ یہ ملازمت کے سلسلے میں کرناٹک میں مقیم ہیں ۔

اس کتاب میں زبان و بیان کی بھی بہت سی غلطیاں پائی جاتی ہیں ۔ شاید اس کی نظر ثانی میں انضباط برتی نہیں گئی ۔ بہرحال ڈاکٹر محمد صبغۃ اللہ کی یہ کتاب ایک اچھی کوشش کی علامت ہے اور آنے والے محققین کے لئے ایک پیش رفت بھی ہے ۔

"ایک نئی ادبی کتاب"

نام کتاب :- ڈرامے کا فن اور انارکلی -

مصنف :- ڈاکٹر محمد صبغۃ اللہ -

قیمت :- اسّی روپئے (80)

تبصرہ نگار :- شاہ قادری سید مصطفیٰ رفاعی جیلانی ندوی -

ملنے کا پتہ :- مالک پبلیکیشنز، 25 فرسٹ فلور، عیدگاہ کامپلکس، بی لیس یے روڈ، بنگلور 560005 -

اردو ادب میں ڈرامہ ہی وہ فن ہے جو سماج کی خوبیوں اور خامیوں کو تفریحی اسلوب میں عوام و خواص کے سامنے لا دیتا ہے۔ اردو ادب کی مختلف صنفوں، تنقید و تجزیہ اور مزاح و تحسین وغیرہ کا وہ مجموعہ ہوتا ہے۔ اردو ادب کو جہاں افسانوں و ناولوں اور شاعری نے چار چاند لگائے ہیں، وہیں ڈراموں نے بھی اُس کی عمومیت و مقبولیت میں کلیدی حصّہ لیا ہے۔

ڈرامہ نویسی بظاہر آسان سہل معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ کوہ قاف سے پریوں کو لانے سے زیادہ مشکل ہے۔ کوئی کہنہ مشق ادیب ہی جو ادب کی تمام صنفوں پر عبور و درک رکھتا ہو اس پر قلم اٹھا سکتا ہے۔ کیونکہ افسانوں اور ناولوں کی بہ نسبت ڈراموں کے مکالمات زیادہ دشوار بھی جاندار بھی اور کردار زیادہ نازک بھی ہوتے ہیں۔ چونکہ ڈرامہ نویسی ایک لطیف کاوش ہے اسلئے اردو میں ڈرامے بہت کم لکھے گئے۔ اور جو لکھے گئے اور مشہور عوام و خواص ہوئے انمیں سر فہرست " انارکلی " ہے۔ اسکو اردو داں ہر طبقہ میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس ڈرامہ پر بنی فلم نے بھی اُسکی شہرت کو خوب بڑھا وا دیا۔

سید امتیاز علی تاج صاحب کافی منجھے ہوئے قلمکار و ادیب تھے انہیں کا تخلیقی شاہکار " انارکلی " ہے۔ جچے تلے کردار، نپے تلے مکالمات، معنی خیز جملے، سلیس آسان انداز بیاں، واقعہ نگاری میں تسلسل و روانی، منظر و پس منظر کی دلکش تصویر کشی اور اردو شستہ و شائستہ کہیں سطحیت کا شائبہ بھی نہیں، حضرت سید صاحب نے فن ڈرامہ نویسی کو ایک شاہکار ڈرامہ لکھدیا ہے جو ڈرامہ نویسیوں کیلئے مار شمر پیس اور سنگ میل ثابت ہوا ہے۔

خوشی ہوئی کہ عالی جناب ڈاکٹر محمد صبغۃ اللہ صاحب (صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ آرٹس کالج بنگلور) نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور پوری غیر جانبداری و دیانتداری سے تائیدی بھی اور تنقیدی بھی بھرپور تبصرے و تجزیئے سے " انارکلی " کو آپنے حیات نو بخشی ہے۔ ضرورت تھی کہ اسکا مفصّل جائزہ لیکر فن ڈرامہ کے اصول و مبادی کی روشنی میں اسکی خوبیوں کو دوبارہ اجاگر کیا جائے۔ مستزاد یہ ہے کہ " انارکلی " پر مختلف زاویوں سے آپنے ایسی روشنی ڈالی ہے کہ اسکی تمام فنی گرہیں کھل گئی ہیں، خاص طور پر " انارکلی " کے ایک ایک " کردار " کو ایسا عیاں کیا ہے کہ وہ جیتا جاگتا ایک پیکر معلوم ہوتا ہے۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے ڈرامہ کے فن پر تعارفی معلومات کے ساتھ ڈرامہ پر ہوئی تمام کاوشوں کی تفصیلات بھی اسطرح مرتب کر دیا ہے کہ اس فن کی دوسری کتابوں سے بے نیازی حاصل ہو جاتی ہے۔ عالی جناب م-ن- سعید صاحب (صدر شعبۂ اردو بنگلور یونیورسٹی) نے اس کتاب پر اپنے مقدمہ میں صحیح لکھا ہے کہ " یہ کتاب طلبۂ اساتذہ اور ڈرامہ سے دلچسپی رکھنے والے عام قاریوں کے لئے یکساں قدر و قیمت رکھتی ہے اور ڈرامہ کی تفہیم و تنقید میں اُسے ایک ممتاز حیثیت حاصل رہیگی " -

SALAR. B'lore - 19-6-04 (P5)

شرکت کی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ اس کنونشن میں ملک کو فسطائی طاقتوں سے بچانے اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی فضاء کو برقرار رکھنے کے لئے فرقہ پرست جماعتوں کو شکست دینے کی اپیل کی گئی تھی۔ کنونشن جے پی ایک بڑی پارٹی بن کر ابھی بھی ابھری ہے۔ یہ سب کے لئے ایک لمحہ فکر ہے بی جے پی کی تمام کوششوں کو ناکام کرنا ضروری ہے۔

ڈاکٹر محمد صبغت اللہ کو ”ساہتیہ شری ایوارڈ“

بنگلور 18 جون (راست) مجلس کل ہند زبان وادب، زبان وادب کا ایک بہت بڑا ادارہ ہے یہ ادارہ ہر سال ہندوستان کے مختلف ریاستوں میں اپنا سالانہ اجلاس منعقد کرتا آرہا ہے۔ بھارت کے آئین کے تمام مذکورہ زبانوں کے ادبی خدمات انجام دینے والے ادباء شعراء اور نقادوں کو ”ساہتیہ شری ایوارڈ“ اور ”بھارت بھاشا بھوشن ایوارڈ“ کے اعزاز عطا کرتی آرہی ہے۔ سارے بھارت میں اب تک اس کے سترہ سالانہ اجلاس منعقد ہوچکے ہیں۔ جسمیں 5 / اجلاس شہر گلستان بنگلور میں منعقد ہوئے ہیں۔ شر کو ئد مٹھ کے ڈاکٹر شانت ویر مہا سوامی جی اس سال کے اجلاس کے صدر چنے گئے۔ مورخہ 14-15 اور 16 جون 2004 و تین دن یہ اجلاس بنگلور میں منعقد ہوا بھارت کے کونے کونے سے 250 سے زیادہ نمائندے جس میں مختلف زبان وادب کے ادباء شعراء اور ماہرین زبان شامل تھے حصہ لیا۔ اس سال کی خصوصیت یہ رہی کہ اس مجلس نے اردو کے نامور پروفیسر مصنف محقق ومترجم ڈاکٹر محمد صبغت اللہ ایم اے پی ایچ ڈی کوان کے مجموعی ادبی خدمات کے اعتراف میں ”ساہتیہ شری ایوارڈ“ کا اعزاز عطا کیا۔ ریاست کرناٹک کے اردو دان کو ملنے والا یہ پہلا کل ہند ایوارڈ ہے۔ اس موقع پر کل عہدیداران اکھل بھارت بھاشا ساہتہ سملین 2004 جناب ڈاکٹر محمد صبغت اللہ صاحب کی خدمت میں دلی مبارکباد پیش کی ہے (ڈاکٹر اعجاز الدین (سابق رکن قانون ساز کونسل کرناٹک بنگلور) نائب صدر مجلس استقبالیہ اکھل بھارت بھاشا ساہتیہ سملین 2004)

SIYASAT B'lore - 18-6-04 (P2)

ڈاکٹر محمد صبغت اللہ کو ساہتیہ شری ایوارڈ

بنگلور ۱۸ / جون (راست) مجلس کل ہند زبان وادب ہر سال ہندوستان کے مختلف ریاستوں میں اپنا سالانہ اجلاس منعقد کرتی ہے۔ بھارت کے آئین کے تمام مذکورہ زبانوں کی ادبی خدمات انجام دینے والے ادباء وشعراء اور نقادوں کو ”ساہتیہ شری ایوارڈ“ اور ”بھارت بھاشا بھوشن ایوارڈ“ کے اعزاز عطا کرتی آرہی ہے۔ شری کولد مٹھ کے ڈاکٹر شانت ویر مہا سوامی جی کی صدارت میں 14 تا 16 / جون تین دن یہ اجلاس بنگلور میں منعقد ہوا۔ ملک بھر سے 250 / سے زیادہ نمائندوں نے، جن میں مختلف زبان وادب کے ادباء وشعراء اور ماہرین زبان شامل تھے، حصہ لیا۔ اس سال اس مجلس نے اردو کے نامور پروفیسر مصنف، محقق مترجم ڈاکٹر صبغت اللہ کو ان کی مجموعی ادبی خدمات کے اعتراف میں ”ساہتیہ شری ایوارڈ“ کا اعزاز عطا کیا۔ ریاست کرناٹک کے اردو دان کو ملنے والا یہ پہلا کل ہند ایوارڈ ہے۔ اس موقع پر کل عہدیداران، ”اکھل بھارتیہ بھاشا ساہتیہ سمیلن 2004“ نے ڈاکٹر محمد صبغت اللہ کو مبارکباد پیش کی ہے۔

Tarjumane Jumhoor.
11-7-2004

ڈاکٹر محمد صبغۃ اللہ کو "ساہتیہ شری ایوارڈ"

اکھل بھارتیہ بھاشا ساہتیہ سمیلن نے اردو کے نامور پروفیسر، مصنف، محقق ومترجم ڈاکٹر محمد صبغۃ اللہ ایم۔اے پی ایچ ڈی کو ان کے مجموعی ادبی خدمات کے اعتراف میں "ساہتیہ شری ایوارڈ" کا اعزاز عطا کیا۔ ریاست کرناٹک کے اردو داں کو ملنے والا پہلا اکھل ہند ایوارڈ ہے

اس موقع پر کل عہدیداران "اکھل بھارتیہ بھاشا ساہتیہ سمیلن 2004" جناب ڈاکٹر محمد صبغۃ اللہ صاحب کی خدمت میں دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

Hamari Zaban
New Delhi -
8-14 July 2004

ڈاکٹر صبغۃ اللہ کو "ساہتیہ شری ایوارڈ"

مجلس کل ہند زبان وادب، زبان وادب کا ایک بہت بڑا ادارہ ہے۔ یہ ادارہ ہر سال ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں اپنا سالانہ اجلاس منعقد کرتا ہے اور بھارت کے آئین میں مذکورہ تمام زبانوں کے ادبی خدمات انجام دینے والے ادبا، شعرا اور نقادوں کو 'ساہتیہ شری ایوارڈ' اور 'بھارت بھاشا بھوشن ایوارڈ' کے اعزاز عطا کرتی آرہی ہے۔

اب تک اس کے سترہ سالانہ اجلاس منعقد ہو چکے ہیں۔ ۱۴، ۱۵ اور ۱۶ رجون ۲۰۰۴ء کو اس کا ایک اجلاس بنگلور میں منعقد ہوا جس میں ملک کے ۲۵۰ سے زیادہ نمائندوں نے حصہ لیا۔ اس سال مجلس نے اردو کے مشہور محقق اور مترجم ڈاکٹر محمد صبغۃ اللہ کی مجموعی ادبی خدمات کے اعتراف میں 'ساہتیہ شری ایوارڈ' کا اعزاز عطا کیا ہے۔

Urdu Duniya Aug 2004.

اردو دنیا

شرکت کی۔ نظامت کے فرائض صادق علی انصاری نے انجام دیے۔ مشاعرے سے قبل بزم کے سکریٹری رضوان خاں نے بزم اردو کی 34 سالہ خدمات پر روشنی ڈالی۔ مشاعرے میں مست حفیظ رحمانی، ڈاکٹر شر سنبھلی، اشتیاق علی صبا بارہ بنکوی، رضوان خاں، ڈاکٹر توصیف فتحپوری، منظر لیسین، سلیم اختر، عارف اثاروی، عمران سیتاپوری اور دیگر شعرائے کرام نے اپنا کلام پیش کیا۔ (ڈاک سے)

● بنگلور۔ اکھل بھارتیہ بھاشا ساہتیہ سمیلن ہر سال آئین ہند کے آٹھویں جدول میں شامل زبانوں میں ادبی خدمات انجام دینے والے ادبا، شعرا اور نقادوں کو "ساہتیہ شری ایوارڈ" اور "بھارت بھاشا بھوشن ایوارڈ" عطا کرتا ہے۔ سال رواں میں ممتاز اردو ادیب ڈاکٹر محمد صبغۃ اللہ کو ان کی مجموعی ادبی خدمات کے اعتراف میں "ساہتیہ شری ایوارڈ" سے سرفراز کیا گیا ہے۔ ریاست کرناٹک کے اردو داں کو ملنے والا یہ پہلا کل ہند ایوارڈ ہے۔ (ڈاک سے)

● بلاسپور، (چھتیس گڑھ) 25/اپریل۔ ایڈس سے آگاہی ہفتے کے موقعے پر نبل ایجوکیشن سوسائٹی، بلاسپور نے صوبائی سطح پر ایک ادبی محفل کا انعقاد کیا جس میں بطور مہمان خصوصی رونق جمال ورگ نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض منصور فریدی نے انجام دیے۔ جناب رونق جمال نے "زندگی کتنی حسین ہے" کے عنوان سے ایڈس پر ایک افسانہ پیش کیا۔ بعد ازاں ڈاکٹر منظور راہی بلاسپوری نے ایڈس پر اظہار خیال کیا آخر میں ایک مشاعرے کا انعقاد عمل میں آیا جس میں منصور فریدی، ڈاکٹر منظور علی راہی، آر۔ جی۔ کاشی، راز ملکاپوری، شریف انصاری روف، جمیل مچھلی شہری اور کامران اعظم نے اپنے اشعار پیش کیے۔

(ڈاک سے)